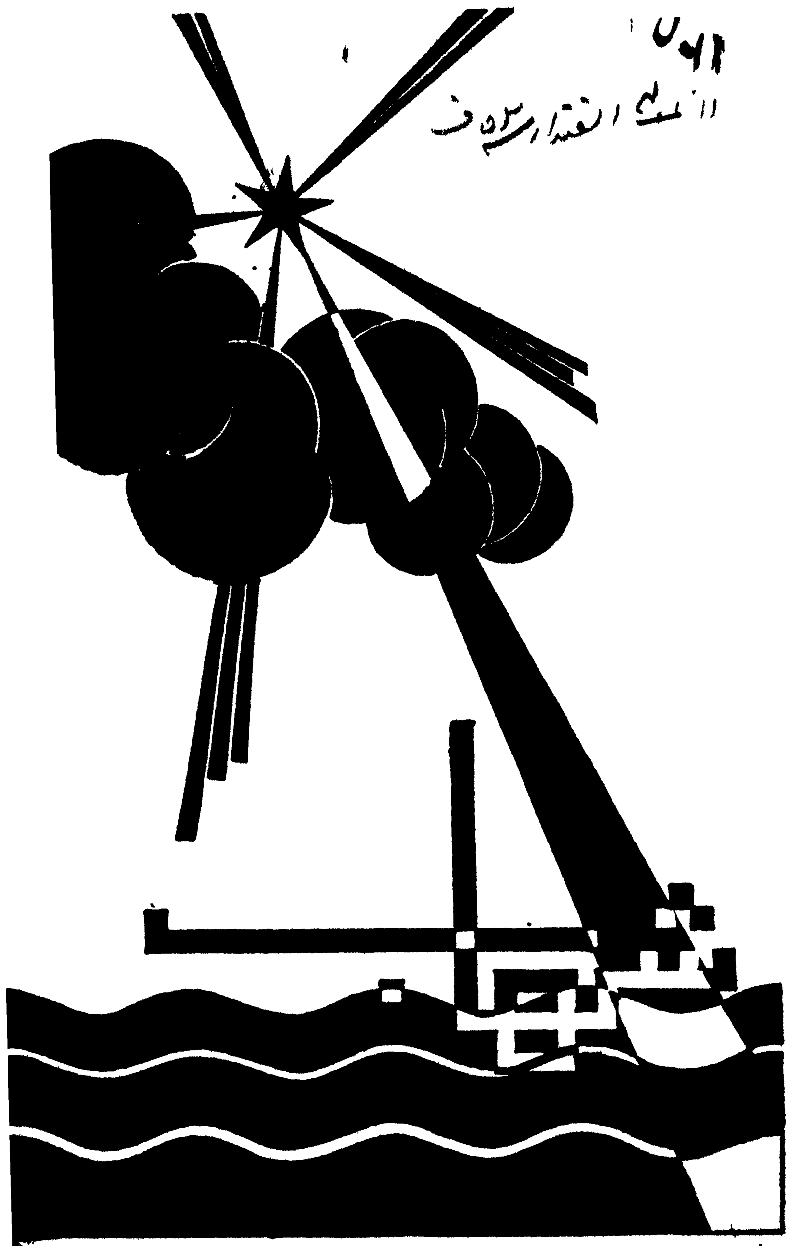


شہاب

جلد ۱ ماہ اسفندار ۱۳۵۲ف م فروری ۱۹۴۳ء نمبر ۴

مرتبہ

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے (للعہ) — گورنمنٹ سے ۵ھ

۷۹۷۲



نذرِ عقیدت حضرت ختمی مرتبت صلعم روحی فداہ

جناب مسلم

آں پری چہرہ کہ ارشاد و ہدایت با اوست — دولتِ خوبی و گنجینۂ رحمت با اوست

چہ مفر جوئی زافسونِ بُتِ سحر طراز — فتنہ ہا در قدم و شورِ قیامت با اوست

دل چہ بندم بہ زر و مالِ جہانِ گذراں — روحِ غمگینِ مرا شادی و راحت با اوست

مظہرِ اول و آخر شدہ آمد بجہاں — جدتِ حادثہ و طرزِ قدامت با اوست

سرِ شیرازۂ اعمال ندارم ہرگز — تا مرا سلسلہ و رشتۂ نسبت با اوست

نا امیدم مکن اے تیرگئی بخت زبوں

مسلمِ دل شدہ را چشمِ مروت با اوست

حیدرآباد کا محرم اور میلے

جناب عبدالحلیم بیگ صاحب

جس طرح صبح اودھ اور شام بنارس آج تک بھی زبان زدِ خاص و عام ہے اُسی طرح حیدرآباد کے محرم اور میلوں کو بھی خاص شہرت حاصل ہے۔

جہاں حیدرآباد فرخندہ بنیاد اپنی یادگاروں صنعتوں وغیرہ کیلئے مشہور ہے اُسی طرح حیدرآباد کا محرم اور میلے بھی قابل ذکر ہیں۔ بلحاظ اس کے کہ یہاں قطب شاہی سلاطین بھی حکمراں رہے ہیں اور اکثر ان میں سے فقۂ اثنا عشری کے پیرو تھے اس لئے یہاں عاشور خانہ جات کی بہت کثرت ہے اور سنا جاتا ہے کہ اب بھی اکثر گھرانوں و عاشور خانہ جات میں ایسے بھی علم موجود ہیں جو فوج یا لشکر حسینی سے امتیاز یا تعلق خصوصی رکھتے ہیں۔ جب سلاطین آصفیہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو بلحاظ عقیدت و حُبِ اہلبیتِ نبویؐ انھوں نے نہ صرف اِن مآثر کو باقی رکھا بلکہ یوماً فیوماً ان عاشور خانہ جات کے معمولات میں بھی اضافہ فرمایا جس طرح ترکی میں خلع خلافت کے قبل ہر جمعہ کو سلطان المعظم مسجد تشریف لیجانے کے وقت رسم سلامتی کی ادائی ہوتی تھی اُسی طرح حیدرآباد میں محرم کی پانچ تاریخ کو لنگر نکلا کرتا تھا اور جس میں ریاست ابد مدت کی جملہ افواج عام ازیں کہ باقاعدہ ہو یا بے قاعدہ تمام و کمال حصہ لیتی تھیں اب بھی اگرچہ یہ لنگر باقی ہے مگر صرف علاوہ صرف خاص مُبارک کے کچھ بے قاعدہ دستے اس میں حصہ لیتے ہیں۔ جب یہ لنگر پوری شان و شوکت سے نکلتا تھا تو اُس وقت اُن شاہراہوں کے بنگلے جن پر سے یہ گذرتا تھا بغرض تماش بینی محفوظ کرلئے جاتے تھے اور سفید کاری و فرش و فروش سے آراستہ کئے جاکر چلونین آویزاں کردی جاتی تھیں۔ یہ سفید کاری وغیرہ بالعموم آغاز ماہ محرم سے دو تین روز قبل ہی ختم ہو جاتی تھی اور پہلی سے اگر ایک طرف عاشور خانہ جات میں علم استاد کئے جاتے تو دوسری طرف اقسام کے سوانگ اٹھائے جاتے جن میں شیر۔ مجنون وغیرہ کے سوانگ کے سوا رنگ بھی اٹھائے جاتے تھے۔ رنگ کے سوانگ میں تقریباً بیس پچیس آدمی ہوتے تھے اور یہ مختلف ڈرامے مثلاً گل بکاولی۔ اندر سبھا۔ وغیرہ وغیرہ پیش کرتے تھے۔ ان رنگوں میں صرف پردوں کی کمی رہتی تھی۔ اور کرداروں میں عورت کا کردار بھی مرد ہی پیش کرتا تھا۔ اور گاشن یا رقاصہ کا کردار بھی مرد پیش کرتا تھا۔ عرصہ دراز تک یہ رنگ حیدرآباد میں بہت مقبول رہے۔ اور اب صرف یاد ہی یاد رہ گئی ہے کیونکہ حکماً تمام سوانگ مسدود کردئے گئے ہیں جو ہر آئینہ مزخرفات میں ضرور داخل تھے۔

پانچ تاریخ سے محرم کی ہماہمی بڑھ جاتی تھی اور اضلاع سے بھی لوگوں کا تانتا بندھ جاتا تھا جو اپنی اپنی نذر و نیاز کے ساتھ شہر کے مشہور الاؤوں کو جاتے اور بارگاہ حسینی میں اپنی نیاز و نذر عقیدت پیش کرتے تھے۔

شہر کے مختلف عاشور خانہ جات اور مختلف افواج کے بیارکس میں تعزیئے یا تابوت بھی تیار ہوتے تھے جو محرم کی نو تاریخ یعنی شب عاشور کافی تزک و احتشام کے ساتھ گشت کرنے کے بعد دس محرم روز عاشورہ پرانے پل کے نیچے قریب مقرب تھنڈے کئے جاتے تھے۔ پرانے پل تک ان تعزیوں یا تابوتوں کا جلوس دیکھنے دو رویہ مکانات اور ملگیات تماش بینوں سے معمور ہوتے تھے اور رودموسیٰ کی پہنائی بھی خلقت سے معمور ہو جاتی تھی۔ جہاں بچے بوڑھے عورت مرد وغیرہ کے جمگھٹے کچھ عجیب ہی منظر پیش کرتے تھے۔ اِن کے سوا کہیں جھولے قایم ہوتے تو کہیں کھلونوں اور خورد و نوش کی دکانیں جو اپنی اپنی صدائیں لگاتے اور پھر کر بھی فروخت کرتے تھے، غرض ایک ہما ہمی رہتی تھی اور باجوں کی آواز سے کان پڑے آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کئی سال ہوئے کہ یہ تعزیئے یا تابوت موقوف کئے جا چکے ہیں اور اب محرم میں سے دیکھ صرف دو یا تین تابوت نظر آتے ہیں جو منتی کہلاتے ہیں۔ محرم میں جہاں مختلف عاشور خانہ جات میں چہل پہل رہتی تھی اسی طرح شہر کے بعض ذی ثروت امراء وغیرہ کی دیوڑھیاں بھی اس ماہ میں خاص و عام کا مرکز رہتی تھیں۔ مثلاً راجہ شیوراج دھرم ونت آنجہانی کی دیوڑھی جہاں لب راہ بنگلہ پر پتلیاں رکھی جاتی تھیں۔ اور ایک تعزیہ یا تابوت سرسوں کے تابوت کے نام سے تیار کیا جاتا تھا۔ یہ پتلیاں اب بھی باقی ہیں۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی کی دیوڑھی میں بھی خاصی ہما ہمی رہتی تھی۔ ایک طرف آرائشی ٹٹی لگائی جاتی تھی تو دوسری جانب آئینے وغیرہ اور کوٹھیوں کے اوپر مہاراجہ کے قطعات ہر چہار طرف آویزاں کئے جاتے تھے۔ عارضی دکانیں قایم ہوتی تھیں اور نو محرم شب عاشور کو سر مہاراجہ بہادر کے ہاں صاحبان یورپین و معززین مدعو کئے جاتے تھے اور سواری نعل مبارک مہاراجہ بہادر کی دیوڑھی میں سے اپنے مقررہ نذر و نیاز لے کر گذر جانے کے بعد یہ مجمع بھی منتشر ہو جاتا تھا۔ بوجہ انتقال مہاراجہ بہادر۔ اس کا اب دھندلا سا عکس باقی رہ گیا ہے۔

اس کے علاوہ تُچّر مل کی ٹٹی اور کوکا کی ٹٹی بھی کسی زمانہ میں مشہور تھی مگر اب تو ان محلوں کا یہی نام پڑ گیا ہے۔

محرم کی ۷ تاریخ کو ایک علم کی سواری نکلتی تھی جو حضرت امام قاسم فرزند امام حسن علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے۔ یہ علم نصف شب کے بعد اپنے عاشور خانہ سے نکل کر مقررہ راستوں سے اپنی نذر و نیاز لیتا ہوا قریب صبح اپنے عاشور خانہ کو پہنچتا ہے۔ اسی تاریخ یعنی ۷ محرم کو حضرت مل سبحانی کی سواری بلدہ بہاری مقررہ عاشور خانہ جات رونق افروز ہوتی ہے جہاں علاقہ صرف خاص مبارک سے نذر و نیاز تیار رکھے جاتے ہیں۔

۹ محرم شب عاشور کو نعل مبارک کی سواری اپنے مشہور عاشور خانہ پتھر گٹی سے نکلتی ہے جو شہر کے مقررہ شاہراہوں سے گذرتی ہوئی جس میں دیوڑھی مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی بھی شریک ہے۔ صبح صبح اپنے عاشور خانہ کو پہنچتی ہے۔ اس علم کے لئے بلا لحاظ مذہب و ملت لوگ فرط عقیدت سے اُن شاہراہوں پر مجتمع رہتے ہیں۔ جہاں سے یہ علم گذرتا ہے۔ کوئی علم کے سامنے

جو عود دان رہتے ہیں اُن میں عود جلاتا ہے۔ تو کوئی نیشکر کی مشعل جو نتی ہوتی ہے روشن کرتا ہے۔ کوئی گیند گہوارہ تو کوئی دھٹی چڑھاتا ہے۔ غرض مختلف طریقوں سے حُب اہل بیت نبویؐ کا اظہار کیا جاتا ہے اور شہید مظلوم کو خراج عقیدت و احترام۔ بالخصوص غیر مسلم مستورات کی عقیدت قابل دید رہتی ہے جو نہا دھو کر گیلے بالوں سے نذر و نیاز پیش کرتی ہیں۔

۱۰ محرم روز عاشور علم بی بی کی سواری بعد زوال آفتاب اپنے عاشور خانہ موقوعہ الاوہ بی بی سے نکلتی ہے جو قریب محلہ دبیرپورہ واقع ہے اور اب تو اس محلہ کا نام ہی الاوہ بی بی پڑ گیا ہے۔ سنتے ہیں کہ یہ علم حیات بخشی بیگم صاحبہ کا تیار کردہ ہے جن کے نام سے بی بی کا چشمہ وغیرہ بھی موسوم ہیں۔ فی الوقت یہ علم علاقہ صرف خاص مبارک کی نگرانی میں ہے۔ اور منجانب صرف خاص مبارک اس عاشور خانہ پر بغرض نگرانی جواہرات علم جو سبز تھیلیوں میں سر بہ مہر محفوظ ہیں اور علم ہی پر آویزاں رہتے ہیں پہرہ جات مقرر ہیں البتہ جو معمولات و نذر و نیاز یہاں چڑھائے جاتے ہیں وہ متولیوں میں بہ حصۂ رسدی تقسیم ہوتے ہیں۔ یہ علم بالکلیہ سرکاری نگرانی میں گشت کرتا ہے اور فیل خانہ حضوری سے تین زنجیر فیل مہیا کئے جاتے ہیں۔ یہ علم جو اس وقت حضرت خاتون جنتؑ کے نام سے موسوم ہو گیا ہے اپنے مقررہ راستوں سے گذرتا پنجہ شاہ ولایت اور قدم رسول میں اپنی دھٹیاں وغیرہ لیتا ہوا براہ حویلی قدیم پل چادر گھاٹ پہنچتا ہے۔ اور بعد مغرب ٹھنڈا کیا جاتا ہے و ٹھنڈا کئے جانے کے بعد سرکاری نگرانی ہی میں علم کی کشتی عاشور خانہ پہنچائی جاتی ہے۔ یہاں بھی عامۃ الناس کی وہی کیفیت رہتی ہے جو پل قدیم پہ مگر فرق اتنا ہے کہ یہاں باجوں کی جھنکار سنائی نہ دیگی البتہ ایسا مجمع نظر آئیگا۔ جو شہید مظلوم کی یاد میں متالم و متاسف ہے اور اس کے سوا قدم قدم پر شہید مظلوم کی یادگار میں سبیلیں نظر آئیں گی۔ علم ٹھنڈا ہونے کے بعد جب مجمع چھٹ جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہُو کا عالم ہے اور سنسان سڑکیں۔ ہاں وہ مکانات اور مقامات آباد نظر آتے ہیں جہاں مظلوم امام کی یاد منائی جاتی ہے اور قیامت تک منائی جاتی رہے گی۔ حیدرآباد کے سوا سکندرآباد میں بھی دس تاریخ کو ایسا ہی مجمع ہوتا ہے جہاں میدان کربلا میں جملہ علم کی سواریاں آتی اور ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

دس محرم اور گیارھویں شب کو مٹڑ کی تعلیم سے جو فتح دروازہ کے قریب ہے ایک علم گشت کرتا ہوا قریب صبح پُرانا پل پہنچتا ہے۔ یہ علم سر طوق کے نام سے موسوم ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ علم بہت قدیم ہے۔ جیسے جیسے یہ علم راستہ طے کرتا ہے مجمع بھی جو مرادمند وغیرہ پر مشتمل رہتا ہے۔ علم کے ساتھ ہی ندی کی طرف بڑھتا ہے۔ سُنتے ہیں کہ جس کی مراد پوری ہوتی ہے تو اس علم میں جس کا دور کافی بڑا ہے کھڑکی کھلتی ہے اور جو اس علم میں بیسیوں ہیں۔ مگر یہ اعتقاد زیادہ تر مستورات کا ہوتا ہے۔ اسی نام سے ایک اور بھی علم محلہ دارالشفا میں پلٹن علی مرزا خان کے کوارٹر گارڈ میں ہے جو اب الاوہ سر طوق حسینی کے نام سے موسوم ہے۔ اس علم کی قدامت کا ثبوت شہنشاہ عالمگیر علیہ الرحمہ کی مہری تحریر ہے۔

۱۱ محرم کو ایک علم کی سواری راجہ شام راج بہادر کے علاقہ سے نکلتی ہے جو روئی کے پنجہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے ساتھ جو میلہ رہتا ہے وہ بھی علم کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ اور قریب شام یہ علم ٹھنڈا ہوتا ہے۔

عشرہ محرم کے بعد میلوں کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تاڑبن میں میلہ ہوتا ہے جہاں علم کی سواری بھی نکلتی ہے۔ یہ مقام تالاب میرعالم سے بہت قریب ہے اس لئے اکثر مرد عورت، بوڑھے بچے سب تالاب اور اس کے قریب کے میدانوں میں صبح ہی سے پہنچ جاتے ہیں اور شام تک یہیں تفریح میں گذارتے ہیں۔ یہاں اقسام کی دکانیں قایم ہوتی ہیں اور ان کے سوا پھیری والے الگ فروخت کرتے پھرتے ہیں۔ عورتوں میں کہیں ڈھول اڑتا ہے تو کہیں کڑھاؤ چڑھا کر تلن ہوتے ہیں غرض ایک ہما ہمی رہتی ہے جو بعد مغرب اختتام کو پہنچتی ہے۔

میلہ سنگیسر۔ ماہ صفر کی ۱۰ تاریخ کو یہ میلہ ہوتا ہے اور یہ مقام تالاب سرور نگر سے بالکل متصل ہے۔ یہاں بھی تفریح کرنے والوں اور مراد مندوں کا خاصا جمگھٹا رہتا ہے۔ جن میں بعض صبح سے آجاتے ہیں تو بعضے بعد عصر۔ مغرب کے بعد جب علم ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو یہ مجمع بھی منتشر ہو جاتا ہے۔

میلہ چشمہ بی بی۔ یہ میلہ قصر فلک نما کے نیچے ہوتا ہے یہاں ایک چشمہ موسوم بہ چشمہ بی بی ہے۔ جو حیات بخشی بیگم کا بناء کردہ ہے۔ اس میلہ میں عورتیں بہت آتی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی اَن بیاہی لڑکیاں جن کی شادی میں کبھی کچھ دیر ہو جاتی ہے تو اُن کو یہاں لاکر اس چشمہ کے پانی سے غسل کرایا جاتا ہے۔ یہ خوش اعتقادی صرف اسی دن کے لئے مخصوص نہیں بلکہ سال تمام یہاں نہادن کراتے ہیں۔

میلے عنبر پیٹھ۔ ۲۰ ماہ صفر یعنی بروز فاتحہ اربعین امام علیہ السلام یہ میلہ بمقام عنبر پیٹھ ہوتا ہے جو اطراف بلدہ حدود میں ہے۔ یہاں بھی خاصی چہل پہل رہتی ہے اور بلدہ سے بیسیوں گاڑیاں۔ ریلوے بس وغیرہ لوگوں کو لاتی اور لیجاتی ہیں۔ پہلے یہ اور دوسرے میلوں میں دکانوں وغیرہ کے سوا جوئے خانے بھی قایم ہوتے تھے جو حکماً مسدود کر دئے گئے ہیں۔ بعد مغرب جب علم اپنے معمولات حاصل کرتا ہوا ٹھنڈا ہونے چل پڑتا ہے تو یہ مجمع بھی اپنے گھروں کا راستہ لیتا ہے۔

میلہ عنبر پیٹھ سے قبل چند اور بھی میلے ہوتے ہیں جس میں میلہ علم آتشیں زیادہ قابل ذکر ہے۔ یہ میلہ مشیر آباد میں ہوتا ہے اور جس رات میں یہ علم کی سواری ہوتی ہے ہزاروں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ عاشور خانہ کے سامنے کئی بنڈی جلانے کی لکڑی کا انبار لگا کر روشن کر دیا جاتا ہے اور جب یہ لکڑی سرخ دہکتی ہوئی آگ ہو جاتی ہے تو اس آگ کو پھیلا دیا جاتا ہے اور نصف شب کے بعد جب علمبردار نہا دھو کر علم اٹھا لیتا ہے تو یا حسینؑ یا علیؑ کے نعروں میں پہلے علمبردار آگ کو روندنا شروع کر دیتا ہے اور اس کے بعد ہر وہ شخص جو آگ میں جانا چاہتا ہے۔ آپ یہ نہ سنیں گے کہ کسی کے پاؤں کو آگ سے صدمہ

پہنچا ہو اور تو اور یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میں بھی آگ میں گشت کیا ہوں اور مجھے کچھ بھی تکلیف نہ ہوئی۔

اس میلہ کے سوا چند اور چھوٹے میلے جو ترپ بازار ۔ اور فیل خانہ میں ہوتے ہیں ان میں پہلے زیادہ تر نام ونمود اور مار پیٹ ہوتی تھی مگر سررشتہ کوتوالی کے حسن انتظام سے اب ایسے شریرالنفس جو جھگڑوں وغیرہ کے سرغنے کہلاتے تھے کچھ تو دنیا سے رخصت ہوچکے اور جو باقی رہ گئے اپنی خباثت نفس سے تائب ہوچکے اور سیدھے کردئے گئے۔

میلہ آخری چہار شنبہ ۔ یہ میلہ صفر کے مہینہ میں آخری چہار شنبہ کے روز ہوتا ہے اور اس میلہ کے لئے بالعموم کوئی مقام مختص نہیں ہوتا۔ صاحبان ثروت جو میلوں وغیرہ کے دلدادہ اور تفریح کے گرویدہ ہوتے ہیں وہ تو تفریح کے لئے باغات وغیرہ منتخب کرتے ہیں دوست احباب سب یکجا جمع ہوکر تمام دن وہیں گذارتے ہیں۔ مختلف پکوان ہوتے ہیں اور شام تک وہیں گپ شپ میں گذرتی ہے ۔ وہ لوگ جن کو کوئی خاص جگہ نہیں مل سکتی وہ تالاب یا پبلک باغات وچمن وغیرہ میں گذارتے ہیں اور صبح بہت سویرے ہی گھروں سے نکل کر کوئی اچھی جگہ قبضہ جمایا جاکر دری وغیرہ بچھادی جاتی ہے جو لوگ تالاب پر پہنچتے ہیں وہ وہاں اپنا ڈیرا جماتے ہیں۔ جھاڑوں پر جھولے پڑتے ہیں۔ تالاب میں شناوری ہوتی ہے۔ آم کے پتوں پر سلام ؐعلی نوح فی العالمین ؐ لکھکر تالاب میں چھوڑ دیتے ہیں۔ نقوش تیار کئے جاتے ہیں۔ پردوں میں مستورات الگ ٹھیرتی ہیں۔ کڑھائیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ گلگلے بھجئے وغیرہ تلے جاتے ہیں۔ ڈھول اڑتا ہے۔ علی قدر مراتب سب گلے بازیاں کرتے ہیں اور مغرب کے بعد یہ مجمع آہستہ آہستہ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوتا ہے۔ جو تفریح کے زیادہ شائق ہیں وہ دوسرے روز مکان لوٹتے ہیں ۔

میلہ ٹنگم پلی ۔ حیدرآباد سے ۶ میل پر ایک پہاڑ کوہ مولا علیؑ کے نام سے موسوم ہے۔ رجب کی ۱۷ تاریخ کو یہاں عرس ہوتا ہے۔ جس کا صندل دریچہ رنگ علی شاہ سے نکل کر اپنے مقررہ راستوں سے ہوتا ہوا صبح پہاڑ کو پہنچتا ہے ۔ پہلے بزمانہ غفران مکاں علیہ الرحمہ یہاں خاصی چہل پہل رہتی تھی یوں تو یہاں کی آب و ہوا ابھی اچھی ہے اور مقام بھی بہت بلند ہے۔ منظر قابل دید رہتا ہے۔ یہاں بہت سے امراء کے باغات و بنگلے بھی تعمیر ہوگئے ہیں۔ عرس میں اب بھی زائرین کی کثرت رہتی ہے جو باوجود بُعد مسافت جھٹکوں ٹانگوں شکراموں اور موٹروں وریلوے بسوں کے ذریعہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس عرس کے دوسرے روز ٹنگم پلی کا میلہ ہوتا ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے حیدرآباد میں سب سے بڑا میلہ ہے۔ یہ میلہ کاکے شاہ صاحب کی درگاہ سے قریب افضل گنج پھیلاؤ ہوتا ہے۔ اس میلہ میں بھی کھیل تماشے کے اسٹال ہوٹلیں عارضی چاء خانے کھلونوں کی دکانیں قایم ہوتی ہیں اور میلہ ختم ہونے کے بعد بھی دو چار روز تک خرید و فروخت کا سلسلہ قایم رہتا ہے۔ میلہ کے پہلے روز بوقت عصر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کا ایک سمندر ٹھاٹیں مار رہا ہے اور تل دھرنے جگہ نہیں مگر اب تو صرف نام ہی رہ گیا ہے۔ اس نوبت پر سب میلے ٹھیلے ختم ہوجاتے ہیں ۔

یہ تھا پہلے زمانہ کا محرم۔ جب سے کہ آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ سریر آرائے سلطنت ہوئے ہیں آپ نے ان تمام بدعتوں کو یک لخت موقوف کرنے حکم فرمایا جو محرم جیسے متبرک ماہ میں ہوا کرتے تھے نہ صرف یہ بلکہ آپ نے صحیح طریقہ بر حضرت امام مظلوم علیہ الصلوۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی ہر کہہ و مہ کو ہدایت فرمائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ حضرت امامؑ کی عظمت اور احسان کو سمجھ رہے ہیں۔ اس کے بعد اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محرم کے مہینہ میں پہلے کیا ہوتا تھا اور اب کیا ہو رہا ہے۔ اگرچہ حضرت امامؑ کو شہید ہوکر کئی سو سال ہو چکے مگر امام مظلوم کا کلمہ گو کے دل سے مٹی ہے نہ ابدالآباد تک مٹ سکتی ہے۔

خیالات آزاد

جناب سید محمد حسن صاحب آزاد (حیدر آبادی)

ہر ترقی علم کی تفسیر ہے — ہر تنزل جہل کی تشہیر ہے

کام اگر بن جائے تو تدبیر ہے — اور بگڑ جائے تو وہ تقدیر ہے

کیمیا ہے کیمیا ہر علم و فن — روپیہ سائنس ہی اکسیر ہے

ہے تماشے کا تماشہ دیدنی — چلتی پھرتی بولتی تصویر ہے

نونہالوں سے چمن آباد ہیں! — چشم بد دور ان کی وہ توقیر ہے

کیا جہانگیری کرے نور جہاں — جب لڑائی جھگڑا عالمگیر ہے

جان شیریں سے یہاں فرہاد تو — ہاتھ دھوئے بیٹھی جوئے شیر ہے

ہیں جہاں دیکھو وہاں تاریکیاں — روشنی نو کی یہ تنویر ہے

"اولڈ" سارے ہوگئے ہیں پوزیشن — "ینگ" لیکن وہ مس ہے پیر ہے

حلوا کھانے کے لئے منہ چاہئے — آج کل حلوا بھی ٹیڑھی کھیر ہے

باپ دادا کے طفیل آزاد کو

قدر ہے منصب چھوٹی سی جاگیر ہے

(۰)

نقد و نظر

جناب عطارد صاحب

ادب و شعر میں نفس مضمون سے زیادہ طرز ادا کا اہتمام مقدم اور اہم ہوتا ہے۔ کلام کا لطف مناسب الفاظ کے استعمال ہی پر موقوف ہے۔ خواہ نظم ہو یا نثر طرز ادا انتخاب الفاظ ہی کا نام ہے مگر آجکل تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک گروہ صرف مضمون ہی پر نظر رکھتا ہے۔ بندش کی خوبی طرز ادا کی خوش اسلوبی پر کسی کو توجہ نہیں حالانکہ ادیب یا شاعر کا کمال مضمون سے بڑھکر زبان کی تازگی بیان کی شگفتگی اور بندش کی خوبی پر منحصر ہے۔ ایک ہی مضمون کو مختلف پہلو سے نظم کر سکتے ہیں اس سے غرض جو اثر ہے وہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ بندش چست اور الفاظ درست ہوں چنانچہ ائمہ فن نے الفاظ کے انتخاب ہی پر بہت زور دیا اور اسی کو مقدم رکھا ہے۔ اس بیان کی توضیح میں آج میں جناب مولوی علی اختر صاحب تخلص اختر کی ایک نظم مثالاً پیش کرتا ہوں جو رسالہ ہندوستانی ادب بابتہ ماہ آذر۔ دے ۱۳۵۲ ف میں تحت عنوان "ابتداء" شایع ہوئی ہے اس کے ملاحظہ سے ثابت ہو سکیگا کہ مناسب الفاظ کے انتخاب سے نفس مضمون کی لطافت اور بیان کی خوبی و متانت پر کیا اثر پڑتا ہے اور بےمحل الفاظ سے کیا خرابی پیدا ہوتی ہے۔

دل کو لذت طلب بادۂ پندار نہ کر — دیکھ اس فتنۂ خوابیدہ کو ہشیار نہ کر

"لذت طلب" کا لفظ یہاں بےمحل ہے۔ لذت ایک حسی کیفیت ہے کوئی کسی کو یا اپنے دل کو لذت کا طلبگار نہیں بنا سکتا محسوسات فطری عوامل سے خود ہی پیدا اور فنا ہوتے رہتے ہیں یہ موقع لذت پرست کہنے کا تھا یا لذت کدہ کہتے تو وزن میں بھی فرق نہ آتا مگر مشکل یہ ہے کہ ردیف کے اعتبار سے یہاں کوئی لفظ بھی چسپاں نہیں کیونکہ "دل کو لذت طلب" "لذت پرست یا لذت کدہ کرنا یا نہ کرنا نہیں کہتے بلکہ" دل کو لذت طلب" بنانا یا نہ بنانا بولتے ہیں اس اعتبار سے پہلا مصرعہ ہی غلط ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "فتنۂ خوابیدہ" لذت کے واسطے کوئی مناسب کنایہ نہیں۔ لذت خود بخود پیدا ہوتی اور فتنہ پیدا کیا جاتا ہے لذت کا اثر ذات پر اور فتنہ کا اثر دوسروں پر ہوتا ہے لذت کو "خوابیدہ" کہنا بھی صحیح نہیں۔ قافیہ میں خوابیدہ کی مناسبت سے بیدار کا اچھا لفظ چھوڑ کر "ہشیار" کا لفظ جو استعمال کیا گیا اوس کی کوئی خاص وجہ ظاہر نہیں ہوتی۔

تو اگر کیف کے اسرار سے ناواقف ہے — آ۔ سرمیکدہ اندازۂ گفتار نہ کر

"کیف کے اسرار" سے قطع نظر "اندازگفتار" قابل غور ہے۔ فارسی میں اندازۂ تقریر ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں بات کرنے کی قدرت یا جرات

سالہا حامل دیوان خموشی بودم ؎ ہیچکس را بمن اندازۂ تقریر نبود (ظہوری)

اسی مناسبت سے "اندازۂ گفتار" کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا اردو کی نظم و نثر کو فارسی کے ایسے ناماموس محاورات سے گرانبار کرنا مستحسن سمجھا جا سکیگا۔

خلوت روح میں خوابیدہ ہیں اجزائے امید اس سے بڑھکر ہوس لذت آزار نہ کر

"خلوت" کے معنی ہیں تنہائی مجازاً وہ مقام جہاں کوئی نہ ہو۔ جسم خاکی میں روح کی تنہائی کا وہ کونسا مقام ہے جس کو "خلوت روح" کہہ سکتے ہیں۔ روح تو جسم کے ہر رگ و پے میں دایر و سایر ہے۔ "امید" کا مسکن روح یا "خلوت روح" کو قرار دینا بھی صحیح نہیں امید کا تعلق دل سے ہے۔

دل ہی نہ رہا امید کیسی! جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی!!

امید مردہ تو کہتے ہیں مگر "امید خوابیدہ" نامقبول جدت ہے۔ "اجزائے امید" بھی مہمل امید قسمت پذیر شئی نہیں اور نہ اوس کے اجزا ہو سکتے ہیں۔ مصرعہ ثانی میں "اس سے بڑھکر" کے الفاظ سے شاعر کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وصال یار کی امید میں ہجر و فراق کی "لذت آرزو" تو حاصل ہوئی مگر امید بر نہ آئی اور اب چونکہ "امید سوگئی" یعنی منقطع ہوگئی لہٰذا مزید "لذت آزار" کی ہوس نہ کر یعنی وصال یار کے خیال سے درگزر مگر افسوس ہے کہ الفاظ اس مطلب کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم کو تو یہ در انتباہ ہی آداب عاشقی کے منافی پایا جاتا ہے عاشق صادق تو امید و انتظار کی صعوبتوں میں بھی لذت محسوس کرتا ہے اور اس سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا کیونکہ کم از کم یاد جانان سے دل تو غافل نہ رہے۔ عرفی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

من لذت درد تو بدرماں نہ فروشم دشوار بدست آید و ارزاں نہ فروشم

سچ ہے۔ ع ہوس دیگر و عاشقی دیگر است۔

دل ہے اور سر سے گزرتا ہوا اک موجۂ خون بیخودی کو رہ دانش سے خبردار نہ کر

"دل ہے" یعنی سب کچھ جا چکا صرف ایک دل ہے "سر سے گذرتا ہوا موجۂ خون" سے کیا مراد ہے؟ اردو میں کسی ناگوار یا ناقابل برداشت واقعہ کے پیش آنے پر کہتے ہیں سر سے پانی اونچا ہو گیا مگر سر سے پانی یا موجۂ خون گزر گیا نہیں بولتے۔ "موجۂ خون" یہاں نہ مجاز ہے نہ کنایہ معنے حقیقی کے اعتبار سے بھی مہمل اور خلاف عقل ہے۔ آخر یہ "موجۂ خون" ہے کیا چیز اور کہاں سے یہ موج چلی آرہی ہے؟ "بیخودی" کیوں پیدا ہوئی۔ کیا محض اس وجہ سے کہ سر پر سے خون کی ندی رواں ہے؟ "بیخودی" مرادف بیہوشی یا بے عقلی تو نہیں جو اوس کو "رہ دانش" کی ضرورت ہو، البتہ "بیخودی" کو خودی میں آنے کی ضرورت ہو سکتی ہے دونوں مصرعوں میں کوئی ربط بھی نہیں جو کچھ معنی ہی سمجھ میں آسکیں۔

کچھ نہیں ہستیٔ دوراں جو یہ پردہ اٹھ جائے سطح ہیں روح کو وقف رہ اسرار نہ کر

"ہستی" بمعنے وجود مقابل نیستی۔ "دوران" بمعنی گردش آسمان۔ زمانہ یا وقت ؎ دوران فلک مُنحرف زمان تو باد۔ (ظہیر)
؎ پیالہ گیر کہ دوران چو دور لالہ گذشت (باقر کاشی) ؎ دوران بقا چو باد صحرا بگذشت۔ غرض "ہستی دوران" با معنی ترکیب نہیں دوران ہستی کہہ سکتے ہیں۔ "جو یہ پردہ اٹھ جائے" جملہ شرطیہ اوس کی جزا "ہستی دوران کچھ نہیں" "یہ" حرف اشارہ "پردہ" مشار الیہ مگر "یہ پردہ" ہے کہاں اور کس کو قرار دیا ہے؟ روح کو وقف رہ اسرار نہ کرنے کا انتباہ تو کیا کہنا لاجواب ہے۔

تیری تعمیر ہے وابستۂ آئین حیات آ۔ محالات کی تخیل پر اصرار نہ کر

"تعمیر" کا لفظ بمعنی تخلیق استعمال ہوا ہے مگر تخلیق کو چھوڑ کر تعمیر کا لفظ استعمال کرنے کی کوئی وجہ ظاہر نہیں ہوتی مرزا غالب کے اس شعر میں

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

محض لفظ خرابی کی مناسبت سے تعمیر کا لفظ اختیار کیا گیا لیکن یہاں تو کوئی ایسی مناسبت لفظی بھی نہیں پائی جاتی۔
"آئین حیات" بھی یہاں معنی خیز نہیں تعمیر یا تخلیق کو آئین حیات سے کیا تعلق۔ مصرعہ ثانی میں (آ) کا لفظ بھی بے ربط و بے محل ہے محض سبب خفیف کی تکمیل ہی مقصود تھی تو ردیف کی مناسبت سے (جا) کا لفظ اچھا تھا۔ "محالات کی تخیل" تو اس مصرعہ پر قطعاً صحیح نہیں۔ ؎ جا محالات کی تفہیم پہ اصرار نہ کر۔ کہتے تو کم از کم مصرعہ با معنی ہو جاتا

تجھ کو فطرت نے عطا کی ہے جو روح بیباک فتحمندانہ گرز عجز کا اقرار نہ کر

روح عطیہ فطرت نہیں وہ تو صرف امر رب اور عطیہ قدرت ہے۔ روح کی صفت "بے باک" صحیح نہیں۔ "فتحمندانہ گرز" کے مقابلہ میں شکست کا اقرار نہ کر ہونا چاہیئے تھا عجز کا لفظ نہ صرف بے محل بلکہ اصول سخن طرازی کے خلاف ہے۔

ذرہ ذرہ ہے اک آئینہ تنویر جمال بے خبر اپنی حقیقت سے تو انکار نہ کر

"حقیقت سے انکار نہ کر" کی تنبیہ تو کچھ نہیں "بے خبر" کو اپنی حقیقت سے باخبر ہونے کی ہدایت ہونی چاہئے تھی۔

دل کہ ہے راہ بر جادہ میدان عمل اس کو آسائش منزل کا طلبگار نہ کر

"عمل" سے مراد یہاں نیک عمل ہے۔ دل تو نیک و بد دونوں طرح کے اعمال کی رہبری کر سکتا ہے اس لئے یہ مصرعہ شرطیہ جملہ میں ہونا چاہئے تھا۔ ؎ دل ہے گر راہ بر جادۂ میدان عمل۔ دوسرا مصرعہ تو باعتبار معنی و مفہوم صحیح نہیں۔ ہر عمل کا ایک مقصد ہوتا ہے "میدان عمل کی جادہ پیمائی" صرف مقصد یا بالفاظ دیگر منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہے مقصد حاصل ہو گیا تو گویا منزل

پر پہنچ گئے اور آسائش مل گئی جو عین مقصود تھی۔ اس مقصد یا آسائش کی طلب کے بغیر جادہ پیمائی مجنونانہ صحرا نوردی ہوگی۔ اس بحث سے قطع نظر ردیف "نہ کر" یہاں چسپاں نہیں "طلبگار" نہ بنا کہہ سکتے ہیں

دہر پابستۂ زنجیر علائق کب تک　　روح آزاد کو اس درجہ گرانبار نہ کر!

مصرعہ اولی ہم کو تو کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔ دہر کو "پابستۂ علائق" کس مناسبت سے کہہ سکتے ہیں۔ "دہر" تو یہی رات دن کا سلسلہ ہے جو گذر رہا ہے۔ "دہر" کے وہ کیا علائق ہیں جس سے وہ پابستہ ہو رہا ہے؟ "دہر" کو منادیٰ فرض کیجئے تو بھی کچھ معنی نہیں ہوتے۔ روح کی صفت آزاد ہی مہمل ہے بلکہ وہ تو ایک مقررہ وقت تک بحکم الٰہی جسم خاکی میں مقید ہے۔ "آزاد" کے مقابلہ کا لفظ مقید ہے نہ کہ گرانبار البتہ سبک کے مقابلہ میں گرانبار کہہ سکتے ہیں

آنجا کہ سبک روح تبش آمد بہ تکلم　　زآسیب گرانی بخرد گوش اصم را　　(عرفی)

اس نظم میں روح کا استعمال بار بار ہوا ہے اور عجیب عجیب اوصاف اوس کے لئے تجویز فرمائے گئے ہیں۔

فتح انجام عمل وہم کی تخلیق شکست　　اس میں کچھ شک ہے تو پھر ہمت پیکار نہ کر

فتح کو انجام عمل کہنے میں تخیل کی تو کوئی خوبی نہیں ہر کام عمل ہی سے انجام پاتا ہے۔ "وہم کی تخلیق شکست" تو غلط ہے کیونکہ بلا قصد کسی شئی کی طرف دل کے میلان اور غلط گمان کو وہم کہتے ہیں فتح اور شکست دونوں کی طرف وہم مضاف ہوسکتا ہے جیسا شکست کا وہم ویسا ہی فتح کا وہم بہرحال کسی کو شک ہو یا نہ ہو ہم کو تو اس "اشتباہ" کی صحت میں شک ہے۔

بیم فردا سے نہ کر عشرت امروز تباہ　　بے خبر روز درخشاں کو شب تار نہ کر

"سطح بین" کی نظر میں تو یہ شعر اچھا ہوگا کیونکہ صنعت لف و نشر غیر مرتب بھی ہے اور بظاہر بے عیب مگر بہ نظر تعمق دیکھئے تو نقائص موجود ہیں۔ "بیم فردا" بے محل ہے۔ "بیم فردا" یعنی کل کا خوف تو اوسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب کسی ناگوار واقعہ کے پیش آنے کا پہلے سے علم ہو حالانکہ کل پیش آنے والے واقعات کا عموماً کسی کو علم نہیں ہوسکتا لہذا یہاں فکر فردا کہنا چاہئے چونکہ کل کی کیفیت سے ہر شخص ناواقف رہتا ہے اس لئے مخاطب ہی کو "بے خبر" کیوں کہا جائے۔ "بے خبر" کے عوض بے سبب کہنا اچھا ہے۔ یہ سب کچھ صحیح مگر ردیف کی وجہ جو نقص پیدا ہو رہا ہے اس کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا۔ یہاں ردیف "نہ کر" بول چال کے خلاف ہے۔

زندگی صرف رہ مرگ خدارا اختر!　　قلعہ وہم میں عنقا کو گرفتار نہ کر

"رہ مرگ" یعنی موت کا راستہ۔ موت کے راستہ میں زندگی صرف کرنا کیا معنی؟ موت کے خوف میں زندگی بسر کرنے کا مفہوم تو ان الفاظ سے نہیں پیدا ہوتا۔ عنقا ایک فرضی جانور ہے۔ عنقا کو قلعہ میں گرفتار کرنا تو مہمل ہے۔ کسی جانور کو جال یا پھندے میں گرفتار کرتے ہیں نہ کہ قلعہ میں۔ عنقا کا لفظ اردو اور فارسی میں بطور مجاز شئی ناپید کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

طالع بدنے کبوتر کو بھی عنقا کر دیا (آتش)

اے کہ ہمراہ موافق بہ جہاں می طلبی آں قدر باش کہ عنقا بہ سفر باز آید ! (عرفی)

زندگی تو خود موت کی تمہید ہے موت سے کون بچ سکتا ہے ۔ کل من علیہا فان ، پس موت کے خیال کو وہم اور موت کو عنقا کہنے میں نہ تو کوئی شعری لطافت ہی ہے اور نہ اس "اشتباہ" میں کوئی صداقت ۔

غزل

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

وضعداری نے کبھی دل کو مچلنے نہ دیا
اپنی حالت کو کسی حال بدلنے نہ دیا

آشیاں دور نہ تھا کنج قفس سے صیاد
پاس خاطر نے ترے مجھ کو نکلنے نہ دیا

ایسے بیار محبت کا نہ پوچھو احوال
وصل کی آس نے بھی جس کو سنبھلنے نہ دیا

گرمیٔ عشق نے میری یہ دکھایا اعجاز
دھوپ کی طرح ترے حسن کو ڈھلنے نہ دیا

خشک ہی رہ گیا افسوس میرا نخل مراد
یاس و حسرت نے کبھی پھولنے پھلنے نہ دیا

پاس رسوائی نے خاموش ہی رکھا مجھ کو
حرف شکوہ بھی میرے منھ سے نکلنے نہ دیا

وا رہیں صورت آغوش سحر تک آنکھیں!
شوق دیدار نے پہلو بھی بدلنے نہ دیا

رہ گئی دل ہی میں نظارۂ قاتل کی ہوس
موقع اتنا بھی دم قتل اجل نے نہ دیا

تھا ارادہ تو بہت حج و زیارت کا عزیز
بدنصیبی نے مگر گھر سے نکلنے نہ دیا

پرتال

جناب سید نورالحسین صاحب بی۔ اے

جنوبی ہند میں مدگل ایک مشہور مقام ہے۔ پانی پت کی طرح اس مقام پر بھی کئی لڑائیاں لڑی گئیں۔ اس مقام پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ ہندو رعایا آرام وچین کی زندگی بسر کررہی تھی۔ کسان خوش تھے لیکن سب سے زیادہ خوش قسمت وہ کسان تھا جس کے گھر میں بیٹا پیدا ہونے کی بجائے بیٹی پیدا ہوتی۔ یہ لڑکی قدرت کا شاہکار تھی۔ قدرت نے حسن کا اُس کو مجسمہ بنایا تھا حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت بھی عطا ہوا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ ایک قابل اور لائق برہمن نے اس لڑکی کو علم کے زیور سے آراستہ کرنا شروع کیا جب وہ جوان ہوئی اور زیور علم سے مرصع ہوچکی تو برہمن گرو نے اُس کی صورت، سیرت، تہذیب، تمیز اور علمیت کے مدنظر یہ خیال کیا کہ پرتال کی شادی وجے نگر کے رانا سے ہونی چاہیئے۔ وہ اس قابل ہے کہ راج محل میں رہے اور مہارانی بنے۔

برہمن وجے نگر روانہ ہوا اور رانا کے حضور میں پہنچ کر دست بستہ یوں عرض پرداز ہوا "اَن داتا۔ مدگل گاؤں میں ایک برہمن کسان رہتا ہے۔ پرمیشور نے اُس کو ایک کنیا دی ہے جو چندے آفتاب اور چندے مہتاب ہے۔ چندرما کی روشنی اُس کے چمکتے چہرہ کے سامنے پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ اُس کے رخساروں کا رنگ کندن کی طرح دمکتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں بجلیاں چمکتی ہیں شوخ آنکھیں ہمیشہ کسی کو تلاش کرتی رہتی ہیں۔ اُس کا قد موزوں ہے۔ تناسب اعضاء کا یہ حال ہے کہ اگر ایک تل کا سڈول پن میں فرق ہوتا تو اُس کو قدرت کی کاریگری کا اعلیٰ نمونہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ گردن ہنس جیسی ہے اور چال مور سے ملتی ہے۔ اُس کے پسینہ میں مشک عنبر جیسی مہک ہے۔ باتیں کرتی ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ غرض یہ کہ ایسی موہنی صورت منش تو منش دیوتاؤں کی نظر سے بھی نہیں گذری ہوگی۔ وہ اس قابل ہے کہ آنکھوں میں بٹھائی جائے اور پھر آنکھوں کو بند کرلیا جائے تاکہ کوئی دوسرا اُس کو نہ دیکھ سکے۔

پرتال کے حسن کا تذکرہ برہمن کی زبان سے سن کر رانا کے دل میں نادیدہ محبت کی آگ بھڑک اٹھی اور اُس کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پرتال کو اپنے حرم میں داخل کرے۔ اُس نے برہمن کو مال وزر سے نہال کردیا اور حکم دیا کہ جس قدر قیمتی زیور، جواہرات اشرفیاں وہ لیجانا چاہے خزانۂ شاہی سے لیجائے اور پرتال کے ماں باپ کو راضی کرکے پرتال کو وجیانگر کی رانی بناکر لے آئے۔ کسان کو راناکا خطاب بخشا گیا اور راج محل میں پرتال کے استقبال کی زور شور سے تیاریاں شروع ہوگئیں۔ برہمن دنوں کا راستہ گھنٹوں میں طے کرتا منزلیں مارتا مدگل پہنچا۔ کسان اور اس کی بیوی کے سامنے ہیرے، لعل اور یاقوت کے زیورات کا ڈھیر لگا جگمگ جگمگ کررہا تھا۔ اشرفیاں انبار کی انبار پڑی تھیں۔ کسان اور اُس کی پتنی خوش تھے اور اپنے بھاگ پر پھولے نہیں سماتے تھے اس سے بڑھکر اُن کے لئے خوشی کی کیا بات ہوسکتی تھی کہ جھونپڑے میں پیدا ہونے والی لڑکی وجیانگر کی رانی بننے والی تھی۔ وہ خوشی خوشی پرتال کے

پاس گئے۔ ماں کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ بیٹی کو سینہ سے لگایا۔ مسرت کے آنسو نکل پڑے۔ مہارانی وجیا نگر بننے کی مبارکباد دی پرتال کے گردن میں ماں ہیروں کا مالا پہنانے اور سگائی کو پکا کرنے کے لئے آگے بڑھی لیکن پرتال جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر بھرائی ہوئی آواز میں اپنے باپ سے کہا۔ "آپ خوش ہیں کہ مجھے دولت اور آبرو مل رہی ہے لیکن میں اس دولت کو ہیچ سمجھتی ہوں جس کو پا کر میں آپ لوگوں سے چھوٹ جاؤں گی۔ رانی بننے کے بعد میں راناکے محل میں قید کر دی جاؤں گی۔ آپ کے درشن ناممکن ہو جائیں گے۔ ماں کے چرن چھونے کو نہ ملیں گے۔ تف ہے ایسی دولت پر جس کو پا کر انسان اپنا اطمینان قلب کھو بیٹھے۔ میں باز آئی رانی بننے سے۔ روکھی سوکھی کھا کر جیون تیا دوں گی۔ جھونپڑی کو راج محل سمجھوں گی۔ فاقے کر دوں گی۔ لیکن حرف شکایت زبان پر نہ لاؤں گی۔ مجھے معاف کیا جائے۔

برہمن نے پرتال کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس دُھن کی پکّی نے ایک نہ مانی اور کہا۔ "گرو مہاراج۔ بیواہ مایا کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ یہ عمر تمام کا بندھن ہے۔ میں اپنے آپ کو بیچنے کے لئے تیار نہیں۔ من کی سودا اشرفیوں سے نہیں ہوا کرتی۔ میں مر جاؤں گی لیکن راناکی رانی بننا قبول نہ کروں گی"۔ کہکر پرتال کی حسین، چمکدار آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہوکر رخساروں پر بہنے لگی۔ اس کا چاند سا چہرہ سرخ ہوکر تمتمانے لگا۔ آواز بھرا گئی اور وہ سسکیاں بھرتی ہوئی گردن نیچے کئے ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے کونے میں جا کر لیٹ گئی۔

برہمن دل شکستہ اور مایوس ہوکر وجیانگر واپس گیا۔ اُس کے پیر مَن مَن بھر کے ہو رہے تھے۔ شرم کی وجہ سے راستہ چلنا دشوار تھا۔ برہمن کو لجا آرہی تھی کہ راناکو کیا منہ دکھائے گا۔ برہمن نے اپنی ناکامی کا قصہ مختصر الفاظ میں راناکو سُنایا۔ نفس امارہ نے زور مارا۔ محبت کا بھوت بری طرح راناکے سر پر سوار ہو چکا تھا۔ وہ غصہ سے بھڑک اٹھا اور ارادہ کر لیا کہ اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا تو ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالا جائیگا۔ اگر وہ بت عنایتوں سے رام نہیں ہوتا تو قہر اور غضب سے قبضہ میں لایا جائے گا۔ وہ چیدہ فوج لے کر مدگل پر حملہ آور ہوا۔ اُس زمانہ میں فیروز شاہ بہمنی بادشاہ تھا۔ مدگل اس کے راج کا ایک حصہ تھا۔ رانا نے پانچہزار سواروں سے اُس کھیڑے پر حملہ کیا جہاں پرتال رہتی تھی۔ وزراء نے روکا۔ دوستوں نے منع کیا۔ بزرگوں نے نصیحت کی، لیکن راناکے سمجھ میں اگر کوئی بات آتی تھی تو صرف یہ کہ پرتال کو کسی دام وں حاصل کیا جائے۔ رانا سے ایک غلطی یہ ہوئی کہ اُس نے برہمن کے ذریعہ سے پرتال کے ماں باپ کو اطلاع نہیں دی لوگ گاؤں چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اس بھاگڑ میں پرتال اور اُس کے ماں باپ بھی فرار ہوکر گلبرگہ چلے گئے۔ رانا نے زمین آسمان ایک کر دیا۔ چپہ چپہ چھان مارا۔ لیکن پرتال کا کہیں پتا نہیں چلا۔ غصہ اور نامرادی سے وہ دیوانہ ہوگیا اور مدگل کی آبادی کو تہہ تیغ کر ڈالا۔

اِس کشت و خون کی خبر فیروز شاہ بہمنی کو پہنچی۔ اس کی رگ حمیت و غیرت بھڑک اٹھی۔ طوفان کی طرح ایک جرار لشکر لیکر

اٹھا اور بجلی کی طرح دجیانگر کے علاقوں پر جا گرا۔ اس نے اپنی بے گناہ رعایا کا بدلہ لینے کی ٹھان لی تھی اور قسم کھائی تھی کہ مدگل کی خون ریزی کا بدلہ نہ لوں گا تلوار میان میں نہ رکھوں گا۔ معرکے مارتا ہوا اور خون کے دریا بہاتا ہوا وجیانگر جا پہنچا۔ شہر کا محاصرہ کیا گیا۔ رانا اور اس کی فوج کی ہمت ٹوٹ گئی۔ وزیروں اور سلطنت کے امیروں نے رانا کو صلاح دی کہ صلح کر لینی چاہیئے۔ دیو رائے کو صلح کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ فیروز شاہ کے ساتھ دیو رائے کی لڑکی کی شادی ہوئی۔ کثیر ملک و دولت جہیز میں دیا گیا جس میں راستہ میں دولہا کے لئے سنہرے اور روپہلے اور مخملی فرش کئے گئے تھے۔ راستہ میں حسین ترین لڑکے اور لڑکیاں قطار در قطار کھڑے تھے۔ دولہا کی سواری جب اُن کے درمیان سے گذرتی تو وہ خوش ہو ہو کر سونے چاندی کے پھول اُس پر سے نچھاور کرتیں۔ عورتوں، مردوں، جوانوں، بوڑھوں نے دولہا کو سلامی دی اور قیمتی سے قیمتی تحفہ نذرانہ کے طور پر پیش کئے گئے محل کے قریب آ کر رانا اور فیروز شاہ گھوڑوں سے اترے اور ایک مرصع پالکی پر جلوہ افروز ہوئے، ہیرے اور جواہرات پالکی میں جا بجا جڑے ہوئے تھے۔ نہایت شان و شوکت سے دولہا کی سواری دولہن کے گھر آئی۔ تین دن ناچ رنگ، شراب کباب کی محفل گرم رہی۔ چوتھے دن دولہا مع دولہن کے رخصت ہوا۔

دارالخلافہ واپس آتے ہی فیروز شاہ نے پرتال کو دربار شاہی میں طلب کیا۔ پرتال کے حُسن کو دیکھ کر فیروز شاہ ششدر رہ گیا۔ حسین خاں فیروز شاہ کا بیٹا اور ولی عہد سلطنت تھا سن و سال کے لحاظ سے پرتال اور حسین خان کا جوڑ تھا۔ لہذا فیروز شاہ نے پرتال کی شادی حسین خان سے کر دی۔

غزل

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی۔ اے (امرتسری)

حقیقت ہے بہرصورت عیاں فطرت کے جوہر کی	حلاوت نغمہ ہائے نے میں ہے قند مکرر کی
دل خود بیں سے آب و گل کی صورت مٹ نہیں سکتی	کہ اس آئینہ میں تمثال ہے سد سکندر کی
بپا ہستی میں گیرو دار کا ہنگامہ تھا لیکن	اجل نے ایک چشمک میں مہم زندگی سر کی
مرے اشک ندامت سے ہے افزائش گناہوں میں	فزوں تر آبرو ہوتی ہے میرے دامنِ تر کی
زبان حال شمع بزم سے میں نے سنا اکثر	کہ روشن رشتۂ جاں ہے اگر پروانہ ہو سر کی
مرا تیر نگہ افلاک پر پرواز کرتا ہے	تعجب کیا اثر آتا ہے اگر واعظ بھی بے پر کی
پریشاں فکر جمع مال سے ہے خاطر منعم	پراگندہ نہیں ہوتی ہے بو گلہائے بے زر کی
نگاہ اہل بینش میں ہے عظمت خاکساری کی	کہ سجدہ ریز ہے فرش زمیں پر چشم اختر کی

تمھارے بغیر!

جب :- شام کی خاموش فضا میں مغربی سمت پر بادلوں کا ایک طویل اور رنگین سلسلہ بجلیاں چمکا رہا ہو۔

: :- رات کی تاریکی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کسی کے زلف دراز میں بھی اضافہ ہوتا جائے۔

: :- کسی اجنبی کے یکایک کرے میں چلے آنے سے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔

: :- مینہ برسنے سے قبل گھنے بادل قدرت کے اشارے کے منتظر ہوں۔

: :- ندی کا صاف اور شفاف پانی زور دکھانے کے بعد تھک کر آہستہ آہستہ ڈھلاؤ کی جانب بہتا ہو۔

: :- جنگل کی فضا سے متاثر ہو کر مور اپنا مست رقص شروع کرتے ہوں۔

: :- کسی حسین دوشیزہ کا محبوب چہرہ دل کی دھڑکنوں سے خود بخود گلابی نظر آئے۔

: :- پھول چمن میں چاروں طرف اپنی بہار دکھائیں۔

: :- ساون میں کوئل بیتاب ہو کر چیختی پھرے۔

: :- پپیہا کے دن رات کی مسلسل پی کہاں سے دل میں ایک ہیجان برپا ہو۔

.. :- انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے پر آنکھیں تھک جائیں اور دل مایوس ہو جائے۔

: :- بکھرے ہوئے تاروں کے درمیان چاند آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہو۔

: :- بجلی بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلنے کیلئے بیتاب ہے۔

: :- آبشار کسی کی یاد میں اپنا سر پتھروں پر مسلسل ٹپکتے رہے۔

: :- بانسری سے خوشگوار نغمے نکل کر آہستہ آہستہ فضائے بسیط میں پھیلنے لگیں۔

. . . . تمھاری یاد ایسے لمحوں میں بے چین کرتی ہے۔ آہ ! ایسے موقعوں پر تمھاری یاد میرے وہم کو اور بھی تقویت پہنچاتی ہے جو وعدہ تمھاری زبان سے کئی بار ادا ہو چکا۔ تمھارے بغیر جو کیفیت اس مضطرب دل کی ہوا کرتی ہے وہ ان چند اشعار سے ظاہر ہوگی۔:-

تاروں میں محبت کا جہاں ڈھونڈ رہا ہوں۔
گذری ہوئی راتوں کے نشاں ڈھونڈ رہا ہوں

جو میرے لئے منتظر جانب در تھی!
اب تک وہی چشم نگراں ڈھونڈ رہا ہوں

جس کیلئے خود حسن کے انداز ہیں بے چین
وہ سوز نہاں قلب تپاں ڈھونڈ رہا ہوں

دکھ درد کی ان چاند ستاروں کو خبر کیا
کھوئے ہوئے دل کو میں کہاں ڈھونڈ رہا ہوں

ناکام دعاؤں کا اثر ڈھونڈ رہا ہوں

ہیں اوس کی بوندوں میں شرر ڈھونڈ رہا ہوں

پھر دل کو ہے اک تازہ جراحت کی ضرورت

اوس شوخ کا انداز نظر ڈھونڈ رہا ہوں

اے وہ کہ تری یاد میں ہیں دیدۂ و دل فرش

ابتک میں تری راہ گزر ڈھونڈ رہا ہوں

درد و غم ہستی کی دوا ڈھونڈ رہا ہوں

دیوانہ ہوں آغوش فنا ڈھونڈ رہا ہوں

اللہ نگہبان مرے ذوق طلب کا

یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا ڈھونڈ رہا ہوں

میں بے چین ہوں اور تم مجبور ہو۔ حقیقی محبت کی منزل ہی یہی ہے۔

× × ×

غزل

موج حیدرآبادی

درد کی دل پہ حکمرانی ہے — غم بعنوان زندگانی ہے

دوشِ غم پر ہے یاس کی میت — ضبط، مصروف نوحہ خوانی ہے

زندگی، موت کا سراپا ہے — موت، انجام زندگانی ہے

درد منت کشِ تمنا ہے — رنج، محروم شادمانی ہے

ہجر کی یاد ہمنشیں توبہ — ہر نفس مرگ ناگہانی ہے

دل ہے پامال شہرت آلام — یہ بھی اک تیری مہربانی ہے

بحر ہستی میں جوش طوفاں ہو

موج نام اُس کا زندگانی ہے

صحرانوردی

فاضل (دبالاپوری)

اے شاعر! تجھے میری صحرانوردی پر تعجب کیوں ہوتا ہے؟ جسے زندگی کہتے ہیں وہ یہی دوڑ دھوپ ہے۔

اے ہمیشہ آبادی میں رہنے والے! مجھے صحرا میں جو لطف قدرتی مناظر کے دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے وہ سماں تجھے دیکھنا نصیب نہیں ہے۔ تو نے کبھی بانگ رحیل کا فضا میں گونجنا۔ ریت کے ٹیلے پر آہو کا بے پروائی سے خرام کرنا۔ صبح کے وقت ستارے کا ٹمٹمانا جیسے جبرئیل کی پیشانی چمک رہی ہے۔ اور سکوت شام میں اُس آفتاب کے غروب ہونے کا سماں جس سے حضرت خلیل اللہ کی آنکھ روشن ہوئی۔ اور پانی کے چشمے پر کاروان کا قیام جیسے جنت کے چشمے سلسبیل پر اہل ایمان جمع ہوں دیکھا ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تجھے آبادی میں رہ کر نخلستان اور سبزہ زار کی طلب ہے اور مجھ جیسے سودائے محبت کو ویرانے کی تلاش ہے۔ اسلئے صحرانوردی کرتا ہوں۔

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی

ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

براہ کرم اپنا چندہ وقت پر ادا کیجئے کہ کاغذ کے حصول میں بڑی مشکلات پیش آ رہی ہیں۔

ایک خط

جناب سردار کریم نواز خان صاحب ایم - اے (پنجاب)

فارسٹ ریسٹ ہاؤس - نور پور محررہ ۲۸ نومبر ۱۹۴۲ء

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

گرامی نامہ "جنت نگاہ" ہوا - آپ نے میرے خطوط کی اشاعت پر اکتفا کر لیا اور مجھے کسی سنجیدہ مضمون پر قلم اٹھانے کا حوصلہ نہیں رہا - ہاں یوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ سودا سستا رہا مگر اس کے باعث ایک مرض کا شکار ہو گیا ہوں اب خطوط میں مختصر نویسی کا ملکہ نہیں رہا اور طویل خط لکھنے کے لئے اطمینان قلب درکار - اسلئے بہت سے احباب کے خطوط کا جواب وقت پر نہ لکھنے کے باعث اکثر شرمندہ ہونا پڑتا ہے - مختصر خطوط لکھنا بذاتہ ایک آرٹ ہے اور بعض مشاہیر کے مختصر خطوط تو تاریخی اہمیت حاصل کر چکے ہیں -

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاصؓ کے جواب میں لکھا ۔

" اپنی رعیت کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو جیسا سلوک امیر المؤمنین کا اپنے ساتھ چاہتے ہو "

مصر کے بعض لوگوں نے مروان بن الحکم کی شکایت لکھ بھیجی ، آپ نے جواب میں یہ آیت لکھ دی : " فان عصوک فقل انی بری مما تعملون " (اگر وہ تیری نافرمانی کریں تو کہدے میں تمہارے عمل سے بری ہوں) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنے لئے گھر بنانے کی اجازت طلب کی - آپ نے جواب دیا - " ایسا گھر بنا لیجئے جو تجھے باد سموم اور مینہ سے چھپا سکے " حضرت علی علیہ السلام کو مصعب بن المنذر نے لکھا کہ قبائل ربیعہ کے بہت سے آدمی قتل ہو چکے ہیں - آپ نے جواب دیا " بقیتہ السیف میں زیادہ فراوانی ہوتی ہے " اشتر نخعی نے ایک شخص کی شکایت کی - آپ نے جواب لکھا " کامل مکمل آدمی اس دنیا میں کہاں ہے " ربیعہ بو علی نے امیر معاویہ بن ابی سفیان کو لکھا " میں بصرہ میں گھر بنانا چاہتا ہوں - آپ مجھے کھجور کے بارہ ہزار تنے دے کر میری امداد کریں " امیر معاویہ نے جواب دیا " تمہارا گھر بصرہ میں ہوگا ، یا بصرہ ، تمہارے گھر میں ہوگا " ابن الاشعث کے خط کی لپشت پر خلیفہ عبد الملک بن مروان نے لکھا " اس شخص کو کیا ہو گیا ہے جو حماقت سے مجھے توڑنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ میں اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑنے کی فکر میں ہوں "

عمر بن عبد العزیزؓ کو حاکم حمص نے لکھا کہ شہر کو ایک قلعہ کی ضرورت ہے - آپ نے جواب دیا " عدل اور سلامتی کا قلعہ اس میں تعمیر کر دے "

سفاح اول خلیفہ عباسی کو اہل انبار نے شکایت کی کہ حکومت کی عمارت میں اُن کی زمین لی گئی ہے اور قیمت ادا نہیں کی گئی

آپ نے جواب لکھا: "یہ عمارت تقویٰ پر قایم نہیں ہوئی"۔ ابو جعفر منصور کو حاکم حمص نے خط لکھا۔ اس میں عبارت غلط تھی۔ اسلئے جواب دیا۔ "اپنی تحریر بدل دو ورنہ میں تجھے بدل دونگا"۔ حاکم مصر نے لکھا کہ اس سال دریائے نیل میں طغیانی نہیں آئی جواب لکھا "اپنی فوج کو پاک کر نیل میں برکت آئے گی" ہارون الرشید نے حاکم خراسان کو لکھا: "اپنے گھاؤ کا علاج کر ورنہ بڑھ جائے گا"۔ شاہ روم نے ہارون الرشید کو لکھا "میں اپنی سلطنت کی ہر صلیب اور ہر بہادر کو لے کر تیرے مقابلہ پر آتا ہوں"۔ خلیفہ نے جواب دیا "عنقریب جان لیگا نتیجہ کیا ہوتا ہے"۔ ایک دوسرے خط میں لکھا "خط کے پیچھے میں آتا ہوں۔ فتح خدا کے ہاتھ میں ہے"۔ ایک اور خط کے جواب میں لکھا "جواب پڑھے گا نہیں آنکھ سے دیکھ لیگا"۔ مامون الرشید نے عمرو بن مسعدہ کی شکایت کے جواب میں لکھا: "اے عمرو اپنی خوشحالی کی عمارت عدل سے قایم رکھ۔ کیونکہ ظلم اسے گرا دیگا"۔ اپنے بھائی ابو عیسیٰ کی شکایت سن کر یہ آیت لکھی: "فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینہم یومئذ" (جب صور پھونک دیا جائے گا تو رشتے ناتے باقی نہیں رہیں گے) کسانوں نے شکایت کی کہ ٹڈی نے کھیت کھا لئے۔ مامون نے لکھا "کسانوں سے زیادہ ٹڈی مہمان نوازی ہم پر واجب ہے آدھا محصول معاف کر دیا جائے"۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے معظم کو لکھا: "سادات چوب مسجد اند نہ فروختنی نہ سوختنی" (یعنی سادات کو ملازمت رکھو کہ یہ مسجد کی لکڑی ہیں جو نہ بیچنے کے کام آتی ہے اور نہ جلانے کے"۔

میرا تبادلہ گورداسپور سے دھرم سالہ ضلع کانگڑہ میں ہو چکا ہے۔ وادی کانگڑہ اپنے صوری و معنوی حسن اور دلفریبی کے باعث ہندوستان میں بے نظیر وادی ہے۔ اسے بالعموم "ہندوستان کا سوئٹزرلینڈ" کہا جاتا ہے۔ اس دلفریب وادی پر اگلے ماہ ایک مطول مضمون لکھوں گا اور وہ غالباً دو چار قسطوں میں شائع ہو سکیگا۔ یہ ہندوستان کا تو نہیں مگر پنجاب کا سب سے بڑا ضلع ہے جس کی آخری سرحد پر تین سلطنتیں ملتی ہیں۔ روس۔ چین اور ہندوستان۔ جہاں پر یہ ضلع ختم ہوتا ہے وہاں سے تبت کی سرزمین شروع ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں چراپونجی (آسام) کے بعد یہاں پر سب سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔ امسال تقریباً ۲۰۰ انچ بارش ہوئی ہے۔ اس سرزمین کا چپہ چپہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اور ہندو علم الاصنام کا سب سے قدیمی مرکز۔ یہاں پر ہی رام چندر جی مہاراج اپنے بن باس کے عہد میں آئے اور اُن کے گورو نے یہاں پر تپسیا کی۔ جس کا مندر ابھی تک موجود ہے۔ بالتفصیل دوسرے خط میں لکھوں گا۔ آج میرا مقام نور پور ایک گاؤں میں ہے جس کی آبادی اب ۱۲۰۰، نفوس پر مشتمل ہے۔ گو پہلے یہ بہت بڑا شہر بیان کیا جاتا ہے۔ نور پور اس کا نام نور جہاں بیگم کے ورود پر رکھا گیا۔ قدرتی مناظر کے اعتبار سے یہ ایک بہت ہی دلپذیر جگہ ہے۔ شہنشاہ اکبر کو اسی گاؤں میں ہمایوں کی وفات کی خبر ملی تھی اور اس نے کلانور میں جا کر تخت نشینی کی۔ جہانگیر کو یہ مقام اس قدر پسند آیا کہ اس نے اسے اپنا سرمائی دار السلطنت بنانا چاہا۔ مگر راجہ صاحب نور پور کی مقامی اہمیت میں دار السلطنت بن جانے سے بہت فرق آنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے راجہ صاحب نے

بہت سے کوڑھ کے مریض سڑک پر جمع کر رکھے۔ جب جہانگیر گذرا تو اوس نے کوڑھ کے اس قدر مریض دیکھکر تعجب کیا راجہ صاحب نے کہا کہ اس سرزمین کے پانی میں یہ نقص ہے کہ کوڑھ پیدا ہو جاتا ہے اس واقعہ سے جہانگیر کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ یہاں پر ایک بہت پرانا قلعہ اور مندر ہے۔ اس قلعہ پر محمود غزنوی نے حملہ کیا تھا۔ اب صرف مندر کا چبوترہ محفوظ ہے جس کی دیواروں پر بہت سے بت بنے ہوئے ہیں۔ یہاں پر کرشن جی کی وہ مورتی رکھی ہوئی ہے جو ہندوستان بھر میں لاثانی سمجھی گئی ہے یہ وہ مورتی ہے جس کے سامنے میواڑ کی رانی اور ہندی کی مشہور و معروف شاعرہ راج رانی میرا پوجا کیا کرتی تھی۔ مغلیہ شہنشاہوں نے کئی بار اس گاؤں پر حملہ کیا۔ زین خاں کوکا اکبر کا رضاعی بھائی بھی کچھ عرصہ اس علاقہ کا گورنر رہا۔ کسی زمانہ میں یہاں پر قالین بافی اور شال بافی کا بہترین کام ہوتا تھا۔ قالین بافی تو اب ختم ہو چکی ہے۔ مگر شال بافی کا کام ابتک ہوتا ہے۔ کل ہی میں نے یہاں سے دیکھنے کے لئے ایک شال منگوائی جس کا وزن ساڑھے چھٹانک تھا اور ایک عمدہ کمبل سے زیادہ گرم تھی مگر آج کل ان کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اس شال کی قیمت دکاندار نے (۱۱۰) بتلائی جنگ سے پہلے اس کی قیمت (۶۰) تھی۔ ان شالوں کی زیادہ تر فروخت بنگال میں ہوتی ہے۔ اور کلکتہ کے تاجر بالعموم خرید کر کے لیجاتے ہیں۔ یہ گاؤں تبت کے مال کی برآمد کا راستہ ہے۔ اور موسم میں سلاجیت۔ ان کے گدے جو ایک قسم کا بہت گرم کمبل ہے، ہینگ۔ زیرہ۔ زمرد۔ یاقوت۔ منڈی میں بکثرت آتے ہیں۔ مگر اب جنگ کی وجہ سے اور کچھ لاہول کے دیوتاؤں کے جھگڑے کے باعث یہ تجارت بند ہو گئی ہے۔

میں نے بالالتزام یہاں کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا۔ امید ہے کہ اگلے ماہ تک مغلیہ عہد کی پرانی فارسی کی تاریخوں کے مطالعہ کے بعد اس علاقہ کی تاریخی اہمیت پر مبسوط مضمون بھیج سکوں گا۔

غزل

جناب سید سلطان محی الدین صاحب سیفؔ بی-اے

اطاعت تیری حاصل زندگی ہے — میں بندہ ہوں شیوہ میرا بندگی ہے
میں فانی ہوں تیری تمنا بھی فانی — عمل ہی کو دنیا میں پائندگی ہے
کھڑا ہوں سر حشر سر کو جھکائے — گناہوں کی کثرت سے شرمندگی ہے
جسے دیکھو اپنی غرض کا ہے بندہ — یہی آج کل مقصد زندگی ہے
منور ہے آنکھیں منور ہے دل بھی — ترے نور کی یہ درخشندگی ہے
اداؤں سے ظاہر شرارت ہے لیکن — تبسم میں پنہاں شکر خندگی ہے
زباں میں ہے اے سیفؔ تاثیر جن کی — انھیں کے تکلم کو پائندگی ہے

کون؟

عکاس

موسم سرما کی ایک سرد ترین رات تھی جب کہ ہم سب 'کاخ مرجان' کے شاندار اور حسین کمرے میں مخملیں صوفوں پر بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ شاہراہ کی روشنیاں بجھ چکی تھیں، لیکن وسیع دریچوں سے شب زندہ دار چاند کی نورانی کرنیں کمرے کے نفیس اور گداز قالینوں پر اس طرح پھیل رہی تھیں۔ گویا کسی شفاف جھیل پر کوئی تیز روشنی جھلملا رہی ہو۔

دور باغ میں درخت غول بیابانی کی طرح ناچتے ہوئے دکھائی دیرہے تھے۔ راستہ پر کبھی کبھی کسی راہرو کے قدموں کی ہلکی آواز اور دور کتوں کے بھونکنے کی صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ رات اس قدر سرد تھی کہ باوجود عود وعنبر کے بخور کے رگوں میں خون جمتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن موضوع گفتگو اس قدر دلچسپ تھا کہ سردی کا مطلق احساس نہ تھا۔ ہر شخص نہایت انہماک سے 'احمد' کی آپ بیتی سن رہا تھا کہ کس طرح اوس کو ایک روح سے دو چار ہونا پڑا، اور پھر کیوں کر اوس سے نجات حاصل ہوئی وغیرہ وغیرہ، اتنے میں حبشی ملازم نے نہایت ادب سے کشتی میں ایک کارڈ رکھکر پیش کیا۔ سبھوں کی نظریں کشتی کی جانب اوٹھیں اور متجسس تھیں کہ اتنی سرد رات میں آنیوالا آخر کون ہوگا۔ حسن سعید نے نہایت تمکنت کے ساتھ دریافت کیا۔

کس کا کارڈ ہے جس پر 'حارث' لکھا ہوا ہے، ملازم نے ادب سے جواب دیا کہ ایک نوجوان ہے۔ آقا کے اشارہ پر ایک لمحہ میں ایک سرو قد نوجوان نگاہوں کے سامنے تھا کپڑے اگرچہ کہ گرد آلود اور بوسیدہ تھے لیکن سب کی آنکھیں اوس کی رعنائی جمال کے طرف بے اختیار اوٹھ گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ آنیوالا دور دراز کا فاصلہ طے کرکے آرہا ہے چہرہ سے تھکن کے آثار ظاہر تھے جس نے کمرہ میں داخل ہوتے ہی نرم اور سنجیدہ الفاظ میں کہا۔

معاف کیجئے کہ میری آمد سے آپ کے عیش میں خلل واقع ہوا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ بڑی دیر سے اس وادی میں سرگرداں پھر رہا ہوں، کہیں جائے پناہ نہ ملی جہاں رات بسر کروں۔ دور سے آپکے ایوان کی روشنی نے میری راہنمائی کی اگر اجازت عطا ہو رات کے چند گھنٹے گذار کر صبح اپنی راہ لوں۔ وہ یہ کہکر ایک صوفہ پر بیٹھ گیا۔

حسن سعد (والی مرجان) نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ نہایت شوق سے آپ فروکش ہوں ممکنہ آسائش کے سامان آپ کے لئے بہم پہنچ سکتے ہیں۔

حارث۔ (سر خم کرکے) مسافر نوازی۔

حسن سعید کے اشارہ پر حبشی ملازم نے کشتی میں خشک و تر میوے اور قہوہ مہمان کے سامنے لاکر پیش کیا جس نے معذرت چاہی کہ وہ اس وقت محض آرام کا خواہاں ہے۔ کسی اور شئی کی حاجت نہیں۔ یہ سن کر ملازم مہمان کے لئے کمرہ تیار کرنے چلا گیا۔

حسن سعید (کسی قدر تامل کے بعد) اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو جناب بتا سکتے ہیں کہ اتنی رات گئے ان وادیوں میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ حارث نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔ اف ایک مسافر کا مقصد ہی کیا ہوتا ہے۔ یہی بادیہ پیمائی اور آوارہ گردی۔

حسن سعید۔ مگر اس کا بھی تو کوئی مدعا ہونا چاہئیے۔ ورنہ یوں کوئی گھوما نہیں کرتا۔

حارث۔ افسوس کس طرح کہوں کہ آج دو سال ہوتے ہیں بغیر کسی مقصد اور مدعا کے دشت نوردی کا سلسلہ جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے۔ ہم سب نے اس کی لاپروا گفتگو سے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو گھورا کہ ضرور اس کی تہہ میں کوئی "راز" ہے۔ یک آواز سبھوں نے کہا۔ ممکن ہے ہماری ہمدردیاں اس بادیہ پیمائی میں آپ کے کچھ کام آ سکیں۔

حارث نے ہمارے چہروں کو دیکھتے ہوئے کہا "میرا واقعہ حقیقت میں ایک راز ہے جو دوسروں کے لئے بے لطف ہے جس کو ظاہر کرنے کے بعد یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کی ہمدردیاں میرے درد کا علاج نہیں۔ چونکہ آپ نے اتنی رات گئے مجھ بیکس کے حال پر عنایتیں کی ہیں اس لئے میں بات کو رد نہیں کر سکتا۔ اپنی داستان حیات اس شرط کے ساتھ سنا سکتا ہوں کہ کسی اور سے اس کا ذکر نہ ہو کیونکہ اس میں کسی معصوم کا بھی ذکر خیر ہے جو آج تک میرے لئے ایک معمہ ہے ناقابل حل سبھوں نے وعدہ کیا۔

نوجوان نے ایک ہلکی آہ کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

میرے کارڈ سے میرا نام ظاہر ہے۔ میں بحرین کے موتی کے سب سے بڑے تاجر کا اکلوتا لڑکا ہوں بچپن تو عیش و آرام کی گود میں گذرا جب کچھ شعور آیا تو تعلیمی سلسلہ جاری ہوا۔ دنیا کی ہر آسائش میرے قدموں میں تھی کچھ عرصہ بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ ازہر' بھجوا دیا گیا۔ والدین کی خواہش تھی کہ میں دنیا کے علوم و فنون سے واقف ہو جاؤں۔ اور میں خود بھی اپنی تعلیم میں منہمک رہا۔ ہر سال تعلیمی میقات کے ختم پر والدین کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا کرتا تھا چنانچہ آج سے دو سال پہلے اپنے وطن آیا ہوا کالج کی چھٹیاں ختم اور نیا سشن شروع ہونے والا تھا کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں۔ ایک خاتون جس کے چہرہ پر ہلکا سا نقاب پڑا ہوا ہے جس سے حسن کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں جس طرف نگہہ اوٹھتی ہے یہ معلوم ہوتا تھا کہ بجلی کہیں دور افق پر چمک رہی ہے اور رعب حسن سے گردنیں خود بخود جھک جاتی تھیں۔ سہیلیوں کے جھرمٹ اور خواجہ سراؤں کی حفاظت میں شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ ہمارے ایوان تجارت میں داخل ہوئی۔ ملازمین نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔

جس نے مختلف قسم کے موتی لانے کا حکم دیا آن کی آن میں کشتیوں میں موتی لگا کر پیش کر دئے گئے دو ایک گھنٹوں کی دیکھ بھال کے بعد چند بڑے بڑے موتی لے کر چلی گئی اور میں بیٹھا ہوا یہ تماشا دیکھتا رہا کہ یہ مجسمہ شباب و شعر حسن و موسیقی کون ہے جس نے میرے اطمینان کی دنیا میں ایک حشر میرے قلب میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے۔ ہر لحظہ میری بے چینی میں اضافہ تھا۔ سکرٹری سے اتنا معلوم ہوا کہ وہ والئی عمان کی لڑکی ہے۔ جو ہر سال سیاحت کیلئے نکلتی ہے اور واپسی پر ایک روز یہاں ٹھیر کر موتی لیجاتی ہے۔ اوس کا محبوب مشغلہ بڑے بڑے موتی فراہم کرنا ہے۔ یہ اطلاع میرے لئے اور بھی وحشت خیز تھی کہ محض ایک دن کیلئے وہ آتی ہے۔ اب تو دیدۂ دیدار طلب کی وہ تمنائیں جو دوسرے دن پر منحصر تھیں پامال ہوگئیں۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ کاشانۂ ناز پر سجدۂ نیاز پیش کر سکوں۔

رات انہیں تفکرات میں دن کا حصہ انہیں بیقراریوں میں گذرا مگر آپ اس کو کشش شوق کہئے یا میری قسمت کی رسائی کہ وہ اوسی شان رعنائی سے پھر آئی غالباً اس ارادہ کے ساتھ کہ آشیانہ جب نذر خاکستر ہو رہا ہے تو پورا ہی کیوں نہ جل جائے۔ اوس کی غلط انداز نظر نے میرے صبر و قرار کا پیمانہ چھلکا دیا اور ہوش و حواس پر بجلیاں گرائیں۔ ایک ہفتہ بعد وہ واپس چلی گئی اور میری صحت دن بدن بگڑتی گئی۔ سوائے خاموش پڑا رہنے کے کوئی کام نہ تھا۔ والدین کو فکر پیدا ہوگئی ڈاکٹروں، طبیبوں نے عارضہ قلب کی تشخیص کی۔ دو ہفتے اسی عالم میں گذرے تھے کہ ایک روز ڈاک سے یہ اطلاع ملی چند ہفتوں کیلئے وادی عقیق جا رہی ہوں۔ اگر آپ وہاں مل سکیں تو زہے نصیب، یہ خبر نہ تھی بلکہ مژدہ جان بخش تھا۔ فوراً تبدیل آب ہوا کی اجازت لے کر وہاں پہنچ گیا۔ میرے آنے کے دوسرے روز وہ اسی شان دلربائی سے جلوہ افروز تھی۔

یہاں وہ کچھ دیر ٹھیرا اور کہنے لگا۔ رات زیادہ جا چکی ہے میری بے کیف داستان اتنی دلچسپ نہیں ہے اسلئے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ حضرات آرام فرمائیں اور بقیہ حصہ فردائے شب۔

حسن سعید۔ ہمارے آرام کا خیال نہ کیجئے بلکہ آپ نے باوجود تھکے ماندے ہونے کے ہماری درخواست کو پذیرائی دی ہے اس کا شکریہ، مزید اصرار کرنا ایک طرح کا صریح ظلم ہوگا۔

حارث (ایک آہ لے کر) اب تو میرے لئے راتوں کی تاریکی اور دن کی روشنی میں افسانۂ ماضی کو دہرانے ہی میں ایک طرح کا سکون نظر آتا ہے اور یہ شاید اس وقت تک جاری رہے گا تاوقتیکہ فرشتۂ اجل آخری پیغام نہ لائے۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

مختصر یہ کہ دو ہفتے میرے لئے درحقیقت فردوس بریں سے کم نہ تھے۔ ہمارے اوقات مناظر قدرت کے دیکھنے اور اپنی اپنی محبت کو استوار کرنے میں صرف ہونے لگے۔

دنیا میں کیا ہو رہا ہے مستقبل میں کیا ہوگا۔ کوئی خبر نہ تھی جبکہ حال کے رنگین لمحات سے فرصت نہ ملے تو مستقبل کی تخیوں

کون غور کرے۔ حسب معمول وہ اُس دن بھی آئی لیکن کچھ گھبرائی ہوئی اور پریشان۔ میرے اصرار پر اتنا کہا کہ ہماری تنہا ملاقاتوں کا
راز افشا ہو چکا ہے۔ میں نے پوچھا کہ پھر کوئی تدبیر۔ اوداس اور مغموم آواز میں کہنے لگی۔ ہاں "تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ"
اوس شام کی اوداسی اور بے کیفی نہ پوچھئے۔ دلوں سے شگفتگی جا چکی تھی۔ مایوسی تمام فضا پر چھائی ہوئی تھی۔ باوجود
میرے شیریں باتوں کے اوس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی پیدا نہیں ہوئی۔ تاریکی بڑھ رہی تھی وہ مغموم قدم اٹھاتی
ہوئی واپس جانے لگی۔ بار بار پلٹ کر دیکھتی جاتی تھی۔ جب تک کہ نظروں نے کام کیا۔ پھر وہ تاریکی میں نگاہوں سے اوجھل
ہوگئی اور میں ایک زخمی فاختہ کی طرح جس کا بازو شکستہ ہو جو اپنے آشیانہ کی طرف آتا ہے ہوٹل واپس ہوا۔ رات سولی پر
دن کانٹوں پر۔ اسی معمہ کے حل کرنے میں گذرا۔ مگر کسی نتیجہ پر پہنچ نہ سکا۔

دوسرے روز مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ نہروں کی روانی۔ فضا کی لطافت وہی تھی مگر اوس کے
نہ ہونے سے یہ مقام وحشت خیز تھا۔ تاریکی پھیلنے لگی۔ پتہ کی ہر آواز پر اوس کے پاؤں کی آہٹ کا گمان ہونے لگا۔ مگر وہ نہ
آئی اور میرے قلب میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اپنی بدنصیبی پر گریہ کناں بامید فردا تاریکی میں ٹھوکریں کھاتا واپس ہوا۔

آپ نہیں جان سکتے کہ ایک مایوس اور ناکام تمنا کی رات کس طرح گذرتی ہے اور وہ زندگی کو کس قدر بے حقیقت سمجھتا
ہے لیکن ان سب کا مداوا ایک آرزو۔ ایک تمنا۔ ایک امید ہے جو آگے بڑھاتی اور ڈھارس بندھاتی ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر
یہ وسیع کائنات اور اوس کی رنگینیاں کبھی کے ختم ہو جائیں۔

دوسرے دن دیدہ دیدار طلب کی بے چینیاں۔ آرزو اور تمناؤں کا ایک امنڈتا ہوا سیلاب اپنے پہلو میں لئے ہوئے
پہنچا۔ مگر! آہ!! آرزوئیں اگر پورا ہونے کے لئے ہوں تو وہ آرزو ہی کب رہی۔ ایک مایوس قسمت تو یاس ہی میں
آس دیکھتا ہے۔ لیکن اس کو تو نہ آنا تھا نہ آئی۔

اب تو میری زندگی کی شاداب کھیتی اجڑ چکی تھی۔ کامرانی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ہجوم آلام اور افکارات نے
دماغ کو ماؤف کر دیا۔ یاد نہیں کہ کس طرح اپنے ٹھکانہ پر واپس ہوا۔ فراق کی تاریک رات کاٹے کٹی نظر نہ آئی۔ صبح کے توقع پر
رات آنکھوں میں کاٹنی پڑی۔ صبح ہوئی مگر میرے لئے تو صبح قیامت سے کم نہ تھی۔ ذرا سی جستجو میں پتہ چل گیا کہ رات کی تاریکی میں
یہ قافلہ جا چکا ہے اور میں سونچتا رہ گیا کہ یا اللہ یہ کوئی خواب تھا؟ یا طلسمی کارخانہ! جو آن کی آن میں بنا اور بگڑا۔

عقل نے کہ پاسبان دل ہے رائے دی کہ اب تو عمان ہی میں کچھ آرام و سکون نصیب ہوگا۔ اور یوسف گم گشتہ کا
وہیں پتہ چل سکیگا۔ سفر کی مشقت۔ راستوں کی صعوبت۔ عزم راسخ کے آگے ہیچ ہوتی ہے افتاں و خیزاں دو ہفتوں میں
میں جب کہ رات بھیانک تھی عمان کی ایک افتادہ سرا میں جو سب سے پہلے دکھائی دی خستہ ماندہ بستر پر پڑا ہوا کروٹیں بدلتا رہا۔

جذبات کا ایک طوفان تھا جس میں دل ایک بے لنگر و بادبان کی طرح تھپیڑے کھاتا ہوا ساحل مقصود کا جویا تھا۔

خداوندا کیسی تھی وہ قیامت خیز رات جس کے نقاب میں صبح محشر پنہاں تھی۔ خدا دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھائے۔ ڈرتا کانپتا رئیس عمان کے آستانہ پر سجدۂ عبودیت کے شوق میں پہنچا ـــــ مگر ـــــ وہ یہاں پہنچکر انتہائی مغموم دکھائی دینے لگا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے جنھیں وہ آستین سے بار بار پونچھ رہا تھا۔ اور یہاں ہمارے سینوں میں قلب بیتاب تھے کہ اب وہ کیا الم انگیز واقعہ کہنے والا ہے۔

حارث نے التجائی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھکر کہنے لگا۔ وہی دیکھا جس کو اپنی حیات رنگین کا المناک ترین حادثہ کہونگا۔ یعنی عمان کی پوری آبادی سوگوارانہ ایک جگہ سمٹی ہوئی ہے ابھی سنبھل بھی نہ سکا تھا کہ کلمہ پاک کی ورد انگیز صداؤں میں ایک جنازہ ہاتھوں ہاتھ بڑھ رہا ہے۔ کوئی آنکھ نہ تھی جس میں آنسو نہ ہوں۔ کوئی لب نہ تھے جس پر آہ نہ ہو۔ بازو سے کسی نے کہا۔ وائے صد ماتم کہ عمان کا وارث مٹ چکا۔ یہ حسن۔ یہ سن۔ یہ دن۔ تو ابھی مرنے کے نہ تھے۔ وہ رورہا تھا اور یہاں میری نبضیں چھوٹ گئیں۔ دل کی دھڑکن اور تیز ہوگئی۔ قدم ڈگمگانے لگے۔ اوس کی رعنائی اور شباب کی بہار کو موت کے خزاں آلود خنجر سے یوں زخمی ہوتا دیکھکر اتنا یاد ہے کہ جب میری آنکھ کھلی ہے تو سرہانے میرا سکرٹری بیٹھا ہوا ہے اور میز پر دواؤں کی شیشیاں رکھی ہوئی ہیں۔ پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے پکارا "پانی" سکرٹری بے اختیار اوٹھ کھڑا ہوا۔ پروردگار تیرا شکر ہے کہ آج آپ نے آنکھ کھولی ورنہ تین ہفتوں سے موت اور زیست کی کشمکش تھی۔ نہایت محبت سے پانی دیا۔ جب خشک حلق کسی قدر تر ہوا تو میں نے پوچھا کہ آپ کیسے آئے؟ میں کہاں ہوں؟ والدین کیسے ہیں؟ کہنے لگے جب وہ یہاں پہنچا ہے تو میں ایک دواخانہ میں کسمپرسانہ حالت میں بیہوش پایا گیا۔ اور میں نے بہترین طبی امداد طلب کی اور تیمارداری میں مصروف ہوگیا۔

ڈاکٹروں کی دیکھ بھال اور سکرٹری کی ہمدردیوں نے مجھے اس قابل کردیا تھا کہ میں ورانڈے میں چہلقدمی کرسکتا تھا مگر دل پر ہمیشہ ایک سنگین پتھر رکھا ہوا معلوم دیتا تھا۔ دماغ ابھی اس قابل نہ تھا کہ کچھ سوچ سکوں۔ دو روز گذر چکے تھے اور طبیعت مائل بہ سکون تھی۔ ابتدائے شب کی چاندنی ہے اور میں ورانڈے میں بیٹھے ہوئے دور درختوں کی پرچھائیوں کی جانب دیکھ رہا ہوں، کیا دیکھا کہ انہیں پرچھائیوں سے ایک سفید پوش میری جانب آرہا ہے میں یہ سمجھکر کہ کوئی راہ رو ہوگا۔ توجہ نہیں کی لیکن وہ سیدھا میرے سامنے آکر اشارہ کیا اور میں ایک مقناطیسی کشش کے ساتھ بے تابانہ اوس کے پیچھے ہولیا وہ آبادی سے دور ایک پختہ چاردیواری میں داخل ہوا جہاں قبرستان تھا ایک نئی قبر کی جانب انگلی سے اشارہ کیا میرے دل و دماغ پر جو بوجھ سا تھا وہ جاتا رہا اور اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی گویا یہ ایک تائید غیبی منجانب اللہ، دل نے

گواہی دی کہ میرے ارمانوں کا یہی مرقد ہے۔بیتابانہ قبر پر گر پڑا۔ اور گھنٹوں روتا رہا۔ اسی حالت میں پڑا ہوا تھا کہ باد کی صدا نے مجھے بیدار کیا اور سب سے پہلے اپنے راہبر کو ڈھونڈا۔ مگر پتہ نہ چلا۔ حیران تھا کہ کیوں ابتدا سے میری زندگی میں طلسمی واقعات مقدر کئے گئے ہیں۔ آخر اس کارخانہ کا چلانے والا کون ہے۔ اتنے میں میرے پاؤں کے پاس ایک سفید سا کاغذ گرا جھک کر اٹھایا تو لکھا تھا "ملنے کی تمنا ہے تو آج سے ایک ہفتہ بعد وادی عقیق میں شب کے بارہ بجے" گویا یہ ایک بشارت تھی "خرد خار دشت پھر تلوا میرا کھجلائے ہے" چل کھڑا ہوا۔ ایک ہفتہ کی راہ نوردی اور آبلہ پائی سے خستہ اور زنگا ساحل امید کے سہارے وقت کاٹ رہا تھا کہ درختوں کے جھنڈ سے خراماں خراماں ایک پیکر نورانی میری طرف بڑھ رہا ہے دل سینے کی بلیوں اچھل رہا تھا جسم ہے کہ کانپ رہا ہے۔ وہی نقاب۔ وہی انداز۔ وہی چال جس کو سب سے پہلی مرتبہ بحرین میں دیکھا تھا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھکر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ایک نغمہ شیریں کے ساتھ جس سے تمام فضا رقص کرنے لگی کہا "مرنے کے بعد بھی چین نصیب نہ ہوا۔ روح ابتک آوارہ ہے۔ اس مادی جسم میں دونوں کی یکجائی ممکن نہیں۔ آج سے دس روز بعد "کاخ مرجان" سے ایک میل پر جو جھیل ہے وہاں یہ عقدہ حل ہو سکیگا۔ میں جواب میں کہنا چاہتا تھا کہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ یکہ و تنہا اپنی بدنصیبی پر ماتم کر رہا تھا۔

وہ یہاں پہنچکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا کہ یہ گردش پرکار دیکھئے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھلوائے۔ وہ ٹھہر گیا اور ہمارے جانب دیکھکر کہنے لگا۔ آج کا آنا اوسی تقریب میں ہے۔ کل شب یہ طلسم سربستہ کھلیگا۔ وہ خاموش ہو گیا چونکہ رات زیادہ ہو چکی تھی سبھوں نے اوس کے دردناک واقعات پر دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ 'صباح کلا بالخیر' کہکر ہم سب اپنے اپنے کمروں کی جانب روانہ ہوئے۔ ملازم حارث کو کمرہ دکھانے کیلئے ساتھ ہو گیا۔

آفتاب کافی بلند ہو چکا تھا۔ ایک ایک کر کے ہم سب ڈائننگ ہال میں ناشتہ کیلئے جمع ہوئے اور شب کی داستان پر غور کر رہے تھے کہ حارث آئے تو ایک ساتھ ناشتہ کریں مگر وہ نہ آیا اور ہم نے بھی اس خیال سے کہ تھکا ماندہ ہے بیدار کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ دن کا پروگرام بنانے میں مشغول ہو گئے۔ حارث بڑی دیر تک بیدار نہیں ہوا۔ تو ملازم کو کہا گیا کہ وہ کمرے میں دیکھ آئے اگر حارث سو رہا ہے تو بیدار نہ کرے۔ ملازم الٹے پیروں واپس آیا اور کہنے لگا۔ آقا! دروازہ جوں کا توں کھلا ہوا ہے چراغ جل رہا ہے۔ حارث کا پتہ نہیں۔ بستر پہ شکن کا نشان تک نہیں ہے۔ ہم مبہوت ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ تجویز یہ قرار پائی کہ نیز رفتار سوار وادی کا چپہ چپہ چھان ڈالیں اور ہم رات کے واقعات پر بحث کرنے لگے اتنے میں دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا اور میز پر بھی یہی موضوع بحث رہا جب ڈائننگ ہال سے باہر نکلے ہیں تو ملازم نے یہ اطلاع دی کہ میلوں کسی انسان کا پتہ نہ چلا۔ ہمارے حیرانیوں کی انتہا نہ رہی۔ بحث و مباحثہ کا نتیجہ یہ نکلا کسی نے کہا "دیوانہ تھا" بیشتر کا خیال تھا کہ درحقیقت وہ بھی ایک "روح" تھی۔

"ہندوستانی بیوی کی ڈائری کا ورق"

میرے آقا میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ آپکے فرمانوں پر چلوں آپ کی خواہشوں پر ناچوں اور آپکے حکم کو سر آنکھوں پر رکھ لوں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے زندگی میں آپ کو کوئی راحت نہیں پہنچائی اور آپکے دل کو خوش نہیں کیا اور آپکے سامنے اپنی زندگی ایک بلائے بے درماں کی مانند بسر کر رہی ہوں۔ مجھ میں بہت سی کمزوریاں ہیں جس کے باعث میں آپکا پورا پورا ساتھ نہیں دیسکتی۔ میری یہ خواہش کبھی نہیں رہتی کہ میں آپکے جذبات کا پورا احترام نہ کروں یا آپ جس رنگ میں مجھ کو رنگنا چاہتے ہیں نہ رنگیں لیکن کیا کروں میں اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں پاتی۔

آپ نے بی۔ اے پاس کیا ہے۔ جدید تہذیب کے حامی ہیں۔ مغربی معاشرت کے دلدادہ ہیں متمدن ممالک کے مقلد ہیں۔ فیشن پرستی کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ آپ کی خواہش ہے کہ میں آپکے ساتھ سیر کو جاؤں پردہ کو چاک کردوں۔ دعوتوں میں شرکت کروں ٹینس کھیلوں سینما اور تھیٹروں میں جاؤں۔ دوستوں سے بے تکلف بات چیت کروں کلب میں جا کر حسن کی ضیا باریوں سے اغیار کی آنکھیں خیرہ کروں گویا میں آپ کی انگلی پر ناچوں۔ شاید آپکے دوستوں کی بیویاں بھی اسی طرح کی ہیں آپ بھی مجھے ویسا ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ خدا نے دولت دی ہے اس کی تو کمی نہیں اتنی بڑی زمینداری ہے۔ پھر پیسے کا منہ کیا دیکھنا لیکن آپ نے مجھ کو دنیا کی تمام روحانی لذتوں سے محروم کر دیا۔ میں کبھی اس کا شکوہ زبان پر نہیں لائی۔ کیونکہ میری گود میں ایک ہنستا کھیلتا لال تھا۔ لیکن خدا نے اس کو اٹھا لیا۔ لیکن میں نے ہمیشہ آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کی، اور مجھ کو فخر ہے کہ میری زندگی کا یہی مقصد ہے میں مر کر بھی زندہ رہوں گی اور میری بے لوث دعا ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے گی۔ مجھے انگریزی نہیں آتی میں ایک قدیم ہندوستانی گھر میں پرورش پائی ہوئی لڑکی ہوں جس کے باپ پرانے خیال کے تھے۔ اسی لئے تہذیب نو کا خیر مقدم نہیں کر سکی اردو کی تعلیم میں نے گھر ہی میں حاصل کی ہے۔ یہی میری تعلیم ہے مجھ میں جیسی طاقت ہے اس کے ذریعہ سے آپ کو خوش کرنے کی سعی کی ہے۔ پردہ توڑ دیا۔ دوستوں سے ملتی ہوں، چاء پلاتی ہوں، اون کے ساتھ سیر کو جاتی ہوں۔ لیکن میں انگریزی میں بات چیت نہیں کر سکتی۔ اسی لئے کبھی کبھی آپ کو میری وجہ سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے مجھ میں جو کمزوریاں ہیں انہیں دور کرنے کے لئے جب کبھی آپ سے کہتی ہوں آپ ناراض ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے تم سے شادی کر کے اپنی زندگی پھیکی بنائی تم نے باپ کے یہاں انگریزی کیوں نہ پڑھی مگر اس وقت مجھے بہت برا معلوم ہوتا ہے لیکن میں آپ کی ہوئی اور آپ کو مجھ پر پورا اختیار ہے۔ آپ مجھ کو انگریزی کیوں نہیں پڑھا دیتے۔ شاید انگریزی پڑھکر میں آپ کی خدمت کرسکوں۔

آپ جانتے ہی تھے کہ میں صرف اُردو سے واقف تھی پھر شادی کیوں کی؟ جس وقت آپ کو میں نے ریل کے سفر میں دیکھا تھا اور میرے والد صاحب آپ سے پلیٹ فارم پر گفتگو کر رہے تھے اس وقت میں جان گئی تھی کہ آپ ہی میری قسمت کے مالک بنیں گے۔ ایسا فیصلہ میں نے کیوں کیا۔ شاید اُس میں محبت کی کارفرمائی اور ازدواجی کلفت کا راز پوشیدہ ہوگا۔ جب میری شادی نہیں ہوئی تھی تو کتنی بار شکار کے بہانے آپ میرے گاؤں میں آئے تھے اور چپکے چپکے مجھ سے مل کر اور میری روح کو بے چین کر کے چلے گئے تھے اس وقت میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب تصور کرتی تھی لیکن ——! پہلے بھی میں آپ سے محبت کرتی تھی اور اب بھی محبت کرتی ہوں پہلے آپ میرے محبوب تھے اور اب شوہر ہیں، پہلے میں آپ کو تڑپا کر ہنستی تھی اور اب خود تڑپتی ہوں۔ پہلے میری نسائیت ازدواجی مصیبت سے محروم تھی اور اب تمام رنج و غم سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلے میں صرف عاشق تھی اور اب اپنے فرض کا احساس ہو گیا ہے پہلے مجھ کو آپ کی محبت پر گھمنڈ تھا لیکن اب میرا مغرور دل روتا ہے اور آپ شادکام ہوتے ہیں۔

افسوس اس وقت آپنے انجام پر کیوں نہیں غور کیا تھا۔ بے وجہ محبت کی پینگ بڑھائی تھی۔ ایک گاؤں کی پرورش پائی ہوئی عورت اور قدرتی مناظر کے درمیان کھیلی ہوئی لڑکی کس طرح ٹینس کھیل سکتی ہے۔ آپ کو اس پر غور کرنے کے بعد قطعی فیصلہ کرنا تھا۔ آپکے اس وقت بھی آنکھیں تھیں اور اب بھی آنکھیں ہیں آپنے اچھی طرح میرے دل کو کیوں نہ ٹٹول لیا تھا۔ آپنے یہ کیونکر یقین کر لیا تھا کہ شادی کے بعد بھی میں آپ کے حسب منشاء آپکا ساتھ دوں گی۔ میں ایک بیوقوف دہقانی لڑکی ہوں۔ کچھ نہ کچھ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ شہر کا گدھا گھوڑا بن سکتا ہے۔ لیکن دیہات کا گدھا خچر بھی نہیں بن سکتا۔ آپ صرف حسن پر فریفتہ کیوں ہو گئے؟ میری اندرونی کمزوری پر کیوں نہیں غور کیا۔ مجھ سے اچھی لڑکی آپ کو مل سکتی تھی۔ لیکن آپ کو تو میری زندگی تباہ کرنی تھی۔ اُف! ——!! یہ آپ ہی کی غلطی ہے۔ میری نہیں۔ پھر بھی میرے آقا میں آپکے ساتھ دے رہی ہوں۔ لیکن پھر بھی آپ مجھ سے الگ تھلگ رہتے ہیں: ناراض رہتے ہیں۔ یہ میری انتہائی بدنصیبی ہے اب میرے دل میں موت کے سوا اور کسی چیز کی خواہش نہیں ہے۔ میرے خدا جب آپ ہی خوش نہیں تو میری زندگی بیکار ہے اور میری دنیا تاریک ہے۔ میری خوبصورتی دھوکہ ہے۔

جس نے آپ کی زندگی کی مسرتوں کو چھین لیا ہے اور آپ کی دنیا اجاڑ دی ہے اسی خیال کے تحت انگریزی کی کوشش کی لیکن مجھے آئی نہیں آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ باپ کے ہاں چلی جاؤ۔ میں باپکے ہاں جا کر کیا کروں گی۔ میرا گھر تو یہی ہے جس گھر میں زندہ آئی ہوں اس سے مر کر نکلنا شرافت کی دلیل ہے میرا ہندوستانی مذہب آپ کا ساتھ چھوڑ دینے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ آپ پہلے کبھی کبھی مجھ سے بول لیا کرتے تھے۔ لیکن اب تو آپ نے کچھ دنوں سے بولنا بند کر دیا ہے۔ میری صحت گرتی جا رہی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مجھے آپ کی زندگی بخش محبت حاصل نہیں ہے۔

آپ کی اُداسی اور ناراضی ہی میرے دل کو کھوکھلا کرتی جا رہی ہے۔ ساری دنیا جب آرام سے سویا کرتی ہے اوس وقت میں

آپ کی یاد میں لیٹی لیٹی تاروں کی محفل میں گم ہوجاتی ہوں اور جب ہوش آتا ہے تو مایوسی کی سیاہ گھٹا کے ساتھ رہا کرتی ہوں۔

لیکن —— لیکن آپ تو رات بھر نہیں آتے۔ کہاں رہتے ہیں۔ کیا مجھ سے اچھی لڑکی آپ کو مل گئی ہے ؟ یہ پوچھنے کی مجاز نہیں صرف آنسوؤں پر اختیار ہے۔ اب میں جلدی دنیا سے چلی جاؤں گی۔ آپکے راستہ کا کانٹا دور ہوجائے گا۔ اس وقت آپ آزادی کی فضا میں سانس لیں گے آہ! آپ کے دل کو کتنی خوشی ہوگی۔ آپ اُس دن مسرور ہوں گے۔ جب میرا جسم مٹی کے ڈھیر میں دب جائیگا۔ وہی جسم جو شادی کے قبل آپ کو بہت عزیز تھا اور اس کی آرائش کیلئے آپ شہر سے طرح طرح کے تحفے لاتے تھے اُس کو دیکھنے کے لئے شکار کے بہانے بارہا آتے تھے اور اُسے دیکھکر آپ کا دل کھلکھلا کر ہنس پڑتا تھا۔

آقا! ناراض ہوجیئے۔ رات کو کہیں رہیئے۔ لیکن میں مرکر بھی آپ کے ساتھ رہوں گی۔ اب کیا ہے، بہت گئی تھوڑی باقی ہے موت کا پیام آچکا ہے۔ اللہ نے میری پکار سن لی۔ آپ سے آخری التجا ہے کہ میری لاش کو اپنی نگرانی میں سپرد خاک کرنا۔ اسکی بعد شادی کرلینا ورنہ آپ کی نئی بیوی کی محبت میں خلل پڑے گا۔ خدا کرے آپ کا ہر روز روز عید ہو اور ہر شب شب برات "

"حضرت بیدآغ"

جناب ظفریاب خاں صاحب

خراسان کے مایہ ناز شاعر اور مشہور صوفی حضرت جامی کے معاصرین میں ایک برخود غلط شاعر تھا جس کی شہرت مولانا کے قطعۂ ذیل کی رہین منت ہے۔

ساغرے میگفت دزدان معانی بردہ اند — ہر کجا در شعر من معنی رنگیں دیدہ اند
دیدم اکثر شعرہایش را یکے معنی نداشت — راست میگوید کہ معنیہاش را دزدیدہ اند

یہ عجیب بات ہے کہ ان عجیب وغریب ہستیوں سے زمانہ خالی نہیں ہوتا ہے۔ یادش بخیر کسی زمانہ میں ہمیں بھی حضرت امجد کے طفیل میں حیدرآباد کے اسی قسم کے ایک بلند بول شاعر حضرت بیدآغ سے ملنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ جو بزعم خود رشک مرزا و میر اور فخر داغ و امیر تھے۔ بات بات پر دہلی اور لکھنؤ کے مشاہیر شعرا کی تحقیر پر اتر آتے اور خصوصیت کے ساتھ داغ مرحوم کو بے نقط سنایا کرتے تھے۔ ارشاد ہوتا تھا میاں بھلے آدمیوں کا تخلص کہیں داغ۔ دھبہ ہوا کرتا ہے باایں ہمہ عوام کی نافہمیوں نے اس بیچارہ داغ کو اس قدر بانس پر چڑھایا کہ اب اس کا شوہر عامی وجاہل کوچہ وبازار میں الاپا کرتا ہے :—

علاج درد دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا

القصہ حضرت بیدآغ حضرت داغ مرحوم پر بے طرح بگڑے رہتے اور ان کی شہرت کو کسی طرح برداشت نہیں کرتے بلکہ ان کی عزت و توقیر کا مستحق اپنے آپ کو سمجھتے تھے۔

حضرت داغ کے لقب "بلبل ہند" کے جواب میں انھوں نے اپنے لئے "طاؤس ہند" کا لقب تجویز کیا تھا جب اون سے سوال کیا جاتا کہ حضرت طاؤس تو سراپا داغدار ہوتا ہے آپ بیداغ کیونکر ہوگئے تو نہایت جھلا کر معترض کو چپ کرنے کی کوشش کرتے اور فرماتے کہ میاں تم کو کیا خبر انسان کا کمال یہی ہے کہ سراپا داغدار ہوکر بیداغ رہے۔

میرا حافظہ خطا کرتا ہو تو حضرت بیداغ چھوٹے قد کے سفید ریش اور پرانی وضع کے آدمی تھے۔ شاعری کا بستہ "تصویر جاناں" کی طرح ہمیشہ زیر بغل رہتا۔ ان کے دو ہونہار شاگرد میاں خمدآر اور میاں بلدآز ہر وقت سایہ کی طرح استاد کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ میرے ترتیب دیوان کے سوال پر نہایت لاپروائی سے ارشاد ہوا تھا کہ میاں میرے کلام سے کئی جھرے بھرے پڑے ہیں۔ مجھے شعر گوئی سے اتنی فرصت کہاں کہ دیوان ترتیب دیکھوں۔ یہ کام میاں خمدار اور میاں بلدار کا ہے جو ممکن ہے کہ میرے بعد انجام پائے۔

مشتاق حاضرین کی استدعا پر پینترے بدل بدل کر نہایت پرجوش لہجہ میں اپنا کلام سنایا تھا جو افسوس ہے کہ دماغ میں محفوظ نہ رہ سکا۔ ایک غزل سنانے کے قبل جس کا صرف مطلع یاد رہ گیا ہے ارشاد ہوا کہ لوگ غالب کی اس غزل پر خواہ مخواہ سر دھنتے ہیں۔

یہ کہاں ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

بھلا اس میں رکھا کیا ہے اس تمہید کے بعد غالب کی غزل کے جواب میں جو غزل ارشاد ہوئی اس کا مطلع ملاحظہ ہو۔

یہ کیا خوب ہی تھا سودا جو بزار[*] یار ہوتا کہ متاع نقد دل کا خریدار ہوتا

پڑھتے وقت حضرت بیدآغ کو اس ایک شعر میں دو جگہ یعنی "یہ کیا خوب" اور "خریدار" پر چھلانگ مارنی پڑی تھی۔ ان کے لاجواب کلام اور پڑھنے کے انداز پر حاضرین کے پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑ پڑ گئے۔ اس پر حضرت بیداغ خوش تھے کہ میرے کلام کی داد ہر شخص "خندہ بے اختیار" سے دیرہا ہے۔ اس موقع کا ایک شعر اور بھی حافظہ میں رہ گیا ہے جو بڑے فخر سے سناتے ہوئے حاضرین سے داد طلب کی گئی تھی۔

ہم اُن کی راہ تکتے ہیں مثال عید الفطر اور دل اپنا بنا کر عطردان تیار رکھتے ہیں

میرے ناقص حافظہ میں جو کچھ محفوظ تھا اس سے ناظرین کی ضیافت طبع کر دی گئی ہے۔ ان کے کلام سے مزید لطف اندوز ہونا منظور ہو تو اس کے لئے حضرت امجد مدظلہ سے ملاقات یا درخواست کیجا سکتی ہے۔

---

[*] بازار کا مخفف ہے۔ ۱۲

افسوس ہے کہ طغیانی کے بعد سے حضرت بیدآغ کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ بعض معتبر راویوں کا بیان ہے کہ عالم بدبہی دکن کی اس بے بہا امانت کو" موسی ندی" نے ۱۹۰۸ء کی طغیانی میں اپنی حفاظت میں لے لیا۔ لیکن ان کے کمالات شاعری کے مد نظر ان کو مرحوم کہتے یا لکھتے ہوئے شدت کے ساتھ رنج والم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

امیر

جناب سید عزیز الحسن صاحب ضیا

امارت اُس کے قدموں پر نثار ہوتی ہے ــــ غربت کیا ہے، وہ نہیں جانتا۔ لوگ اُس کی عزت کرتے ہیں، لیکن وہ غریبوں کی کوئی امداد نہیں کرتا، حالانکہ یہ اُس کا فرض تھا کہ غریبوں کی امداد سے سعادت حاصل کرتا۔ اور دونوں جہاں میں سرخ رُو ہوتا۔

اُس کی مذموم حرکات پر کوئی انگشت نما نہیں! وہ امیر ہے ــــ بے انتہا!

لوگ اُس سے ڈرتے ہیں، اور اس کی بیجا تعریف و توصیف میں زبان وقف ہے۔ دولت نے اُسے اندھا کر دیا ہے۔ اس کی عقل سلیم باقی نہ رہی اور حق و انصاف کی بصارت رخصت ہو چکی ہے۔

اُس کو مذہب و اخلاق سے کوئی تعلق نہیں ــــ وہ خود ہی مذہب ہے۔ اور خود ہی اخلاق! اُس کا عالیشان مکان بہت وسیع ہے۔ رات کے وقت بجلی کی روشنی سے اُس کا امارت کدہ بقعۂ نور بن جاتا ہے اور غربت و افلاس کی تاریکی امارت کی اس جگمگاتی روشنی میں گم ہو جاتی ہے۔ اُس کا دولت کدہ عیش و عشرت کے سامان سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ وہاں ریڈیو ہے۔ ٹیلیفون ہے، بجلی کے پنکھے ہیں۔ سوفے ہیں اور طرح طرح کے سامان سے مکان بھرا پڑا ہے۔

وہ ایک قیمتی موٹر میں بیٹھ کر پھرتا ہے جس کے اخراجات سے کتنے فاقہ کش پرورش پا سکتے تھے۔

وہ قیمتی لباس زیب تن کرتا ہے جس کی چمک دمک سے غریبوں کی نگاہیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔

اس کے دستر خوان پر اعلیٰ قسم کی نعمتیں رہتی ہیں، لیکن اس پر غریبوں کا گذر ممکن نہیں۔

وہ کثیر الاولاد ہے۔ اس کے بچوں کا دماغ امارت کی رعونت سے آسمان پر ہے۔

مگر یہ سب کچھ ایک عارضی شئی ہے۔ دولت ڈھلتی چھاؤں ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

ناہید

جلد ۶ اسفندار ۱۳۵۲ف م جنوری ۱۹۴۳ء نمبر ۴

۱- سینما بینی - عظیم کا لکھا ہوا ہے مضامین سے زیادہ عمل کی ضرورت ہے جب ہی اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ورنہ تو بہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند' کی گنجائش رہتی ہے۔

۲- زاہدہ آپا - ایک اصلاحی مضمون ہے تعلیم یافتہ خواتین کے لئے کہ وہ محض تعلیم کے شوق میں گھریلو زندگی سے کس قدر دور ہوتی جا رہی ہیں۔

۳- کاجل - آنکھوں کیلئے مفید ضرور ہے لیکن اگر یہ بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو درحقیقت کلاس نہسائی ہو سکتا ہے۔

۴- شوق رقص - مغربی رقص کی اندھا دھند تقلید ہے۔

۵- افسانوی خط - اچھی طویل افسانہ ہے۔

۶- مضراب - غالباً یہ باہمی چوٹیں ہیں جس کو آپ حل کر سکتی ہیں اور نہ ہم

۷- کرنوں کے سایہ میں - آپ بھی اپنے تخیلات کی دنیا میں سیر کر سکتی ہیں۔

۸- بے تکلفی - واقعی بعض اوقات تکلیف دہ ہے۔

"ب"

محمودیہ پریس چارمینار میں چھپکر دفتر شہاب بیرون دبیرپورہ سے شائع ہوا۔

"سینما بینی"

عظیم

سائنس کے کسی عمل نے لوگوں میں اتنی دلچسپی پیدا نہیں کی جتنی کہ "سینما بینی" نے۔ جس کو سب یکساں ذوق و شوق اور دلچسپی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

دنیائے "بناوٹ پسندوں" نے حیاسوز ـــ مجسموں کی مچلتی ہوئی تصویروں کو متحرک ہوتے ہوئے پردہ پر دیکھنا بھی تفریح سمجھ رکھا ہے۔

وہ اس "فریبی پردہ" کو دنیا جہان کی دلچسپیوں، بہترین مناظر اور تڑپا دینے والے ترانوں کا حامل سمجھتے ہیں۔ واقعی وہاں "بناوٹ" کی تاریکی مچل کر کہتی ہے "میں نے دنیا کو فتح کر لیا ہے"۔ جہاں کی حیاسوز ـــ ہوشربا! تھیٹروں کے پر اشتیاق جذبات اور بیتاب! نگاہوں نے سیکڑوں لوگوں کو دعوت سیر و نظارہ دی ہے۔

اور اس "چشم نمائی" پردہ پر ماتم ـــ کی مکمل تصویریں ـــ وفا کے خونین! مظاہرے ـــ دیکھنا حد درجہ جاذبیت رکھتا ہے۔

اگر ہم اُن کے اس بیہودہ خیال پر ہی ماتم کی مکمل تصویر ـــ بن جائیں تو کم ہے۔ "برے فلموں" میں گویا ہمیں برے راستے بتائے جاتے ہیں اور برے کاموں کی ترغیب دیجاتی ہے۔ خصوصاً بچوں کے معصوم تخیل میں برے نتائج مرتسم ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ بہت جلد ماحول کے اثر کو قبول کر لیتے ہیں۔

اُن برے تاثرات سے جو نہایت خوبی کے ساتھ اُن کے دل و دماغ پر منتقل کئے جاتے ہیں جن سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں سکتے۔ بچے ہر دلکش چیز کے دیکھنے کے خواہشمند بھی ہوتے ہیں۔ اس سحرکار فضا ـــ کو عالم حیرت و استعجاب میں غرق خود ہی پیکر تصویر بنے دیکھتے ہیں۔ وہ ـــ حقیقت کی تلخی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اور خود بھی ویسی ہی حرکتیں کرنے لگتے ہیں جیسا کہ اُنہیں عمل کر کے دکھایا جاتا ہے۔ اسلئے انہیں صرف ایسے "فلم" دکھانا چاہیئے جس میں سنجیدہ مذاق ہو۔ اور افسانہ کے تمام پہلو پر لطیف تبصرہ ہو۔ اُن کے تخیل کو اس "بناوٹ" اور بری حرکتوں سے ہٹا کر اچھے نتیجہ پر پہنچانا چاہیئے۔ بچوں میں جب تک ہر چیز کی اچھائی، برائی سمجھنے کی صلاحیت نہ پیدا ہو جائے انہیں ایسے بے فائدہ مناظر ـــ دکھانا سراسر غلطی ہے۔

بچوں کے دل پر ضرور تھوڑا بہت اثر اس "دلکش فریب" کا ہو ہی جاتا ہے پھر وہ اس کے دیکھنے کے شوقین ہو جاتے ہیں۔ پہلے اس کا شوق چنگاری ـــ! ایک حقیر چنگاری رہتا ہے ـــ!! اگر اس وقت بھی لاپروائی کی جائے تو یہی حقیر

چنگاری۔ شرارہ لرزتا کانپتا اور بڑھتا ہوا شرارہ ــــ بلکہ وہ شعلہ جوالہ میں تبدیل ہو سکتا ہے جو ان ہونہاروں کے دل و جگر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

بچے تو بچے ہی ہیں اکثر اوقات بڑے بھی لڑکھڑا جاتے ہیں۔ ان کی نظروں میں "سینما" گھومتا معلوم ہوتا ہے۔ ہاں! اُن بناوٹی مورتیوں کی طرح دنیا بھی رقص کرتی نظر آتی ہے۔ گویا کائنات کا ذرہ ذرہ ــــ ان کے ساتھ حرکت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ بھلا بغیر ایسی تفریح کے ان آزادوں کی زندگی پھیکی اور بے کیف نہ ہو تو پھر کیسی ہو ــــ حیف ایسی تفریح جو اخلاقی تنزل اور فضولیات کی طرف رجوع کرے۔ دنیا اس کو تفریح اور ترقی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ایسے وقت میں کسی سطحی خیال والے شخص کو جب کہ اس "شوقِ فریب" کی پرکیف آندھی اس کے جذبات میں تلاطم پیدا کردے۔ اگر کوئی اچھا سمجھانے والا نسطے تو ضرور بُرے نتائج برآمد ہوں گے۔ اور آج کل ایسے نتائج بہت دیکھنے میں آرہے ہیں۔

ان برے نتائج کی بڑی وجہ یہ ہے کہ "سبق آموز فلم" بہت کم دکھائے جاتے ہیں۔ اور ایسے خراب فلم دیکھنے سے ہم کئی طرح سے نقصان اٹھاتے ہیں۔ صحت کی خرابی، پیسہ کا خرچ، وقت کی بربادی ــــ قیمتی وقت جو فضول کام میں صرف ہو، حقیقی حسرت و غم پوشیدہ رکھتا ہے جو پردہ پر ان نازیبا حرکتوں میں نظر نہیں آتا۔

سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہمارے اخلاق پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ وہ فلم" جو اخلاقی درجے سے گرے ہوئے ہوں کسی طرح مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ پھر دو تین گھنٹہ الگ دماغ پاشی کرنی پڑتی ہے۔

"سینما بینی" بظاہر ایک تفریحی شغلہ بن کر رہ گیا ہے جس کی سرعت رفتار بچیں کے لئے شاید غیر محسوس نہ ہو گی۔ اس کا شوق روز بروز اس قدر ترقی پر ہے کہ اگر اس سے اچھے تاثرات مرتب ہوتے تو بجائے تنزل کے دنیا اور ترقی کی طرف جاتی۔ اس طرح "سینما بینی" قومی مفاد کیلئے بہترین ثابت ہو سکتی۔

بعض "نصیحت آموز فلم" بھی دکھائے جاتے ہیں۔ مگر کسی زندہ اور چلبلے دل پر دراز بالوں کی مقناطیسی کشش ــــ اور بے تاب نگاہوں کی جاذبیت اثر کرے گی نہ کہ نصیحت!!

یوں بھی ہم سطحی خیال والوں کیلئے ظاہری چیزوں سے معنوی نصیحت حاصل کرنا ایک دشوار امر ہے۔
ورنہ ایسے "فلم" تو صرف اُن کیلئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں جن کی ذہنیت و شخصیت عام لوگوں سے بلند ہو۔

ماہِ نو

چرخ نے بالی چرالی ہے عروس شام کی؟ ـــ نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی

علامہ اقبالؒ

زاہدہ آپا

بدر یعقوب

درختوں کے جھنڈ تلے گھاس کی روش پر تین اور لڑکیوں کو لئے نجمہ بیٹھی تھی۔ لباس کی جدت طرازی چوڑیوں اور جوتوں کی خوش پسندی زیور اور بالوں کی آرائش وغیرہ پر کافی گفتگو ہو چکی تھی۔ اب مختلف کردار پر نقد و تبصرہ شروع ہوا تھا۔ عام عورتوں کی طرح ان لڑکیوں کا بھی محبوب ترین مشغلہ دوسروں کے کردار پر تنقید کرنا۔ محاسن ہوں تو تعریف کرنا اور معائب ہوں تو مذمت کرنا تھا۔ اسی طرح ان کی فرصت کے لمحات گذرتے تھے۔

نجمہ نے کہا: اری حمیدہ نے بی۔ اے کیا کرلیا۔ بس اب تو کسی کو سمجھتی ہی نہیں۔ دماغ سڑ گیا ہے۔ اس کا۔ نہ بزرگوں کا ادب ہے۔ نہ چھوٹوں کا کچھ خیال۔ بس سمجھتی ہیں کہ سب جاہل ہیں۔ اری چل سب ایسی تھوڑی ہوتی ہیں۔ آمنہ نے کہا۔ آخر زاہدہ آپا بھی تو بی۔ اے ہیں۔ ماما ئیں تک اُن پر قربان ہوتی ہیں۔ بیچ میں ٹیک کر سرور نے کہا۔ ایک بڑی مزے کی بات ہے۔ سنو حمیدہ کے گھر کی ماما ایک روز بڑبڑا رہی تھی کہ حمیدہ نے اسے ہدایت دی ہے۔ بی بی نہ پکارو بلکہ بی۔ اے بی بی پکارو۔ سُنا ہے کہ اس نے اپنے کمرہ کے دروازہ پر بھی بی۔ اے کی تختی لگائی ہے۔ آمنہ نے کہا۔ سنا ہے کیا، میں نے خود دیکھا ہے۔ میں نے کہا۔ بوا تم اپنی پیشانی پر بھی سنہری حرفوں سے بی۔ اے کندہ کروالو۔ تو کتنا اچھا ہوگا۔ ایک طرف جامعہ کا نام روشن ہوگا تو دوسری طرف لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ بی۔ اے ہیں۔ لیکن وہ ایسی حیادار ہے کہتی ہے ضرور کندہ کرواؤں گی۔ شاہدہ حلق پھاڑے چیختی چلاتی سبز سبز گھاس کو پیروں تلے روندتی آدھمکی اور آتے ہی دم سے بیٹھ گئی۔ اور جھٹ سرور کی گود میں سر رکھ کر دراز ہوگئی۔ سرور نے کہا۔ یہ نخرے ہمیں نہیں بھاتے۔ سیدھی طرح اُٹھ بیٹھو۔ ورنہ پھر شروع کروں گی گدگدیاں۔ شاہدہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ آنچل سنبھالتے ہوئے کہنے لگی۔ کمبخت کتنی ظالم ہے۔ ذرا سا لیٹ جاؤں تو تیرے کون سے میرے موتی جھڑ جائیں گے۔ ادھر سے صفیہ آئی اور کہنے لگی۔ تو یہ تم لوگ یہاں بیٹھی ہیں۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر حیران ہوگئی۔ زاہدہ آپا نے تم لوگوں کو کل بلوایا ہے ضرور آنا۔ تعطیل بھی ہے۔ خوب لطف آئیگا۔ زاہدہ آپا۔ محلہ بھر میں مشہور تھیں۔ ہر لڑکی، ہر عورت ان کی راہ میں آنکھیں بچھانا فخر سمجھتی تھی۔ وہ تھیں بھی ایسی ہی۔ اپنے محلہ کی بیمار خواتین اور بچوں کی بذات خود تیمارداری کیا کرتی تھیں۔ گھر پہ غریب لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ اپنے محلہ کی غریب لڑکیوں کی شادی کے لئے چندے وصول کرنے میں استاد تھیں۔ خود بھی جی کھول کر مدد کیا کرتی تھیں۔ سینکڑوں بیبیوں کے قرآن ختم کرادئے۔ ہزاروں کی نمازیں شروع کرادیں۔ اوروں کے دکھ پر ہمیشہ تڑپ تڑپ جایا کرتیں اور غریبوں کی خوشی کو ہمیشہ اپنی

خوشی پر مقدم سمجھتیں موٹا پہنتیں اور موٹا کھاتیں۔

دوسرے روز سب لڑکیاں صفیہ کے ہاں پہنچ گئیں۔ صفیہ نے بتایا زاہدہ آپا پائیں باغ میں آم کی پیڑ کے نیچے بیٹھی کچھ سی رہی ہیں۔ یہ سب وہاں جا پہنچیں۔ دیکھا زاہدہ آپا مشین میں پھنسی بیٹھی ہیں اور ایک طرف کپڑوں کی ڈھیر لگی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ کسی یتیم خانہ کے چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کے کپڑے ہیں جن کی سلائی کا ذمہ زاہدہ آپا نے لیا ہے۔ زاہدہ آپا نے بڑی دیر کے بعد یکایک ایک سوال ٹھوک دیا۔ کہنے لگیں۔ لڑکیو۔ بتاؤ یہ کیا بات ہے۔ تم لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے پر بھی اس قابل نہیں کہ طبقہ نسواں تم پر فخر کرے۔ سب لڑکیاں ایک دوسرے کی صورت تکنے لگیں۔ سرور نے نجمہ سے۔ نجمہ نے آمنہ سے اور آمنہ نے شاہدہ سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ خدا ہی خیر کرے کچھ آثار ٹھیک نہیں۔ خاموشی بہتر ہے۔ زاہدہ آپا نے پھر پوچھا بتاؤ تو آخر تم میں سے ایسی کتنی لڑکیاں ہیں جنھیں معمولی کھانا سالن بھی پکا لینا آتا ہو۔ شاہدہ کب چپ رہنے والی تھی۔ اس نے کہا۔ معمولی کھانا سالن پکانا نہ آئے تو کیا ہوا۔ ہمیں اسکول میں پڈنگ اور مختلف قسم کے انگریزی ڈشین پکانا سکھایا گیا ہے۔ اس پر زاہدہ آپا نے ایک ملکوتی قہقہہ مارا اور کہنے لگیں۔ کیا اندھیر ہے۔ اسکولوں میں وہ پکوان سکھایا جاتا ہے جس کی کچھ ایسی ضرورت نہیں۔ بات دراصل یہ ہے لڑکیوں کے والدین یہ سمجھتے ہیں کہ اسکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی لڑکیوں کو پکوان بھی سکھا دیا جائے گا۔ اور اسکول میں استانیاں سمجھتی ہیں۔ کہ لڑکیوں کو یقیناً پکوان اور سیون وغیرہ گھر پر سکھایا جاتا ہوگا۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ معلوم آج کل جتنی لڑکیاں اسکولوں سے نکل رہی ہیں۔ نری نکمی باورچی خانہ سے ایسا گھبراتی ہیں۔ جیسے وہاں کوئی بھوت ہوتا ہے۔ سوئی تک پکڑنا جانتی نہیں۔ بھلا سیئں گی کیا خاک۔ زاہدہ آپا مشین پر چڑھے ہوئے کرتے کی پلیٹ درست کرتی ہوئی کہنے لگیں۔ ذرا غور کرو۔ ایسی تعلیم سے کیا فائدہ جو تمھیں کسی کام کا نہ رکھے۔ میں نے آج تم لوگوں کو اسی لئے بلوایا تھا کہ مجھے کچھ کہنے سننے کا موقع ملے۔ امور خانہ داری کی مہات تمھارا جوہر ہے۔ جو عورت اپنے گھر کا انتظام بہتر سے بہتر کر سکتی ہے وہ اپنے گھر کو جنت بھی بنا سکتی ہے۔ ذرا اپنے بزرگوں کے متعلق تو سوچو کہ وہ کہاں کی تعلیم یافتہ ہیں۔ کن مدرسوں نے انھیں پکوان اور سیون کی تعلیم دی ہے کہ آج بھی وہی پکوان اور سیون میں مشاق نظر آتی ہیں۔ ان کے پکائے ہوئے کھانے ایسے لذیذ ہوتے ہیں کہ لوگ انگلیاں چاٹتے اٹھتے ہیں۔ ان کی سلائی کا یہ حال ہے۔ کہ کپڑا پھٹ جاتا ہے۔ لیکن ٹانکے نہیں ٹوٹتے۔ ان بڑھی بوڑھیوں سے یہ جوہر حاصل کرنا ہر لڑکی کا فرض ہے۔ شاہدہ نے کہا۔ آپا آپ ہی بتائیے گھر پر یہ سب سیکھنے کا ہمیں موقع کہاں۔ علی الصبح گاڑی آتی ہے۔ دن چڑھتے تک اسکول پہنچ جاتی ہیں۔ اسی طرح شام میں گھر پہنچتے تک چھ بج جاتے ہیں۔ اور ہوم ورک وغیرہ الگ ہماری جان پر ہوتا ہے۔ اب سیکھیں تو کس طرح سیکھیں۔ اس پر زاہدہ آپا نے کہا۔ وقت کا بہانا ٹھیک نہیں۔ تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

نہ چاہو تو پھر کچھ بھی نہیں۔ جب خود تم لوگوں میں کوئی شوق نہ ہو تو اس کا کیا علاج۔ آخر ہم نے بھی کالج کی ہوا کھائی ہے۔ ذرا سوچو ہمیں وقت کیسے ملتا تھا۔ یاد رکھو اسکول کے بھروسہ پر رہو گی تو کچھ بھی حاصل نہ کر سکو گی۔ اسکول کی تعلیم تو صرف ہمیں ہوا میں قلعے بنانا سکھاتی ہے۔ اور کچھ نہیں۔ اصل تعلیم تو گھر میں ہوتی ہے۔ سچ پوچھو تو میں خود پشیمان ہوں کہ کیوں میں نے بی۔ اے کے شوق میں اپنی اوقات خراب کی۔ کاش میں اپنا وہ زمانہ گھر پر ہی گذارتی اور اپنے بزرگوں سے پوری طرح کچھ حاصل کرتی۔ ان انمول ہستیوں سے اسی زمانہ میں جو کچھ بھی سیکھا تھا۔ آج وہی کام آرہا ہے۔ اب ان کی صورتوں کو یہ آنکھیں ترس رہی ہیں۔ لڑکیو! ابھی وقت ہے۔ آنکھیں کھولو۔ اور اپنی قابل احترام بزرگ ہستیوں کی طرف دیکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دیکھتی ہی رہ جاؤ۔ اور زمانہ ان کی آنکھیں بند کردے۔

شام میں جب لڑکیاں اپنے اپنے گھر لوٹیں تو ان کے دلوں میں کچھ سیکھنے کا جذبہ چٹکیاں لے رہا تھا۔

”کاجل“

وحیدہ نسیم زنانہ کالج عثمانیہ

کرتا ہر ایک حسن کا نظارہ میرے کیوں! کاجل کے ذوق و شوق نے رسوا کیا مجھے

اُف کس قلم سے لکھوں کہ اس کمبخت کاجل کی وجہ سے میں نے کتنے مصائب برداشت کئے اور انہیں مصائب سے تنگ آکر میں نے یک لخت کاجل سے ہجرت کرلی ہے۔ اے میرے معبود تو ہر ایک شریف مسلمان کو رسوائی سے بچائے رکھ اور پھر ایک کالج کی طالبہ کو خصوصاً کاجل کی مصیبت سے اف میرے۔۔۔۔ اللہ۔ اس نے تو بھری ہوئی طالبات کی جماعت میں میرا منھ کالا کردیا۔۔۔۔۔۔۔۔

(۲)

واقعہ یہ ہوا کہ صبح غیر معمولی سردی تھی جس کی وجہ سے ہر چیز منجمد تھی۔ ہاتھ پاؤں بھی ٹھٹھرے جا رہے تھے۔ میں ناشتہ کرکے خط لکھنے بیٹھ گئی۔ خط لکھ کر فارغ ہوئی، گھڑی کی طرف نظر دوڑائی۔ ساڑھے نو ہو چکے تھے۔ میں نے ایک جست لگائی اور سنگار میز کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ چوٹی باندھ کر فارغ ہوئی تو خیال آیا کہ کاجل لگالوں۔ جھٹ سے ڈبیہ نکالی، کاجل بھی سردی کی وجہ سے منجمد ہو چکا تھا۔ میں نے بغیر کسی خیال کے اچھی طرح سے کاجل کو سپرد چشم کیا۔۔۔۔ چند چھوٹے چھوٹے کاجل کے منجمد ٹکڑے میری آنکھوں میں گوشہ نشیں ہوگئے۔۔۔۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہی معصوم بھولے بھالے ٹکڑے۔۔۔۔۔ میری

رسوائی کا سبب بنیں گے۔۔۔۔ ان کی ہی بدولت مجھ پر انگشت نمائی ہو گی۔۔۔۔ ان ہی کی وجہ سے لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔

۔۔۔ اور آخرکار انہیں کے کارن مجھے اتنا طول وطویل مضمون لکھنا پڑے گا۔۔۔۔۔۔

گھڑی مسلسل گھنٹے بجاتی گئی۔ ہم لوگ برابر کلاسوں میں جاتے اور آتے رہے۔ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا۔ میں بھی خوش تھی اور میری ہم جماعت لڑکیاں بھی۔

۔۔۔ گھڑی نے ساڑھے بارا بجے کا اعلان زور وشور سے کیا۔ ادھر کالج کی گھنٹی ہوئی ہم لوگ نباتات کی کلاس میں بیٹھے۔ دن چڑھنے کی وجہ سے دھوپ میں حدت شروع ہو گئی اور مجھے کسی قدر گرمی محسوس ہونے لگی۔۔۔۔ اف میرے اللہ ابھی نباتات کا ایک اور گھنٹہ گذارنا ہے۔ میرا دل کانپ اوٹھا۔ کیونکہ میں اس خوشگوار موسم میں ایک جگہ بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔

۔۔۔ لکچرار صاحبہ کی نظر بچا کر میں نے اکتائے ہوئے انداز میں ایک انگڑائی لی اور ساتھ ہی ساتھ ایک جمائی بھی۔۔۔ شومئی قسمت سے میرا ہاتھ غیر ارادی طور سے آنکھوں کی طرف چلا گیا۔ ذرا سے اشارے میں۔۔۔ کاجل کے منجھ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو پہلے ہی سے آمادۂ بغاوت تھے اب برسر پیکار ہو گئے۔۔۔۔ انھوں نے چشم پوشی چھوڑ کر رخساروں کی سیر شروع کر دی۔ میں اس سے بے خبر بیٹھی لکچر سنتی رہی۔۔۔۔۔۔

میرے بازو والی لڑکی صبیحہ نے میرے بازو میں زور سے چٹکی لے کر کہا۔۔۔۔ نسیم ماشاءاللہ ذرا کاجل تو پوچھئے۔۔۔۔ میں نے لاپروائی سے دستی نکالی اور پونچھ لیا۔۔۔ میں بچاری کیا جانتی تھی کہ اس کے حق میں آگ تیل کا کام دیا۔ حضرت کاجل اور پھیل گئے۔ اور اوانھوں نے اپنی سیاحت کا دائرہ وسیع کر دیا۔

لکچرار صاحبہ پرانے اسباق کو دھرا رہی تھیں۔۔۔۔۔ انھوں نے مولی گاجر وغیرہ کے متعلق متعدد سوالات کئے جن کو سُن کر میں بے اختیار ہنس پڑی کیونکہ ایکمرتبہ میں ان مولی گاجر جیسی جڑوں کو تنا بتلا چکی تھی۔ میں ہنس رہی تھی۔ نہ جانے کیوں لکچرار صاحبہ نے بھی میری طرف دیکھکر قہقہہ لگایا وہ ہنستے ہنستے بیخود ہوتی جا رہی تھیں اور ان کے ساتھ میں بھی وہ خود اس سے بے خبر تھیں کہ میں کیوں ہنس رہی ہوں اور میں اس سے ناواقف کہ وہ کیوں قہقہہ لگا رہی تھیں کیونکہ میں اس سے بے خبر تھی کہ کس لی گوشہ ہائے چشم سے کاجل نے رخ کی راہ۔۔۔

آخرکار لکچرار صاحبہ نے بدقت تمام ہنسی ضبط کرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا اپنا چہرہ دیکھو نسیم؟ میں نے اپنا چہرہ دیکھنے کے بجائے ان کا چہرہ بغور دیکھا۔ اور لڑکیوں نے میرے رخ انور کی طرف دیکھکر قہقہہ مارا۔۔۔۔۔ صبیحہ نے کہا "اجی بیگم آپ کا کھل تمام کلوں تک بہہ آیا ہے" مجھے اس گستاخ پر سخت غصہ آرہا تھا۔ میں نے پریشانی میں قہقہہ مار کر ایک مرتبہ پوری کلاس کا جائزہ لیا اور دوسری مرتبہ اپنا خود کا۔۔۔۔ میں خود تمام لڑکیوں کے ساتھ قہقہوں میں شریک تھی اور کھسیانی ہنسی

ہنس رہی تھی۔ آخرکار اوٹھ کھڑی ہوئی اور کہا...... ذرا مجھے باہر جانے کی اجازت دیجئے۔ میں ہاتھ منھ دھونا چاہتی ہوں
..... مجھے ایک تبسم کے ساتھ اجازت مل گئی۔ میں دروازے سے باہر نکلی ہی ہوں گی کہ خیال آیا کہ کچھ لڑکیاں حیوانیات کی
کلاس میں ہیں۔ ادہر سے گذرنا ہوگا۔ کیا کروں خیر۔ ہمت مرداں مدد خدا کہتے ہوئے باہر آنکھوں اور رخساروں کو اس طرح چھپالیا
گویا اپنی حالت زار پر رو رہے ہوں..... دو تین خالی کمرے طے کرکے جلدی جلدی ایک لمبی گلی میں پہنچی۔ جہاں ایک آیا بیٹھی
برتن مانجھ رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر اس کی تلخ مسکراہٹ نے اتنا کچھ مطلب ادا کیا کہ شاید
وہ زبان سے نہ کرسکتی... میں نے کہا پانی دو۔ آیا میں منھ دھونا چاہتی ہوں۔ اس نے بڑھ کر ایک لوٹے میں نل سے پانی لیا
اور مجھے دیا۔ میں منھ دھونے لگی... میں نے کہا۔ صابن سے آیا... اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ سن لائٹ بھی
بی منھ دھونے کا نہیں.... اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ ان کی قابل احترام بی بی کو اگر کاسٹک سوڈا بھی دیدیا جائے تو اس سے
وہ منھ دھونے کے لئے تیار ہیں.... غرض کہ اب میں نے رگڑ رگڑ کر منھ اور آنکھیں دھونا شروع کیں مگر "مرض بڑھتا گیا
جوں جوں دوا کی"۔ خدا خدا کرکے آدھے گھنٹے کے بعد نجات ملی۔ منھ ہاتھ خوب رگڑ رگڑ کر پونچھا..... اس پانی کاجل کو
گالیاں دیتی ہوئی کلاس کی سمت جلدی..... راستہ میں ایک آیا ملی، کہا...... اے بی بی ناک پر کاجل لگا ہے...
... میں نے شکر ادا کیا کہ کلاس میں جانے سے پہلے یہ بات معلوم ہوگئی۔ یقین جانئے دل چاہا کہ سر سے ناک ہی کاٹ کر
پھینک دوں مگر مجبور ہوگئی۔ دوبارا منھ ہاتھ دھویا، آئینہ دیکھا۔ اچھی طرح اطمینان کرلیا کہ سرزمین رخ پر کاجل کی کوئی
نوآبادی باقی نہیں رہی۔ گھڑی دیکھا چھٹی میں پانچ منٹ باقی تھے۔ افسردہ و پژمردہ کلاس کی طرف چلدی۔ لکچرار صاحبہ
میری طرف دیکھکر مسکرائیں۔ شاید میری قابل رحم حالت پر ترس کھایا۔

آج کے دن سے میں عہد کرتی ہوں کہ یا تو میرے تن میں جان رہے یا آنکھوں میں کاجل۔

کرنوں کے سائے میں

نزہت سلطانہ

جب دن اپنی شورشوں کی لاش اٹھائے افق مغرب کی جانب چپ چاپ جانے لگتا ہے۔ اور زندگی کی الجھنیں
افسردگی کے آغوش میں مچل مچل کر فنا ہونے لگتی ہیں۔ سورج کی زرد کرنیں حسرتوں کے دوش پر اپنے غم آگین جلووں کے
ساتھ غروب ہونے کے لئے جاتی ہیں۔ اور باغ کی سرخ روشوں پر بلبل کے خواب انگیز نغمے گونج اوٹھتے ہیں۔ جھیل کی گہرائیوں

یں رنگین مچھلیوں کو نیند آنے لگتی ہے - دن کی سرگرمیاں اپنا سنہری لبادہ لپیٹ کر رخصت ہو جاتی ہیں۔ افق کے پوشیدہ کناروں پر شفق کی سرخی نقاب شب کی طرح جھلملاتی ہے۔ دن کے تیز ترقہقے اپنی آخری جھنکاروں کے ساتھ خاموش ہونے لگتے ہیں۔ گہرے نیلگوں آسمانوں پر کہیں اور بہت دور چاند کی سیمیں اور دلنواز روشنی چپ چاپ مسکرانے لگتی ہے - اور رات اپنے خوشنما دامن میں نگارخانۂ عالم کی بیداریاں سمیٹ لیتی ہے - کائنات پر خاموش ایسی جان نواز خاموشی ایسی پرسکون ایسی روح پرور خاموشی چھائی جاتی ہے جو مجھے بیحد محبوب ہے -

لمبی اور چمکدار راتوں کی تنہا وسعتوں پر میری کتاب زندگی خوابیدہ رومان آپ سے آپ جاگ پڑتے ہیں۔ میری سکون پرست روح پر کوئی سحر انگیز کیف چھا جاتا ہے - لیلائے شب کے سیاہ دامن میں چمکدار تارے جگمگاتے ہیں۔ جب نیند کی پری اپنے دھندلے لباس میں بلند آسمانوں سے نیچے اتر آتی ہے اور کائنات خواب کے طلسمی پردوں میں لپٹ کر محو خواب ہو جاتی ہے اور مشرقی شاعر کے خوابوں میں رقص کرنے والے بھنورے تیتلی کے گلے لگ کر سو جاتے ہیں۔ جب ماہتاب اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ مطلع عالم پر نمودار ہو جاتا ہے - اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے جیسے فردوسی آسمانوں پر کوئی خوبصورت پری مسکرا رہی ہے - باغ کی روشوں میں ملکۂ شب کی خوشبو کسی پوشیدہ سیلاب کی طرح جھکنے لگتی ہے - چاند کی روپہلی کرنیں آبشار کی خاموش موجوں میں سیل نور بن کر چھا جاتی ہیں - اس وقت میری خوابناک آرزوئیں شگفتہ مسکراہٹوں کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں کروٹیں لینے لگتی ہیں - اور چاند کی روشنی میرے جنون نواز تخیل پر جیسے پرانی شراب بن کر بکھر جاتی ہے - اس سرور انگیز سلسلہ میں میری پر اضطراب روح کو کوئی کھویا ہوا سکون مل جاتا ہے جس کے جان بخش سایہ میں بیٹھی گھنٹوں میں ماہتاب کی چمکدار کرنوں کو تکا کرتی ہوں - آپ جانتے ہیں مجھے ماہتاب سے کتنی شدید محبت ہے - اس وقت نہ جانے کہاں سے میرے کھوئے ہوئے خیالات کسی پیاسے ہرن کی طرح آپ سے آپ میرے قلم کی طرف بھاگ آتے ہیں - جب چاند کی سیمگوں کرنیں میری افسردہ روح کی پیاس بجھا چکتی ہیں - تب میں اپنے بکھرے ہوئے خیالات کو کاغذ کے زندانوں میں قید کرنے لگتی ہیں - کرتی چلی جاتی ہوں - گھنٹوں نہیں تھکتی کس لئے کہ اس وقت مجھے سوائے چاند کی کرنوں کے کچھ دکھائی نہیں دیتا - میں نہیں جانتی کیا لکھ رہی ہوں کیا لکھتی چلی جا رہی ہوں +

مضراب

ثریا سلیم ایم۔اے (آخری)

ایسی اٹھی وفا کہ زمانہ کا ذکر کیا اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں مجھے

پروین! تم پر موقوف نہیں۔ دنیا کا یہی حال ہے، شکایت کس سے کی جائے۔ متعدد مرتبہ خطوط اور کارڈ لکھتی رہی، جواب نہ ملا۔ مہر برلب ہوگئی۔ اس کے بعد ہمت نہیں پڑی کہ تمھارے برق جمال سے آنکھیں چار کرتی۔ حیرت ہے میں ایسی بیوفا کو ابتک بھولی کیوں نہیں۔

اس وقت تمھارے گلستان محبت کے چند دیرینہ پریشان اوراق جو نسیم سحر کی عطر بیزیوں کے ساتھ ثریا کے مشام جان تک پہنچا کرتے تھے۔ اسی شگفتگی اور تازگی سے میری میز پر بکھرے پڑے ہیں۔ مجھے دعوت نظارہ دیرہے ہیں۔ درس وفا سکھلا رہے ہیں اور پھر ایک مرتبہ اپنے بھولے ہوئے ساز کو چھیڑنے کی فرمائش کر رہے ہیں، اپنی دلکشی میں مجھے جذب کر رہے ہیں۔ میرے انہماک علمی میں مخل ہو رہے ہیں۔ باوجود بے اعتنائی کے میرے دامن تخیل کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اف! معبود، ان کاغذ کے پرزوں میں ایسی زبردست کشش کہاں سے آگئی۔ پچھلی پہر، چاندنی رات، رنگین فضا، پرکیف سکوت اور اس میں اس بانسری کا لذت آشنا ترنم، روح کو مست بنا رہا ہے۔ ایک صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

چھیڑتی جا اس عراق دلنشین کے ساز کو اے مسافر دل سمجھتا ہے تیری آواز کو!

دیکھئے یہ مضراب نیم جان میری کس حد تک رہنمائی کرے۔

آج تمھارے رشحات قلم نے خود آسمان ادب پر ابر نیسان کی شکل میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ میرے سمند ناز پر تازیانہ لگایا۔ اس بحر ناپیدا کنار میں ایک تشنہ صدف صرف ایک گہر دانہ کیلئے اپنا منہ کھول رہی ہے جو ابر کرم کی عنایت سے گرا یا جائے۔ اتنی ستم ظریفی اچھی نہیں پروین! شان بے نیازی صرف لکھنؤ کے حصے میں نہیں آئی۔ ابوالحسن کی نزاکت کی قسم، گولکنڈہ کے اجڑے عروج کی قسم، شکستہ در و دیوار اور ان کی عظمت دیرینہ کی قسم، میرا ہاتھی سوالاکھ ٹکے کا ہوتا ہے۔ ہمارے خالی دامن میں اب بھی غیرت و حمیت کے چند سوکھے ٹکڑے پڑے ہیں اور ان کی لاج رکھنی ہے۔

تمھارا آخری محبت نامہ ۱۴ر جولائی ۱۹۴۲ء کو شام کی ڈاک سے ملا۔ وہی اپنی پرانی تعلیمی مصروفیتوں کے باعث جواب نہ دے سکی۔ صرف اتنے سے جرم پر ایسی سنگین سزا تم نے میری انقلاب زندگی کو مورد الزام ٹھیرایا۔ بھلا ایک نووارد رفیق کو جو میری مسرتوں میں حصہ نہیں لے سکتا جس نے میری تکمیل میں سہولت کیلئے آزادی کی گیارنٹی دیدی ہو۔ جو مجھے دو بہت

دور دارالحکومت کے ایک گوشہ تنہائی میں ہماری پرسکون زندگی میں تلاطم بپا کرنے والے مستقبل سر پرستوں کو دعا دے رہا ہو جس کے تخیل میں انتشار ہو جس کو آپ اپنی خبر نہ ہو، تم سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے۔ قصور میرا ہے۔ کسی کو مطعون کیوں کروں۔

میں تمھاری اس ستم ظریفی پر تم کو کیا سزا دے سکتی ہوں؟ یہی کہ اپنے تیز قلم سے تمھارے عرصۂ تخیل میں حشر برپا کروں، اور اس سے پہلے کہ تمھارے زخم مندمل ہوں، انھیں پھر تازہ کردوں حتیٰ کہ وہ ناسور کی شکل اختیار کرلیں۔ تم تڑپا کرو اور میں دیکھا کروں۔ تمھارے گنجینۂ محبت کے کسی گوشہ میں تمھارے تغافل پر ماتم کرتا ہوا ایک موتی!

"شوق رقص"

غوثیہ وحید

لڑکیاں واپس جا چکی تھیں اور کچھ جا رہی تھیں۔ کالج کے شور آفرین فضا پر بتدریج سکوت چھا رہا تھا اور میں ایک چبوترے پر بیٹھی ہوئی مطالعہ کر رہی تھی بڑے انہماک کے ساتھ۔ سامنے کے کمرے سے دو نازک بدن لڑکیاں آئیں ایک کے ہاتھ میں گرامفون اور دوسرے کے پاس ریکارڈ تھے۔ مشین کھولی، ریکارڈ لگا دیا۔ سکوت ہنگامہ میں بدل گیا۔ لگیں ریکارڈ کے گت پر رقص کرنے اور میں مطالعہ چھوڑ کر یہ سوچنے لگی کہ کاش مجھے بھی رقص کرنا آتا تو شاید دنیا میری نظروں میں گردش کرنے لگتی اتنے میں پیچھے سے آواز آئی کہ بی بی گھر چلو گی بھی کہ نہیں۔ موٹر آچکی ہے۔ میں باجی کے ساتھ چل کھڑی ہوئی۔ اور جب بازار آیا تو میں نے وہی ریکارڈ خرید لیا اور نہایت بیتابی سے گھر پہنچی۔ منھ ہاتھ دھویا اور چاء پیکر اپنے کمرہ میں داخل ہوئی کہ ہاں اب رقص ہو جائے مگر فکر یہ پیدا ہوئی کہ تنہا رقص میں کوئی لطف نہیں کیونکہ جنگل میں مور ناچا کسی نے دیکھا کسی نے نہیں۔ فوراً خیال ہوا کہ خواجہ بی جو گھر کی چھوکری ہے اوسی کو کیوں نہ ساتھی بنایا جائے۔ اس تجویز کے ساتھ ہی آواز لگائی وہ ہانپتی کانپتی کمرہ میں داخل ہوئی۔ کیوں بی بی کیا حکم ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ چل ہم دونوں ناچیں وہ تعجب سے کانوں پر ہاتھ رکھکر کہنے لگی۔ نا بی بی مجھ سے تو یہ نہ ہو سکیگا۔ میں نے کہا اری چل میں سکھا دوں گی۔ آج کل جب تک ناچ نہ آئے سوسائٹی میں کوئی عزت نہیں۔ دیکھ تیرے بر دکھاوے کیلئے عورتیں آئی ہیں کل شادی ہوگی تو تیرا میاں کیا کہیگا کہ ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پرورش پائی ہوئی لڑکی ناچ سے ناواقف۔ وہ میرے ڈرانے سمجھانے سے آمادہ رقص ہوگئی، میں نے ریکارڈ لگا دیا اور خواجہ بی کا بازو تھام کر لگی اچک پھاند کرنے کہ بغیر کسی ارادہ کے دھڑام سے ہم دونوں فرش پر الجھ کر گر پڑے۔ اور خواجہ بی ہائے اللہ، ہائے اللہ کا شور مچانے لگی اور مجھے کچھ نہ سوجھا کہ کیا کیا جائے آواز کو سنکر باجی بدحواس دوڑتی ہوئی پہنچیں

اور ہم کو فرش پر الجھا ہوا دیکھکر کہنے لگیں کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا۔ میں تو شرمندگی کے مارے کچھ کہہ نہ سکی لیکن خواجہ بی نے مارے خوف کے بیان کر دیا کہ چھوٹی بی بی اپنے ساتھ ناچ سکھا رہی تھیں۔ باجی ہنس کر کہنے لگیں۔ اچھا ہوا کورانہ تقلید کا نتیجہ ہی ایسا ہوتا ہے جس میں سوائے نقصان کے کوئی نفع نہیں۔ یاد رکھو مشرق مشرق ہے اس پر مغرب کا رنگ چڑھ نہیں سکتا۔

وہ اک دن تھا میاں کو عار تھا صاحب بھی بننے سے   پڑا اب سایۂ مغرب تو بی بی بھی بنیں آیا!

افسانوی خط

رشید فاطمہ

(بسلسلۂ سابقہ)

اور ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ سو رہی ہے۔ اس وقت اس کا زخمی ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا۔ اور دوسرا تکیہ پر۔ بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد بہت ہی درد اور بے چینی و کرب کے ساتھ روحی نے آنکھیں کھولیں اور اپنا ہاتھ ایک اجنبی کے ہاتھ میں دیکھکر بہت حیران ہوئی۔ بہت ہی غور سے شاہد کو دیکھنے لگی۔ اس وقت شاہد سنگ مرمر کا مجسمہ معلوم ہو رہا تھا۔ صورت پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ فکر اور تردد کے آثار نمایاں تھے۔ ایک ہی نظر نے روحی کو شاہد کا پرستار بنا دیا۔ اور شاہد کو روحی کا۔ بہت دیر کے بعد روحی نے سوال کیا۔ میں کہاں ہوں؟ شاہد نے بہت ہی شیریں اور نرم لہجہ میں کہا۔ آپ اپنے محل میں ہیں۔ پھر اس نے سوال کیا۔ آپ کون ہیں اور مجھے کیا ہوا۔ شاہد نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں روحی کے والد قریب آئے اور اپنی بیٹی کو تندرست دیکھکر بیحد انہیں خوشی ہوئی۔ روحی نے اُٹھنے کی ناکام کوشش کی مگر شاہد نے اس کو منع کیا۔ پھر روحی نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو اس کو ایک اور نوجوان صوفے پر بیٹھا ہوا نظر آیا جس کی صورت سے شرافت ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت گہری فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اتنے میں چائے آئی چونکہ اب روحی کی طبیعت بہتر تھی۔ ان دونوں نے منہ ہاتھ دھویا اور ناشتہ جس میں انواع و اقسام کی چیزیں خود روحی کی اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی اور کچھ میرے ہاتھ کی تھی بہت ہی تعریف و تحسین کے ساتھ نوش کیں۔ ہر ہر لقمہ ان کے لئے تعریف کا سرچشمہ بنا ہوا تھا۔ میں نے پردے کی آڑ سے دیکھا تو اس وقت بھی شاہد اور روحی کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ روحی کی نگاہیں شاہد کا دلی شکریہ ادا کر رہی ہیں۔ جس کو شاہد بہت ہی خندہ پیشانی اور محبت بھری

آنکھوں سے کہہ رہا ہے کہ روحی میں تم کو چاہتا ہوں۔ روحی بھی اسی محبت سے اس کا جواب اثبات میں دیر ہی تکی یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ کچھ دیر بعد جب روحی کی طبیعت میں افاقہ ہوا تو یہ دونوں شہزادے جانے لگے تو خالو ابا نے انہی پھر اصرار کرکے تھوڑی دیر ٹھیرنے کی فرمائش کی اور ان کا حسب و نسب دریافت کیا جس سے معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی عالی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور ان کے والد جو ایک رئیس تھے حال ہی میں انتقال کر گئے۔ عارف شاہد کے چھوٹے بھائی ہیں۔ شاہد مشہور ڈاکٹر ہیں۔ جن کے پاس بہت بڑی بڑی ڈگریاں ہیں۔ عارف نے بی۔ اے پاس کرکے ایم۔ اے میں قدم رکھا ہے اور یہ دونوں کالج اور دواخانے سے واپس ہو رہے تھے کہ یہ واقعہ پیش آیا۔

اس کے بعد یہ لوگ چلے گئے۔ مگر روحی کی نظر دروازے تک ان کا جائزہ لیتی رہی۔ جب وہ جا چکے تو بہت ہی مایوسی کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے جانے کے بعد میں اور بی اماں نزدیک آئے۔ اور میں نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ روحی کو خوب غور سے دیکھا۔ روحی کچھ شرما سی گئی۔ شاید وہ جان گئی کہ میں نے کیا دیکھا۔ اور اسی شرارت بھری آواز سے کہنے لگی خوب کھیں کھیلیں بی صاحبہ۔ یہ اس قدر آہستہ کہی کہ بی اماں نہ سن سکیں، اسی وقت کئی صدقہ وغیرہ اترے۔ اور بی اماں شکرانے کی نماز ادا کرنے چلی گئیں تو میں نے خوب چھیڑا اور کہنے لگی چلو اچھا ہوا۔ جیسا تمہارا خیال تھا وہی ہوا۔ تم اکثر مجھ سے یہ کہتی تھیں کہ مجھے تو ایسا رومان پسند ہے جو یکایک اور کچھ حادثہ کے بعد ہو جائے۔ کیوں بی بنو۔ اب تو پسند ہے نا وہ کچھ شرما رہی تھی اور کچھ مسکرا رہی تھی۔ میں اس کو اسی طرح چھیڑتی رہی۔ تم تو پریشان ہو گئی ہو گی کہ اچھا خط لکھ رہی ہو خط تو کیا ہے ایک افسانہ ہے۔ کیوں بہن میں نہ کہتی تھی کہ مت سنو میں نہ لکھوں گی۔ مگر تو یہ ہے تم نے تو خطوط کا وہ تانتا لگا رکھا کہ مجھے مجبور ہو جانا پڑا۔ ابھی تو آدھا بھی نہیں ہوا۔ اگر تم کو پسند نہ آئے تو لکھ دینا۔ پھر کسی فرصت کے وقت لکھوں گی۔ اچھا خدا حافظ۔ باقی آئندہ بشرط زندگی۔ تمہاری شمسی

غزل

جناب کوثری بیگم ۔ کوثر (حیدرآبادی)

پی کے جام شراب آتا ہے — کوئی مست شباب آتا ہے
رُخ روشن کو دیکھنے کے لئے — صبحدم آفتاب آتا ہے
آتش حسن سے جہاں نہ جلے — رخ پہ ڈالے نقاب آتا ہے
چال اس کی ہے ایسی مستانہ — جیسے پی کر شراب آتا ہے
تیری مستی بھری نگاہوں کو — خوب شرم و حجاب آتا ہے
ذرہ ذرہ ہے حسن سے معمور — آج وہ بے نقاب آتا ہے

دیکھئے سوئے میکدہ کوثر
کون خانہ خراب آتا ہے۔

بے تکلفی

ص - ا

'اے ذوقِ تکلف میں ہے تکلیف سراسر'

حقیقت بھی یہی ہے کہ حد سے زیادہ تکلف وبالِ جان ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی تھوڑی ہی ہے کہ تکلف کو ایک سرے سے ہی اتار کر پھینک دیجئے۔ کسی موقع اور کسی حالت میں بھی اس کے استعمال کو گناہ سمجھئے؟ تکلف بظاہر ایک ایسا کلفدار کپڑا معلوم ہوتا ہے جس کے پہننے سے تکلیف محسوس ہوتی ہو۔ لیکن تھوڑا بہت تکلف تو ہر انسان میں لازمی ہے۔ حد سے زیادہ بے تکلفی بھی اس کپڑے سے کم چھچھوری نہیں معلوم ہوتی جو کلف اور استری کے بغیر ملا دلا جا چکا ہو۔ بے تکلفی کی دو چار مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔ بعض لوگ اپنے آپ کو 'صاف گو' کہتے ہیں۔ دراصل ان میں تکلف نام کو نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک موقع اور محل بالکل بیکار ہوتے ہیں۔ واقف کرانے کی کوشش کی جائے بھی تو ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ بس انہیں تو اپنی باتوں سے مطلب۔ چاہے وہ بے موقع ہوں یا کسی کے لئے تازیانہ۔ زبان کا چرخہ ہے کہ جاری و ساری۔ کسی طرح کی بندش نہیں۔ ان کا قول ہوتا ہے کہ 'ہم کو لگی لپٹی نہیں آتی' یعنی کسی شاعر کی زبان میں

میری آنکھوں میں نہیں پردہ فریب رنگ کا ۔۔۔ جس میں جو پایا وہی میری زباں پر آگیا

اب جناب کس میں دم ہے جو ایسے 'صاف گو' کی زبان تھام لے۔ اپنی آنکھوں سے فریب رنگ کا پردہ اٹھا کر ایسا بے نقاب کرتے ہیں کہ بس دم بخود رہ جایئے۔ اور دل ہی دل میں داد دیجئے ان کی صاف گوئی کی۔ اکثر ایسے ہیں جو اپنی چیزوں کی حد تک بہت ہی صاف گو ہوتے ہیں۔ مشکل تو جب آپڑتی ہے کہ ایسے لوگ دوسروں کو بھی اپنی جیسی صاف گوئی پر مجبور کرتے ہیں اس وقت یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ان کی زبان ہی سے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو رہا ہے تو ہم اور کہاں سے ایسے الفاظ لائیں جو ان کی تسکین کا باعث ہوں۔ بے اختیار اس وقت جی چاہتا ہے کہ کاش! کوئی ایسی لغت تیار ہوتی جس میں دنیا بھر کے صرف تعریفی الفاظ اور جملے ہوتے اور اسے زبانی رٹ لیا جاتا کہ اس وقت 'جی ہاں' 'بے شک بہت اچھی چیز ہے۔ یا واقعی آپ کا فرمانا صحیح ہے۔' کے بجائے اپنی طرف سے یہ لغت کی لغت ختم کر دی جاتی۔ ایک بزرگوار جنھیں صاف گو تو شاید اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی اس صفت کو مذاق میں لپیٹ کر یا بطور تفریح طبع استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات جب مذاق حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو مجبوراً خود انہیں بھی کہنا پڑتا ہے کہ بھئی بُرا ماننے کی کیا بات ہے یہ تو ہماری صاف گوئی ہے۔ بعض باتیں گو اپنے لئے معمولی سہی مگر ایسی ہوتی ہیں کہ اپنے سی دیرینہ دوست سے بھی کہتے جھجک

ہوتی ہے، لیکن بعض لوگ تو دو چار ملاقاتوں میں ہی ایسے بے تکلف ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے خانگی مسائل کے حل کے طلبگار ہو جاتے ہیں۔ یا کم از کم حل نہیں تو معمہ ہی بتا کر اپنا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ اکثر اپنے مو قلم سے گل افشانی کرتے ہیں، انکی خطوط میں نہ سنجیدگی ہوتی ہے نہ ہی مراتب کا لحاظ۔ محبت کا ایسا اظہار کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ کے اشاروں پر جان نچھاور کرنے میں بھی دریغ نہ کریں گے۔ تکلف تو ایسی چیز ہے کہ بچوں سے بھی گفتگو کرنے میں اسے تھوڑا بہت استعمال کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے باتیں ایسی ہیں جو بلا تکلف بچوں سے نہیں کہی جا سکتیں۔ لیکن آپ نے ایسے بہت سے لوگ دیکھے ہوں گے جو اس کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں کرتے۔ بچوں سے ایسی باتیں اور مذاق کرتے ہیں کہ سنجیدہ طبیعتوں پر سخت گراں گذرتی ہیں۔ نتیجۃً ہوتا ہے کہ بچے شرم و لحاظ کے ساتھ ساتھ پاس و ادب سے بھی عاری ہو جاتے ہیں۔ بہرحال افراط و تفریط ہر حال میں لازم و ملزوم ہیں اس میں سے کسی ایک پر عمل کرنا ٹھیک نہیں ؎

منازل

لا اله الا الله - اس عالم میں ہر ملک کا مالک۔
جو صرف اپنی سلطنت تک ہی اپنی حکومت رکھتا ہو۔
بادشاہ کہلاتا ہے۔
ایک مکان کا مالک۔
جو صرف اپنے مکان کی حد تک ہی اپنی حکومت رکھتا ہو۔
جس کے ماتحت اس کے بیوی اور بچے ہوتے ہیں۔
ایک مکان کا بادشاہ ہوتا ہے - اور پھر
ایک جھونپڑی میں رہنے والا
وہ بھی تو بادشاہ ہی ہے غرض دنیا کا ہر فرد بادشاہ ہے۔
اور ان سب بادشاہوں کا مالک
آسمان پر رہنے والا حکومت و جلال جس کا تخت ہے۔
خالق ارض و سما۔ قادر مطلق۔ سارے عالم کا شہنشاہ —
صرف خدائے واحد کی ذات ہے۔
محمد الرسول الله
آدمؑ - خدا کے بھولے بھالے، شیطان کے مکر سے نکل کر بلند مرتبہ پانے والے
پیغمبر —— صفی اللہ ہیں۔

نوحؑ - اپنی قوم سے بیزار ہو کر طوفان سے نکل کر دوسری
دنیا بسانے والے - پیغمبر - نجی اللہ ہیں۔
ابراہیمؑ صنم خانے کو ڈھانیوالے، نار کو نور کرنے والے خدا کے
دوست ہیں۔
موسیٰؑ - فرعون کے جال سے نکل کر درجہ کمال کو پہنچنے والے، کوہ طور سے
خدا کا ظہور دیکھنے والے کلیم اللہ ہیں۔
اسمٰعیلؑ - خدا کے در پر اپنا سر نثار کرنیوالے ذبیح اللہ ہیں۔
داؤدؑ - مالک زبور، جن کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا اور ان
سب نبیوں پر فضیلت پانے والے خدا کے محبوب عرش پر
جن کی نبوت کی خدائی
آدم کی تقدیر کا ستارہ چمکنے سے پہلے بھی تھی ——
بشریت کے جامہ میں پیغمبریت میں سمانیوالے
ہاں —— جن کی شہادت زمین و آسمان دیتے ہیں کہ
محمد خدا کے رسول اور اس کے بندے ہیں۔

ساجدہ — احمد محی الدین

عید

"زینت"

۱- عید کا چاند دیکھ لو سلمیٰ !

بھائی ارشد نے مسکرا کے کہا
میں نے نظریں اٹھائیں اور چھت پر
دیکھا ماجد، انیس، اور ظفر
ہیں کھڑے اپنے سر اٹھائے ہوئے
دُور نظریں کہیں جمائے ہوئے
دیکھ کر مجھ کو منجھلی آپا نے
ہاتھ اٹھایا وہ چاند دکھلانے
میں نے دیکھا وہاں منار کے پاس
چاند تھا دور سبز جھاڑ کے پاس
آسماں صاف اور نیلا تھا
نور کا اس میں ایک سفینہ تھا
جیسے زریں کسی کی ہو بالی
چپکے سے چرخ نے چرا ڈالی
دیکھ کر چاند ہاتھ اٹھے سب کے
شکر خالق کو اور دعا کے لئے
میرے بھی ہاتھ اٹھ گئے خود سے
مانگوں کیا کچھ نہ بن پڑا مجھ سے
اور جیسے افق سے آئی صدا
عید کا چاند دیکھ لو سلمیٰ !

۲- عید کی صبح ہو گئی سلمیٰ !

امی جان نے مجھے جگا کے کہا
گھر میں تھا شور اور ہنگامہ
ہنس رہے تھے امین و ریحانہ
ہاتھ کی دھو رہے تھے سب مہندی
اور مہندی لگی تھی میرے بھی
کیا حمام اور سنگھار کیا
مل کے پھر سب نے افطار کیا
آنے جانے عطر لگانے ہیں
خوب جی بھر کے پان کھانے ہیں
تحفہ دیتے ہوئے کسی نے کہا
عید کی صبح ہو گئی سلمیٰ ---!
دادا بابا، چچا و بھائی سب
چل دئے عید گاہ مل کر سب
ہم سبھوں نے بھی پھر نماز پڑھی
پر خلوص اور بصد نیاز پڑھی
"ہو مبارک ہر ایک کو یہ عید"
شور ہونے لگا قریب بعید
سب نے سب کے گلے بھی لگوایا
عیدی، تحفہ، انعام بھی پایا

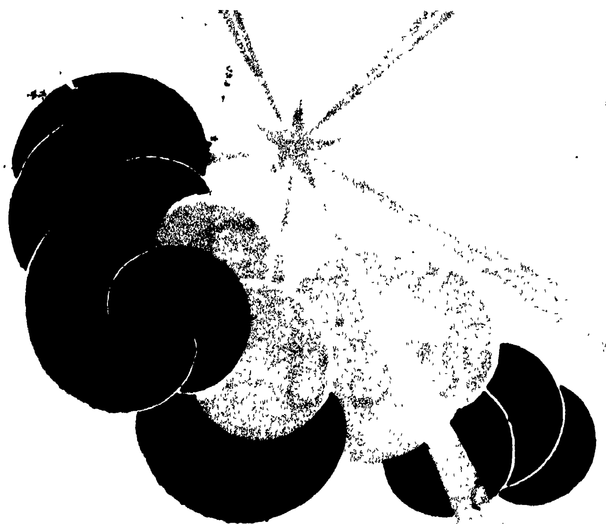
۳- عید کی شام ہو گئی سلمیٰ --- !

بھابی نے روشنی جلا کے کہا
ہو گیا سب طرف سکوں سا اب
تھک گئے ہیں خوشی کے باعث سب
باتیں دھیمے سُروں میں ہونے لگیں
نیند کی لوریاں تھپکنے لگیں
نشہ اترا خمار ہونے لگا
جاڑوں کا اتار ہونے لگا
بج رہا ہے وہاں ستار کہیں
قہقہہ چل رہا ہے اوروں میں
عید کس کی ہوئی یہ کہتی ہوں
خوشیاں ہر ایک کی اب سوچتی ہوں
بچوں کی عید اچھے کپڑے ہیں
زاہدوں کے تو تیس روزے ہیں
طالبعلموں کی عید ہوتی ہے
کامیابی انہیں جو ملتی ہے
عید میری ہے منحصر کس پر؟
کرتی ہوں غور اپنے فطرت پر
دیکھ لوں سب کو میں خوش و خرم
بھائی بہنیں ہوں یا کہ ہوں ہم
لیکن یہ عید میری عید نہیں
ایک ہستی کی جو کہ دید نہیں
دور گھر سے ہیں خالق بھائی میرے
وہ سپاہی جو خون سے کھیلے
سنتے ہیں قید میں ہیں پاکستان کے
ہائے وہ ہوں گے بیچ زنداں کے
اور تصور میں جیسے وہ میرے
دیکھ دیر سے مجھ کو وہ بولے
عید غربت کی کوئی عید ہے کیا
عید کی شام ہو گئی سلمیٰ۔

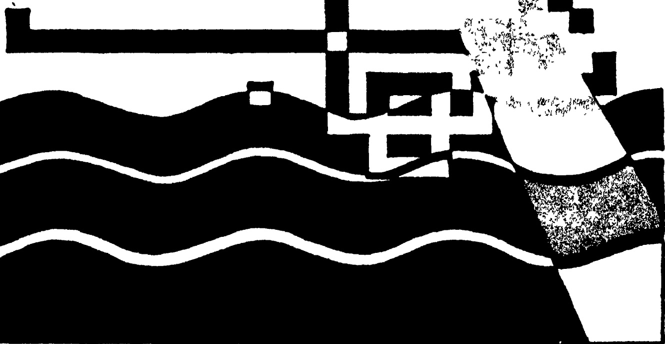
3238
REGD. M. NO.

۱۲۲
رجسٹر نمبر آصفیہ

Sree Venkatesh Press, Gowliguda Hyderabad-Dn.







شہاب

جلد ۱۱ اردی بہشت ۱۳۵۲ف م مارچ ۱۹۴۳ء نمبر ۶

(مرتبہ)

محمد عبد الرزاق بسمل

عوام سے (للعہ) گورنمنٹ سے (دعہ)

"موسم بہار"

(جناب خواجہ کرامت اللہ صاحب قمر بی۔اے، ایل، ایل۔ بی۔ ایچ، پی پی دنیانگر پنجاب)

—(٭)—

پھر میکشوں پہ لطف ہوا کردگار کا
یعنی چمن میں آگیا موسم بہار کا

نظارہ دیدنی ہے سر کوہسار کا
نغمہ شنیدنی ہے لب جوئبار کا

فردوس باصرہ ہیں ریاحین رنگ رنگ
نور وز سامعہ ہے ترنم ہزار کا

غنچے ہیں بوئے نافہ درآغوش ان دنوں
صحن چمن جواب ہے دشت تتار کا

رندوں نے میکدوں میں بچھائی بساط عیش
اور دور میں ہے جام مئے خوشگوار کا

گلشن میں بلبلوں کے ترانوں کا شور ہے
سینوں میں ہے خروش دل بیقرار کا

صبح امید کی نظر آتی ہے پھر جھلک
قصہ ہوا تمام شب انتظار کا

ہر روز روز عید ہے، ہر شب شب برات
بدلا ہے رنگ گردش لیل و نہار کا

جلوہ گری ہے ماہ جبینوں کی چار سُو
دامن ہے چاک، صبر و سکون و قرار کا

آنکھوں میں نور ہے تو دلوں میں سرور ہے
فیضان ہے یہ آمد فصل بہار کا

رونق ہے، تازگی ہے، مسرت ہے، عیش ہے
اہل جہاں پہ فضل ہے پروردگار کا

دنیا میں شادمانی و راحت کا دور ہے
شکوہ نہیں کسی کو غم روزگار کا

مستی ہے بیخودی ہے، سرور و نشاط ہے
یہ فیض ہے کسی نگہ میگسار کا

لازم ہے ہم بھی دل کے ارماں نکال لیں
کیا اعتبار ہستی ناپائیدار کا

پھر یاد آرہی ہے کسی شوخ کی مجھے
پھر غم ستا رہا ہے کسی گلعذار کا

ہوگی نہ عاشقوں کو خوشی کی گھڑی نصیب
رونا ہے صبح و شام وہی ہجر یار کا

کیا پوچھتے ہو میرے تڑپنے کا ماجرا
بسمل ہوں میں کسی کی نگاہوں کے وار کا

چھوڑا نہ مجھ کو اس نے کسی کام کا قمر
خانہ خراب ہو دل بے اختیار کا

"قدیم ہندوستانی ڈرامانویس"

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی اے (امرتسری)

"شکسپیر" تو کل کی پیدائش ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اس شہرت کا مستحق ہے جو اسے حاصل ہے، لیکن ہندوستان میں ڈرامانویس حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے پیشتر گذرے، اور چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی میں کالی داس نے اس فن کو جس کی "جنم بھومی" اگر ہندوستان کہیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا درجہ کمال پر پہنچا دیا۔ ڈراما کے امم آریہ میں شروع سے مرغوب رہا ہے، اور جو شغف انہیں اس فن سے رہا ہے وہ کسی اور قوم غیر آریا میں نہیں پایا جاتا۔

ہمارا ارادہ ہے کہ وقتاً فوقتاً قارئین "شہاب" کی ضیافت طبع کے لئے سنسکرت لٹریچر سے ڈراما اور دیگر علمی تصنفات اردو میں پیش کرتے رہیں "شہاب" بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں ہم نے ایک ڈراما "سنپا" (خواب) پیش کیا تھا، آج ہم کالیداس کا ڈراما "ملاویکا۔ اگنی متر" کا پلاٹ لکھتے ہیں۔ کالیداس کے ڈراموں میں سے "شکنتلا" اور "میگھ ودت" اور بالخصوص شکنتلا شاہکار ہے، یہ ڈراما جسے آج ہم پیش کر رہے ہیں بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ اس کا مصنف کالیداس نہیں لیکن کالی داس کی زبان اور تخیل اس میں اتنا نمایاں ہے کہ کثرت رائے سے کالیداس سے منسوب کرتی ہے، یہ ایک تاریخی ڈراما ہے، اس کا ہیرو "اگنی متر" سنگا خاندان کا راجہ تھا جو پیدائش مسیحؑ سے دوسو برس پیشتر "ودیسا" پر راج کرتا تھا جسے اب "بھیلسا" کہتے ہیں۔ اس ڈراما کے واقعات بھی تاریخی ہیں جسے کالیداس کے شاعرانہ تخیل نے افسانوی رنگ دیا ہے۔ "ودربھہ" کی ریاست جو دو حریف راجوں یگین سین اور مہادیو سین میں ڈراموں کا موجب تھی اور مہادیو سین کی بہن ملاویکا جو اس ڈراما کی "ہیروئن" ہے وہ بھی تاریخی شخصیت ہے، اس ڈراما کا باقی تار و پود بلاشبہ کالیداس کا تخیل ہے۔ "اختر"

―――――(۲)―――――

"ودیسا" اور "ودربھہ" دو ریاستوں کے حدود ملحق تھے۔ ودیسا کے راجہ "اگنی متر" اور ودربھہ کے راجہ "یگن سین" کے درمیان آئے دن لڑائی کا بازار گرم رہتا۔ یگن سین کا حریف مہادیو سین بھی ودربھہ کا دعویدار تھا، ایک تو اس وجہ سے کہ ودیسا کے حدود ودربھہ سے ملتے تھے اور حدود پر تنازعہ اکثر رہتا دوسرے اس وجہ سے کہ

مہادیوسین نے اگنی متر سے رابطہ اتحاد گانٹھا اور اپنی حسین بہن ملاویکا کو اگنی متر کے ساتھ بیاہنے کا وعدہ کیا اور اگنی متر نے بیاہ سے اوس کی مدد کی۔ پہلے تو حدود پر عموماً جھڑپ رہا کرتی۔ لیکن اب باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ بدقسمتی سے پہلے ہی لڑائی میں مہادیوسین کو شکست ہوئی اور وہ قید ہوگیا۔ اس کا وزیر "سوماوتی" اپنی بہن "کوسیکی" اور مہادیوسین کی بہن "ملاویکا" کو لے کر بھاگا اور ودیسا کا رخ کیا، راستہ میں جنگل پڑتا تھا۔ وہاں ڈاکوؤں سے مٹھ بھیڑ ہوگئی سوماوتی کے ہمراہ چند سپاہی بھی تھے مگر حملہ ایسا اچانک اور شدت کا تھا کہ سوماوتی اور اس کے جانثار لڑتے ہوئے کام آئے۔ اس کی بہن "کوسیکی" زخم خوردہ بیہوش ہوکر گر پڑی اور ڈاکو اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے اور "ملاویکا" کو زبردستی پکڑ کر لے گئے۔ جب کوسیکی ہوش میں آئی تو دیکھا کہ بھائی تو مرا پڑا ہے اور ملاویکا کا وہاں کوئی نشان نہیں، روتے دھوتے بھائی کی آخری رسمیں ادا کیں اور سادھنی کے بھیس میں ودیسا پہنچ گئی اور اگنی متر کے محل میں آئی۔ اگنی متر کی دو رانیاں "دھارینی" اور "ایراوتی" نامی تھیں، کوسیکی رانی "دھارینی" کی داسی بنی۔

جب راجہ اگنی متر کو مہادیوسین کی شکست اور گرفتاری کا پرچہ ملا، تو فوراً اپنے سنیاپتی (سپہ سالار) ویرسین کو ودربھ پر حملہ کا حکم دیا، ویرسین یلغار کرتا ہوا بڑھ رہا تھا کہ پہلے ہی ڈاکوؤں کا گروہ سامنے آیا جن کے قبضہ میں ملاویکا تھی۔ اگرچہ ڈاکو بھاگنا چاہتے تھے مگر جلدی ہی نرغہ میں آگئے۔ کچھ تو مارے گئے اور کچھ پھانسی پر لٹکائے گئے اور ملاویکا کو ویرسین نے راج رانی دھارینی کے پاس بحفاظت بھیجدیا، اور آپ آگے بڑھتا گیا۔ "دھارینی" سنیاپتی ویرسین کی بہن تھی، دھارینی نے دیکھا کہ بھائی نے جو تحفہ بھیجا ہے وہ نادر شئی ہے اور اگر حسن صورت کے ساتھ راگ ودیا اور رقص سے بھی باخبر ہو تو یگانہ روزگار ہو۔ چنانچہ اپنے درباری ناٹک گن داس کے حوالہ کردیا کہ اسے روزانہ موسیقی کا سبق دیا کرے، ملاویکا اور کوسیکی نے فوراً ایک دوسرے کو پہچان لیا لیکن دونوں نے مناسب سمجھا کہ ان کی اصلیت کا پتہ کسی کو نہ ہو۔ دونوں تنہائی میں کبھی کبھی ملتیں اور اپنی بدقسمتی پر روتیں۔ ملاویکا جیسے حسین تھی ویسے ہی ذہین بھی تھی، تھوڑے عرصہ میں اس نے رقص و سرود میں وہ مہارت پیدا کرلی کہ استاد بھی حیران رہ گیا، گن داس کو معلوم نہ تھا کہ ملاویکا پہلے ہی بہت کچھ موسیقی سے واقف ہے۔

راج رانی دھارینی کو مصوری کا بہت شوق تھا۔ اس نے اپنی سہیلیوں کو جمع کرکے ان کی تصویر کھینچی، ایک روز وہ اس تصویر کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک راجہ اگنی متر آنکلا۔ تصویر دیکھ کر اس نے بہت تعریف کی ان میں سے ملاویکا کو اس نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی خوبصورتی پر لٹو ہوگیا اور رانی سے پوچھا کہ یہ کون ہے، میں نے پہلے اسے نہیں دیکھا؟ رانی بھی تاڑ گئی کہ راجہ کا کیا مطلب ہے۔ اِدھر اُدھر باتوں میں ٹالنا چاہا، لیکن راجہ کی

صوم لڑکی جو رانی کے بطن سے تھی جھٹ معصومانہ انداز سے بولی کہ پتا جی یہ "ملاویکا" ہے۔ اگرچہ راجہ کو معلوم تھا کہ
ویکا مہا دیو سین کی بہن اس کی منگیتر ہے لیکن اس وقت ذہن ادھر منتقل نہ ہوا اور بار بار تصویر کو دیکھتا رہا،
ں کا نقش ہر ایک نگاہ کے ساتھ اس کے دل پر گہرا ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اس امید پر ٹھیرا رہا کہ ممکن ہے اس تصویر
صل ادھر آنکلے اور اسے بھی دیکھ لوں۔ لیکن قسمت نے یاوری نہ کی، اب رانی کو بھی فکر لاحق ہوا اس لئے ہر ایک
لمن کوشش کی کہ کہیں ملاویکا پر راجہ کی نظر نہ پڑ جائے اور تصویر کو بھی چھپا دیا کہ چند روز کے بعد راجہ بھول جائیگا۔
راجہ کے دل پر یہ تصویر کھینچ چکی تھی اور اسی کا تصور اس کے پیش نظر تھا۔ اگر وہ چاہتا تو بزور گوہر مقصود چھین لیتا۔
لمن وہ دونوں رانیوں کے ساتھ بدمزگی پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا، مگر دل بیقرار پہلو میں جو کچھ تقاضا کر رہا تھا اس
، تدبیر بھی سوچ رہا تھا، برہمن گوتم راجہ کا درویشک بے تکلف دوست تھا آخر اسے حال بتایا کہ کوئی تجویز ایسی کرو
ملاویکا کو ایک نظر دیکھ لوں۔ گوتم نے کہا اتنے پریشان کیوں ہو۔ یہ کونسی بڑی بات ہے، راجہ نے پوچھا کہ تمھارے
بال میں کیا بات آئی ہے۔ برہمن نے کہا کہ تم بھی عجب راجہ ہو۔ اتنی بڑی سلطنت کے مالک اور اس کا انتظام کر رہے ہو
ک عورت نے تم پر قبضہ جمالیا۔ جانے بھی دو اس قصہ کو، راجہ نے کہا کہ دل لگی چھوڑو۔ گوتم نے کہا کہ دل لگی کی باتیں
آپ کر رہے ہیں۔ خیر اگر ملاویکا کو دیکھنا ہی ہے تو جی بھر کر دیکھ لینا۔ گن داس ناٹک کی خاطر رانی کو بہت منظور ہے۔
ں اس کا اور دوسرے ناٹک "ہر وت" کا جو تمھارا پروردہ ہے مقابلہ کراتا ہوں۔ دونوں برابر کی چوٹ ہیں فیصلہ
تمھارے اور رانی کی رائے پر ہوگا جو کبھی متفق نہیں ہوسکتی۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوگا کہ دونوں کے شاگردوں میں سے جو
مقابلہ میں بڑھ جائے وہ جیتا۔ کیوں کیسی کہی۔ راجہ نے کہا کہ تجویز تو خوب سوجھی اب عملی جامہ بھی تم ہی پہناؤ، بدشک
ے بائیں ہاتھ کا یہ کرتب تھا۔ پہلے تو تنہائی میں دونوں کو ملا اور ان کی تعریف کرتا رہا۔ اور یہ بھی کہتا رہا کہ دوسرا
ناٹک اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور تمھیں خیال میں نہیں لاتا۔ آخر ایک روز سر دربار دونوں ناٹکوں میں جھڑپ ہو ہی گئی۔
ور دونوں دست بستہ راجہ کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے کہ مہاراج آپ ہی فیصلہ کریں کہ ہم میں سے کون راگ ودیا
میں زیادہ ماہر ہے، راجہ نے کہا کہ تم دونوں اپنے اپنے فن کے استاد ہو۔ لیکن ایک شخص کا فیصلہ غلط بھی ہوسکتا ہے اس لئے
ناسب ہے کہ راج رانی بھی موجود ہو اور تم دونوں دربار میں اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرو۔ چنانچہ راجہ نے رانی کو اس
صنیہ کی اطلاع دی، اور ایک دن مقابلہ کے لئے مقرر ہوا، راجہ بے صبری سے انتظار کر رہا تھا دیکھئے برہمن دیوتا کس طرح
لاپ کراتے ہیں آخر مقابلہ کا دن بھی آگیا۔ اور دونوں ناٹک ساز و سامان سے لیس ہو کر اکھاڑے میں آدھمکے۔ دونوں
رانیاں بھی موجود تھیں۔ راج رانی دھارنی اپنے پروردہ کی فتح کے لئے پریشان ہو رہی تھی۔ گن داس نے راجہ اور

اہالیان دربار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ راگ دیوتاؤں کی ودیا ہے۔ اور جس پر دیوتاؤں کی کرپا ہو وہی اس ودیا سے واقف ہوگا، راگ کے پتی شیوجی مہاراج ہیں، مارگ راگ جو شیوجی نے برہماجی کے آگے گائے اور بین پر بجائے اور نرت (رقص) کرکے دکھلائے وہ میں سب جانتا ہوں اور ساتوں سروں اور تین گرام اور انچاس کوٹ تان کے ساتھ ادا کر سکتا ہوں۔" ہروت نے بات کاٹ کر کہا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے یہ تو میرے شاگرد بھی جانتے اور کر سکتے ہیں۔ بدوشک کو موقع ہاتھ لگا بول اٹھا کہ مہاراج دونوں نائک یگانہ روزگار ہیں اس کا گانا بجانا تو روز سنتے ہی ہو، ان دونوں میں بڑا اور چھوٹا کوئی نہیں دونوں برابر ہیں۔ راجہ اور رانی نے کہا کہ ہاں یہ صحیح ہے بدوشک نے کہا کہ میں تو بڑا اس کو کہوں گا جس کا شش بھی ایسا ہی راگ ودیا کا واقف ہو جیسا کہ وہ آپ ہے کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ آپ بہت بڑا راگی ہو مگر شاگردوں کو نہ سکھا سکے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ تو گا نہ سکے لیکن سکھانے میں استاد ہو۔ راجہ نے رانی کی طرف دیکھا۔ گن داس کو ملاویکا پر ناز تھا اور جانتا تھا کہ ہروت کا کوئی شاگرد اس کا مقابلہ نہ کر سکیگا۔ اس لئے تڑپ کر بولا کہ مہاراج برہمن دیوتا نے سچ کہا اسی بات پر فیصلہ ہو جائے۔ گن داس عمر میں ہروت سے بڑا تھا۔ اس لئے اس کے گلے میں وہ رس نہ تھا جو نوجوان ہروت کی آواز میں تھا۔ ہروت جانتا تھا کہ آواز کا اثر ضرور ہوگا اور میدان میرے ہاتھ میں رہے گا۔ لیکن اب بات ہی کچھ اور ہوگئی۔ اس کے شاگرد بھی راگ کے اچھے واقف تھے اور اسے ملاویکا کا حال معلوم نہ تھا اس لئے چار و ناچار ماننا پڑا کہ شاگردوں کا مقابلہ ہو جائے۔ اب جھگڑا اس بات پر شروع ہوگیا کہ پہلے کس کے شاگرد میدان میں آئیں۔ دوشک نے کہا کہ گن داس عمر میں بڑا ہے اس لئے وہی اپنا شاگرد پیش کرے۔ گن داس نے رانی کو کہا کہ ملاویکا کو بلوائیے وہ آئے گائے اور نرت بھاؤ دکھائے۔ رانی گھبرائی لیکن سبھا میں کچھ بنائے نہ بنا ناچار "ملاویکا" کو بلوایا، وہ آئی اور زیور اور ایسی پوشاک میں کہ تمام دربار سناٹے میں آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندر کے اکھاڑے میں کوئی اپسرا اتر آئی۔ گن داس نے ساز چھیڑا۔ طبلہ پر تھاپ پڑی، اور ملاویکا نے بین کے ساتھ سر ملایا اور "سورٹھ" میں گائی اور اس کے بولوں میں یہ بھی جتا دیا کہ کتنی مصیبت کے بعد آج اس کے درشن ہوئے جیسے آنکھیں دیکھنے کے لئے ایک مدت سے ترس رہی تھیں، اب جبکہ یہ موہنی مورت آنکھوں میں بس چکی تو دل کو بھی چین ملا۔ اگنی متر نے خیال کیا کہ یہ تو میرے ہی دل کا حال کہہ رہی ہے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس کا دل بھی کچھ میری طرف مائل ہے۔ "استھائی" کے بول کا مطلب تو راجہ سمجھ گیا۔ لیکن یہ نہ سمجھا کہ ملاویکا دل گداز سروں میں آپ بیتی سنا رہی ہے، جب ملاویکا نے انترہ اٹھایا اور سبھا منڈل رسیلی سروں سے گونجنے لگا تو کسی کو کچھ سدھ بدھ نہ رہی۔ انترہ کے بولوں میں ملاویکا نے یہ کہا کہ اب ایک دفعہ دیکھ لیا تو کیا دل بیقرار کو ہمیشہ کیلئے تسکین ہوگئی

جب تک موہنی صورت سامنے ہے تب تک چین رہے گا اس کے بعد آتش شوق تیز تر ہو گی۔ میں اس کے تصور سے دل بہلا سکتی لیکن اب جبکہ میں نے اسے کچھ دُور سے دیکھ لیا تو دل یہ چاہتا ہے کہ قریب اور قریب تر ہو جاؤں اور دل سے دل جا ملے اور پھر جدا نہ ہو"۔ باتوں باتوں اور رقص میں "ارتھ" اور "بھاؤ" (آنکھوں کے اشارے) اور "کشاکش" (سینہ کی اکڑ) اور "نو رس" (سنگار رس، بیر رس، کُرنا رس، اَو بُد رس، شانت رس، بھیانک رس، بی بھتس رس، رودر رس، ہاسیہ رس) میں چتر ملاویکا نے سب کچھ کہہ دیا، ہر طرف واہ واہ کا شور و غل ہوا، گن داس پھولا نہ سماتا تھا اور بار بار اپنے حریف کی طرف دیکھتا اور کبھی راجہ اور رانی کی طرف دیکھ کر اشارہ کرتا کہ دیکھتا، بھلا اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے، اگرچہ رانی کو گن داس کی فتح کا یقین ہو گیا لیکن وہ تاڑ گئی کہ ملاویکا راجہ کے دل پر قبضہ جما چکی ہے۔ اس لئے گھبرائی لیکن موقع و محل دیکھ کر ملاویکا کی تعریف کی اور گن داس کے گن گانے لگی۔ رقص و سرود ختم ہوا تو ملاویکا اب زیادہ ٹھیر نہیں سکتی تھی۔ لیکن گوتم برہمن راجہ سے وعدہ کر چکا تھا کہ ملاویکا کو جی بھر کر دیکھ لینا۔ اس لئے بول اٹھا کہ کچھ شک نہیں کہ ملاویکا نے اپنے ہنر کا کمال دکھایا مگر میں نے ایک بے قاعدگی دیکھی ہے اور (راجہ کی طرف دیکھ کر) ضرور دوسرے بھی تاڑ گئے ہوں گے، حاضرین نے کہا کہ کوئی بے قاعدگی ہم نے نہیں دیکھی، اگنی متر نے کہا کہ "پروت" سے پوچھو میرا خیال ہے کہ وہ بھی دوسروں کے ساتھ ملاویکا کی تعریف میں ہمنوا ہو گا۔ رانی نے ناک بھوں چڑھائی کہ گوتم کو کیا معلوم کہ راگ وِدیا کیا ہے۔ اس مسخرے کو تو جاو بیجا دل لگی سوجھتی ہے، گن داس سخت پریشان ہوا اور گوتم سے پوچھا کہ مہاراج آپ ہی بتائیے کہ کیا بے قاعدگی دیکھی؟ گوتم نے کہا کہ حیرانی کی بات ہے کہ سب یک زبان ہو کر کہہ رہے ہیں کہ کوئی بے قاعدگی نہیں ہوئی۔ حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ کوئی کام شروع کرنے سے پیشتر برہمن کو نذر نیاز دینی چاہیئے اور یہی بے قاعدگی اب بھی ہوئی، راجہ اور رانی اور حاضرین دربار مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ملاویکا اور گن داس کی جان میں جان آئی۔ رانی نے گلے کا ہار اور راجہ نے موتیوں کی مالا نذر کی، گن داس اور ملاویکا نے پاؤں لئے۔ گوتم نے کہا کہ یہ رسم سب سے پہلے ادا ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن خیر، ہو تو گئی، دربار برخواست ہوا، اور ملاویکا رانی اور گن داس اور کوسکی کے ہمراہ چلی گئی اور اگنی متر کو ایسا معلوم ہوا کہ سورج ڈوب گیا اور سب طرف اندھیرا چھا گیا۔

رانی تو پہلے ہی تاڑ گئی تھی اب اسے یقین ہو گیا کہ ضرور راجہ کا دل ملاویکا پر آ گیا ہے اس لئے ایسا انتظام کیا کہ راجہ کے سامنے جب وہ محل میں ہو ملاویکا نہ آئے۔ اور کوئی ملاویکا کا نام تک نہ لے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ اداس رہنے لگا۔ ایک دن گوتم کو کہا کہ یار تم نے اپنا وعدہ خوش اسلوبی سے پورا کیا اب تم ہی مریض محبت کا علاج کرو، گوتم نے کہا کہ میرے پاس ایسی رسائی ہے کہ یہ مالنخولیا فوراً دُور ہو جاتا ہے، چٹ سے منگنی اور پٹ سے بیاہ، راجہ نے آہ سرد بھر کر کہا کہ

رانیوں کو تم جانتے ہی ہو، اگر یہ بات میرے بس کی ہوتی تو پھر کیا تھا۔ اچھا دوست کسی طرح اتنا تو معلوم کرو کہ وہ بھی مجھے چاہتی ہے؟ گوتم نے کہا کہ بھلا یہ بھی کچھ پوچھنے کی بات ہے، راجہ اور راجگی کو کون نہیں جانتا۔ وہ ایک داسی اور تم راجہ۔ اسے اور کیا چاہئے رانی بننے کو کیا اس کا دل نہیں چاہتا۔ راجہ نے کہا کہ نہیں میں پوچھتا ہوں کہ اسے میری محبت ہے کہ نہیں۔ گوتم نے کہا کہ اس کا بھی تجربہ کرلو، راج پاٹ اپنے بیٹے واسومتر کو دیدو، اور سب کچھ تیاگ کر ملاویکا سے پوچھو کہ۔ موہنی یہ سب کچھ میں نے تیرے کارن کیا۔ اب بتا تو میری ہے یا کسی اور کی؟

واسومتر راجہ اگنی متر کا بیٹا رانی دھارینی کے بطن سے تھا اور اس وقت وہ "راجسوئیگم" کی تیاری میں معروف تھا۔ یعنی سپاہ کے ساتھ شاہی گھوڑے کے پیچھے جارہا تھا۔ گھوڑا جس جس راجہ کی ریاست سے گذرتا اگر راجہ گھوڑا پکڑ لیتا اور مقابلہ پر آمادہ ہوتا تو لڑائی کے بعد آگے بڑھتا اور راجہ کو قید و بند میں رکھتا جب تک وہ یہ تسلیم نہ کرلیتا کہ اگنی متر مہاراجہ رو ہیراج ہے اور کوئی راجہ مقابلہ نہ کرتا اور ویسے ہی مطیع ہوجاتا تو اسے اگنی متر کے ماتحت راجہ تسلیم کیا جاتا، گوتم نے جو اس وقت واسومتر کا نام لیا تو راجہ کو بیٹے کا خیال آیا۔ اور گوتم سے کہا کہ یار میں آج کل بہت پریشان ہوں۔ سنیاپتی ودربھہ کی طرف گیا ہوا ہے اور میرا بیٹا عرصہ سے مارا مارا پھر رہا ہے اور سب سے بڑھکر ملاویکا کا خیال لگا ہوا ہے، گوتم نے کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، سب کام اپنے اپنے وقت پر ہوجائیں گے، سردست ملاویکا کی مہم سر کرلو۔ باقی دونوں سنیاپتی اور ورسومتر نپٹ لیں گے۔ ہاں خوب آیا اور تم تو رانی ایراوتی کی دعوت بھول گئے ہوگے۔" راجہ چونک پڑا اور کہا کہ خوب یاد دلایا، مگر وہاں کیا خاک مزا ہوگا۔ گوتم نے کہا جو کچھ بھی ہو تمہیں چلنا چاہئے۔ غرض دونوں باغ کی طرف روانہ ہوئے۔ باغ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایراوتی ابھی تک نہیں آئی۔ گوتم نے کہا کہ یہ بھی اچھا ہوا۔ رانی خیال کرے گی کہ راجہ کو میرا کتنا خیال ہے کہ وقت مقررہ سے پہلے ہی آموجود ہوا، وہ یہ باتیں کرہی رہے تھے کہ دور سے ملاویکا آتی دکھائی دی۔ اکیلی سر جھکائے کسی سوچ میں آرہی تھی۔ راجہ اور گوتم دونوں ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہوگئے۔ اس کے بالکل قریب ایک "اسوک" کا پیڑ تھا۔ جو رانی دھارینی کو بہت محبوب تھا۔ رانی کو اس کا بہت افسوس تھا کہ بہار کا موسم گذر رہا ہے اور اس میں پھول نہ آئے، سنا ہوا تھا کہ اگر کسی سندر کنیا کا پاؤں اسوک سے چھوجائے تو اس میں پھول پات نکل آتے ہیں وہ آپ تو یہ تجربہ کر نہیں سکتی تھی ملاویکا کو کہا کہ اگر پیڑ پانچ دن میں پھول پتوں سے ہرا بھرا ہوجائے تو تجھے منہ مانگی مراد دوں گی۔ چنانچہ ملاویکا اسی غرض سے سیدھی "اسوک" کے پیڑ کے پاس آئی۔ یہ سمجھ کر کہ میں بالکل اس کی ہوا، ملاویکا خود بخود باتیں کرنے لگی۔ اور کہا کہ افسوس میں بھی کتنی دکھی ہوں اور سب سے بڑھ کر دکھ یہ ہے کہ

ایسے شخص کا خیال لگا ہوا ہے جو بہت بلند مرتبہ ہے اور میری وہاں تک رسائی نہیں "۔ گوتم نے چپکے سے راجہ کی چٹکی لی اور کہا کہ ،مبارک تمھاری محبت میں سرشار ہے ۔ ملاویکا اسی طرح اپنے دل سے باتیں کر رہی تھی لیکن ابھی تک راجہ کی تسلی نہ ہوئی کہ وہ اسے ہی چاہتی ہے ، اتنے میں " وکل ویلیکا " سنگار کا سامان لئے داخل ہوئی اور ملاویکا کو آراستہ پیراستہ کرنے لگی ، چونکہ گوتم نے اس سے ساز باز کر رکھی تھی اس لئے اس نے ملاویکا کو کہا " اچھی تم نے تو کمال کر دکھایا ۔ اس روز راجہ تمھاری ہی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا " اتنے میں ایراوتی اپنی سہیلی " نیتپونک " کے ساتھ باغ میں داخل ہوئی اور راجہ کو مقررہ جگہ پر نہ دیکھ کر ادہر ادُہر نظر دوڑائی تو ملاویکا اور " وکل دبیک " کو باتوں میں مشغول پاکر سہیلی کو کہا کہ آؤ چھپ کر ان کی باتیں سنیں ۔ چنانچہ دونوں ایک اور جہاڑی کی اوٹ میں ہوگئیں ۔ لیکن نہ راجہ کو اور نہ رانی کو معلوم تھا کہ ایک دوسرے کے قریب چھپا ہوا ہے ، ۔" وکل دمیک " کہلے لفظوں میں راجہ کا نام لے کر ملاویکا کو ابھار رہی تھی کہ اپنے دل کا حال کہئے ، اور ادِہر رانی جوشِ غضب میں بیتاب ہو رہی تھی ، پہلے پہل تو ملاویکا اپنے دل کا حال بیان کرتے ہوئے ہچکچاتی رہی ۔ لیکن آخر کار کہا کہ میرے نصیب ایسے کہاں کہ راجہ کی نظرِ عنایت میرے حال پر ہو ، اور جب مجھے پٹ رانی کا خیال ہوتا ہے تو دل لرز جاتا ہے ، جب " وکل ویلک " بناؤ سنگار سے فارغ ہوئی تو ملاویکا کو کہا کہ جسے تو چاہتی ہے وہ موجود ہے ، ملاویکا کے منھ سے بے اختیار نکلا " کیا راجہ ؟ وکل ویلک نے ہنستے ہوئے کہا نہیں یہ جھومر ، رانی ایراوتی مارے غصہ کے لال پیلی ہو رہی تھی ، لیکن اگنی مترا جامہ میں پھولا نہ سماتا تھا ، اور بیتاب ہو گیا کہ جہاڑی سے نکل کر ملاویکا پر ظاہر ہو جائے ، عین اس وقت ملاویکا نے " اسوک " کو اپنے دائیں پاؤں سے چھوا ۔ اتنے میں راجہ سامنے آگیا اور کہا کہ کہیں پاؤں کو چوٹ تو نہیں آئی ، ایراوتی لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئی ۔ راجہ نے کہا کہ جب سے میں نے تمھیں دیکھا ہے میرا نہال آرزو بھی اسوک کی طرح ہو رہا ہے اگر خرام ناز اجازت دے تو ایک ٹھوکر مجھے بھی لگاتے جاؤ ، شاید یہ بھی گل مراد سے سرسبز ہو ۔ اب ایراوتی کو تاب کہاں تھی ، بجلی کی طرح کوندی اور ان کے سر پر پہنچکر راجہ کو آڑے ہاتھوں لیا ۔ راجہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ۔ حیران تھا کہ کیا کہے ۔ کچھ بات بنائے بنتی نہ تھی ، آخر کہا کہ میں تو باغ میں دیر سے تمھارا انتظار کر رہا تھا ۔ جب تمھیں نہ دیکھا تو ادہر آنکلا ، یونہی دل لگی کی باتیں تھیں ، اس میں خفا ہونے کی بات ہی کیا ہے ، بھلا رانی جو کانوں سُن چکی اور آنکھوں دیکھ چکی تھی ۔ ان باتوں میں کب آنے لگی تھی ، خوب جلی کٹی سنائیں ، آخر راجہ پاؤں پڑا اور معافی مانگی لیکن رانی اب بھی نہ پسیجی اور راجہ کو اسی حالت میں چھوڑ کر بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی ۔ ملاویکا اور اس کی سہیلی نے جب دیکھا کہ رانی اور راجہ سرگرم گفتگو ہیں تو پہلے ہی کھسک گیئں ،

جب ایراوتی نے تمام حال دھارینی کو سنایا تو اس نے امراوتی کو خوش کرنے کے لئے ملاویکا اور اس کی سہیلی کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا اور محافظ کو تاکید کر دی کہ جب یہ انگشتری جس کا نگینہ سانپ بطور نشانی میری طرف سے نہ دیکھ لے ان کو رہا نہ کرے۔ جب راجہ نے سنا کہ میری وجہ سے دونوں پر یہ مصیبت آئی تو بہت پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اور گوتم کو کہا کہ اب ان کی رہائی کی بھی کوئی سبیل نکالو۔ گوتم نے کہا یہ کونسی مشکل ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ پٹ رانی کی ٹانگ میں درد ہے، بیمار پرسی ضرور ہے، وہاں تشریف لیجائیں۔ بندہ بھی ابھی ابھی پہنچا۔ راجہ سیدھا رانی کے کمرہ میں گیا۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور درد سے کراہ رہی تھی۔ راجہ نے وئید کو بلوایا اور اس سے باتیں کر رہا تھا کہ گوتم دوڑتا ہوا رانی کے کمرہ میں داخل ہوا اور ایک انگلی دکھا کر کہا کہ ابھی ابھی ناگ ڈس گیا۔ دیکھئے انگلی پر دانت کے دو نشان۔ گوتم نے سوئی سے دو نشان انگلی پر کرلئے تھے جن پر ایک ایک قطرہ لہو کا بھی نظر آرہا تھا۔ رانی نے وئید کو کہا کہ برہمن دیوتا کا پہلے علاج معالجہ ہونا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ سانپ کا زہر تمام بدن میں سرایت کرجائے۔ گوتم نے رانی کو دعائیں دیں۔ اور کہا اگر میں مرگیا تو میری بوڑھی ماتا کی رکھشا کرنا۔ راجہ اور گوتم اور وئید رانی سے رخصت ہوکر آگئے۔ رانی اور سب کو فکر دامنگیر ہوئی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد وئید جی کا آدمی آیا اور رانی کی خدمت میں عرض کی، گوتم کی جان کا خطرہ تو نہیں رہا۔ لیکن وئید جی کہتے ہیں کہ وہ انگوٹھی جس پر سانپ کی مورت ہے تھوڑی دیر کے لئے بھجدیں کیونکہ اس پر سانپ کا منتر پڑھ کر گوتم کی انگلی میں پہنائی جائے گی۔ اور اس کے بعد فوراً واپس کر دی جائے گی۔ رانی نے انگوٹھی دیدی اور تاکید کی کہ کسی اور کے ہاتھ نہ پڑے اور جب کام ہوجائے تو فوراً واپس لے آنا۔ انگوٹھی کا گوتم کے ہاتھ آنا تھا کہ سیدھا کال کوٹھڑی کی طرف گیا اور انگوٹھی محافظ کو دکھا کر ملاویکا اور اس کی سہیلی کو نکال لایا۔ اور باغ میں پہنچا۔ یہاں راجہ منتظر تھا۔ سہیلی تو ادھر ادھر ہوگئی۔ اور گوتم دروازہ پر نگہبانی کے لئے ٹھیر ارہا۔ بدقسمتی سے ایراوتی کو رہ رہ کر خیال آتا کہ میں نے ناحق راجہ کو برا کہا۔ مجھ سے گڑ گڑا کر معافی بھی مانگی مگر کرودھ کا بھوت میرے سر پر ایسا سوار تھا کہ میں نے پروا نہ کی۔ اپنی سہیلی "نیپونیکا" کو کہا کہ آؤ باغ کی طرف چلیں اور جہاں یہ واقعہ ہوا وہاں بیٹھ کر راجا کی مورتی کی پوجا کریں۔ مجھ سے بڑا پاپ ہوا کہ پتی کو منہ پر برا کہا۔ دونوں باغ کے دروازہ پر آئیں تو دیکھا کہ برہمن دیوتا سوئے ہوئے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سپنا دیکھ رہے ہیں کہ نیند میں باتیں کرتے ہیں، سنو تو کیا کہتے ہیں، گوتم "مالاویکا" کو کہہ رہا تھا کہ "تم جلدی ہی راجہ کی چہیتی رانی بن جاؤگی، اور ایراوتی کی جگہ تم ہوگی" ایراوتی کی سہیلی کو غصہ آیا۔ قریب ہی گوتم کی چھڑی پڑی تھی۔ اٹھا کر گوتم پر پھینک دی۔ گوتم چونک اٹھا اور گھبراہٹ میں خیال کیا کہ سانپ آگرا۔ اس لئے زور زور سے چلایا "سانپ سانپ" لیکن فوراً اسے اپنی غلطی معلوم ہوگئی تو خوب ہنسا۔

اور کہنے لگا، میں نے تو خیال کیا کہ پہلے تو سانپ کے کاٹنے کا ہی بہانہ تھا اس کے سچ مچ سانپ نے کاٹا۔ مگر چترگندری، ایراوتی
اور اس کی سہیلی پر جب یہ انکشاف ہوا تو ہکی بکی رہ گیئں اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگی۔ لیکن ان کی حیرت کا کون اندازہ
کر سکتا ہے جب خود راجہ اور مالاویکا کو دروازہ کی طرف تیز قدمی سے آتا دیکھا۔ سانپ سانپ کے شور و غل نے راجہ کو اس
طرف متوجہ کیا اور مالاویکا راجہ کو کہہ رہی تھی کہ مہاراج سانپ کے نزدیک نہ جانا، ایراوتی آپے سے باہر ہوگئی۔ اور راجہ کو
کہا کہ دھن ہو مہاراج دن دھاڑے یہ سازشیں آپ کو زیب دیتی ہیں، راجہ کے تو اوسان خطا ہوگئے۔ لیکن عین میں اس وقت
ایک طرف سے شور و غل کی آواز سنائی دیا کہ راجہ کی بیٹی واسولکشمی بندر سے ڈر کر بھاگی اور گر پڑی راجہ تو اس طرف
دوڑ آگیا اور یہ مجمع بھی منتشر ہوگیا۔ اب مالاویکا کا ماتھا ٹھنکا کہ رانی دہارینی کو جب یہ حال معلوم ہوگا تو پرماتما جانے
کیا کرے گی۔ لیکن یاد آیا کہ رانی نے وعدہ کیا تھا کہ اگر پانچ روز تک "اسوک" کے پھول نکل آئے تو منہ مانگی مراد پوری
کروں گی۔ اس لئے سیدھی اس پیڑ کی طرف آئی، اور باغ باغ ہوگئی۔ آج چوتھا روز تھا اور اسوک کے پھول نکل رہے
تھے۔ رانی کو ایراوتی نے سب حال بتا دیا۔ دہارینی نے کہا کہ رانی جسے پیا چاہے وہی سہاگن ہو اس طرح بدمزگی
پیدا کرنے سے کیا حاصل۔ اگر راجہ چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ جب راجہ نے تم سے بیاہ رچایا تو میں نے کیا کر لیا۔ اب اگر
بدھ مالاویکا کو چاہتا ہے تو ہم دونوں اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ ابھی تک تو خیر ہے کہ راجہ ہماری ہر طرح دلجوئی کرتا ہے۔
رانی ایراوتی کو سمجھا رہی تھی کہ کوسیکی داخل ہوئی اور رانی کو کہا کہ میں ابھی باغ سے آرہی ہوں، اسوک پھول نکال رہا ہے۔
رانی یہ سن کر اچھل پڑی اور ایراوتی کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ بہن میں بچن ہار چکی اور پھر اسوک کے متعلق سب قصہ سنایا۔
بہتر ہے کہ ہم خود راجہ اور مالاویکا کا ملاپ کرا دیں۔ کیونکہ ہم نہ کرائیں تو ہو کر رہے گا۔ ایراوتی بھی سمجھ گئی کہ رانی سچ کہتی ہے
اس لئے رانی کو کہا کہ اچھا تم ہی اس کا انتظام مناسب کرو۔ دہارینی نے راجہ کو کہلا بھیجا کہ مہاراج آپ اور مالاویکا اور گوتم اور
جس کو آپ ہمراہ لانا چاہیں باغ میں آئیں اسوک پھول نکال رہا ہے۔ تین روز میں پھولوں سے لدا ہوگا۔ اسی پیڑ کے نیچے وہ
بچن جو میں مالاویکا کو دے چکی ہوں پورا کروں گی۔ رانی ایراوتی بھی اس پر رضامند ہے جب راجہ کو یہ پیغام ملا تو باچھیں کھل گئیں۔

ان تین دنوں میں اور بھی انکشاف ہوا۔ دو عورتیں مہارانی دہارینی کے پاس آئیں اور بیان کیا کہ جب مادھوسین
قید ہوگیا تو ہم بھی جدھر منہ اٹھا بھاگ نکلیں۔ آخر مختلف مقامات سے ہوتے ہوتے یہاں پہنچی ہیں، وہ یہ کہانی سنا رہی
تھیں کہ کوسیکی اور مالاویکا داخل ہوئیں دونوں نے ان کو پہچان لیا اور کوسیکی اور مالاویکا نے بھی پہچانا کہ اپنی ہی سہیلیاں
تھیں گلے مل کر روئیں اور دل کی بھڑاس نکالی۔ مہارانی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر سمجھ نہ سکی کہ مہادیوسین کے محل میں
رہنے والیوں سے کوسیکی اور مالاویکا کا کیا تعلق ہے۔ کوسیکی نے شروع سے آخر تک تمام ماجرا سنایا تو مہارانی اٹھی اور

مالاویکا کو گلے لگایا اور کوسیکی کو ملامت کی اب تک مجھ سے اصل حال کیوں نہ سنایا۔ مجھ سے بہت کچھ بدسلوکی ہوئی۔ بہن مجھے معاف کرنا مجھے خبر نہ تھی تم تو پہلے ہی مہاراج کی منگیتر ہو۔ دوسرے روز رانی کو ایک اور خوش خبر ملی کہ اس کا لڑکا واسومتر فتح و خوشی کے شادیانے بجاتا ہوا (اسپ) کے ساتھ بخیریت واپس آگیا ہے اور مہاراج ادہیراج نے سب کو دعوت دی ہے کہ "یگ" میں آکر شامل ہوں۔ تیسرے روز سنیاپتی کا فتح نامہ راجہ کو ملا کہ ودربھہ فتح ہوگیا اور یگین سین گرفتار ہوگیا۔ مہادیوسین رہا ہوچکا ہے اور اس فتح نامہ کے ساتھ ہی ودسیا میں پہنچ جائیگا۔ چنانچہ عین اس وقت کہ یہ سب "اسوک" کے نیچے جمع تھے مادھوسین پہنچ گیا۔ اور مالاویکا کا بیاہ راجہ سے دھوم دھام سے رچایا گیا۔

کیف تغزل

جناب سید مراد علی صاحب طالع

معشوق ہو پہلو میں ہوتی رہے مے نوشی — رنج غم فرقت سے حاصل ہو سبک دوشی

نام اس کا محبت ہے انصاف سے کہدیجئے — مجھ سے تو عداوت اور غیروں سے ہم آغوشی

دے پیر مغاں مجھ کو وہ جام مئے الفت — اترے نہ نشہ جس کا ہر دم رہے مدہوشی

دل لیکے کبھی مجھ سے وعدہ تو وفا کرتے — لازم یہ نہ تھی تم کو احسان فراموشی

بھولے سے بھی اب تم کو طالع نہیں یاد آتا — الفت اسے کہتے ہیں اللہ رے فراموشی

جن معاونین کرام کا چندہ اس پرچے کے ساتھ ختم ہو رہا ہے اسی پرچہ میں ایک سرخ اطلاعنامہ بھی چسپاں ہے کہ آئندہ اپنی خریداری کیلئے اس عرصہ میں سوچ لیں۔ ہم بے انتہا ممنون ہوں گے اگر آپ اپنے ارادہ سے مطلع فرمائیں ورنہ خاموشی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ آئندہ خریداری منظور ہے اس لئے **خورداد** کا پرچہ وی۔پی کیا جائے گا۔ براہ کرم وی۔پی واپس کرکے دفتر کو نقصان نہ پہنچائیے۔ اس زمانۂ جنگ میں ایسے نقصانات ناقابل برداشت ہیں۔ فرصت نہ ہو تو آپ اپنے ملازم یا کسی اور سے کہدیجئے کہ عدم خریداری کی اطلاع دفتر کو دیدے تو ہم اس نقصان سے محفوظ رہیں گے۔

نقد و نظر

جناب عطارد صاحب

مولانا حسرت موہانی بی۔ اے۔ یل۔ یل۔ بی۔ علیگ ایک ذی علم فاضل اور سیاس ہونے کے علاوہ شاعر ہونے کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں کچھ دنوں سے آپ کا قیام حیدرآباد میں ہے یہاں کے اکثر مشاعروں میں بھی آپ نے شرکت فرمائی شائقین ادب کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ بدقسمتی سے ہم کو کبھی آپ کا کلام سننے یا دیکھنے کا موقع نہ ملا مگر اب جو رسالہ سب رس بابتہ ماہ ڈسمبر ۱۹۴۲ء میں آپ کی ایک غزل طبع ہوئی تو ہم نے بڑی دلچسپی سے اوس کو پڑھا اور بار بار پڑھا۔ اصناف سخن میں غزل حسن و عشق کے راز و نیاز اور مضامین سوز و گداز کے لئے مختص تھی مگر رفتہ رفتہ ہر قسم کے مضامین اس میں شامل ہوتے گئے چنانچہ مولانا کی اس غزل میں بھی تعزل سے بڑھکر تصوف کا رنگ غالب ہے۔ مولانا کے علم و فضل سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن ادب و شعر کے نقطہ نظر سے مولانا کے بعض تخیلات اور استعمال الفاظ و محاورات کی صحت میں ہم کو شبہ ہو رہا ہے جس کو ہم ارباب ذوق کے ملاحظہ میں پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

تو دور ہے اور تجھ کو بھلایا نہیں جاتا   دامن ترے ہاتھوں سے چھڑایا نہیں جاتا

مصرعہ اولیٰ میں حرف عطف "اور" کا استعمال بے محل ہے "اور" وصل کے واسطے آتا ہے جبکہ دو جملوں یا لفظوں کی حالت میں یکسانیت ہو یہاں تو دو جملوں میں مغایرت ہے اس لئے یہ موقع عطف استدراک کے استعمال کا ہے مثلاً "تو دور ہے لیکن تجھ کو بھلایا نہیں جاتا" دامن چھڑانا اردو میں ایک محاورہ ہے جو بطور کنایہ بری الذمہ۔ علیحدہ یا جدا ہونے کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ؎

دامن چھڑا کے جب سے گیا ہے وہ بیوفا   دانتوں سے کاٹتا ہوں میں بے اختیار ہاتھ   (آتش)

مصنف نے محاورے میں تصرف کرکے "دامن ہاتھوں سے چھڑایا" کہا ہے جس کی وجہ اب وکنایہ نہیں رہا اوس کے حقیقی معنی ہی لئے جائیں گے۔

یہ تو لفظی بحث تھی معنوی حیثیت سے دیکھا جائے تو معشوق کی دوری مستلزم فراموشی نہیں ہو سکتی۔ ؎

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار   جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

حقیقت میں وہ عاشق ہی نہیں جو معشوق کو بھول جانا چاہے۔ عاشق کا دامن معشوق کے ہاتھوں میں ہے اور گرفت بھی ایسی مضبوط کہ "چھڑایا نہیں جاتا" تو ایسی حالت میں دوری کہاں رہی۔ ہندی شاعر تلسی داس نے اس معنی کو

کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ ؎

ہاتھ چھڑائے جات ہو نبل جان کر موہے ہردے میں سے جائے گو تو مرد بد ہونگی توے

مخاطب شاہد حقیقی فرض کیا جائے تو اس حال میں بھی اوس کو دُور نہیں کہہ سکتے وہ تو رگ جان سے بھی قریب ہے مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

جان بتو نزدیک وتو دوری ازو قرب حق را چون بدانی اے عمو
آنکہ حق است اقرب از حبل الورید تو فگندی تیر فکرت را بعید

اس تعبیر سے نہ صرف مصرعۂ ثانی بلکہ پورا شعر مہمل ہو جاتا ہے۔

ہر آنکھ سے پوشیدہ نہیں حالِ محبت ہر آنکھ کو یہ حال دکھایا نہیں جاتا

" ہر آنکھ سے حال محبت پوشیدہ نہیں " یعنی ہر آنکھ حالِ محبت سے واقف ہے دیکھ رہی ہے لہذا مصرعۂ ثانی بیکار ہو گیا " حال محبت " جس سے پوشیدہ نہیں اوس سے کہنا کہ " حال محبت تجھ کو دکھایا نہیں جاتا " بے معنی بات ہے۔ " آنکھ کو دکھانا " اُردو کی بول چال نہیں آنکھ خود ہی دیکھتی ہے۔ " آنکھ کو دکھانا " صحیح نہیں۔

ہر رند نہیں تشنہ لب جام محبت ہر رند کو یہ جام پلایا نہیں جاتا

یہ شعر بھی اوسی قبیل کا ہے جیسا کہ اوپر کا شعر " ہر رند تشنہ لب جام محبت نہیں " یعنی طالب یا شائق جام محبت نہیں تو پھر " ہر رند کو پلایا نہیں جاتا " کہنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ شراب محبت ایسی چیز تو نہیں جو کسی کو جبراً پلائی جائے۔

بیوجہ نہیں حُسن حجابات حرم میں اور ذوقِ طلب یوں ہی بڑھایا نہیں جاتا

" حجابات " جمع ہے حجاب کی " حجابات حرم " وہ پردے جو خانۂ کعبہ پر پڑے رہتے ہیں۔ " حجابات حرم میں حُسن بیوجہ نہیں " یعنی حرم کے پردوں میں خوبصورتی بیوجہ نہیں یہ مہمل ہے کیونکہ اس مصرعہ سے حجابات حرم میں حسن بیوجہ پوشیدہ نہیں ہے کا مطلب ظاہر نہیں ہوتا۔ قطع نظر اس کے حُسن کا لفظ مادی اشیا کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے تجلی یا نور کے معنوں میں اس کا استعمال جائز نہیں۔ مصرعۂ ثانی کا آغاز حرف عطف " اور " سے قطعاً غلط ہے یہ مصرعہ جملہ معللہ کا جزو ہے اس کا آغاز حرف عطف سے نہیں ہو سکتا لہذا اس لئے۔ اس لئے کہ یا کیونکہ میں سے کسی ایک لفظ کے ساتھ اس کو شروع کرنا چاہئے۔ اس شعر کی نثر کرنے سے میرا مطلب واضح ہو سکیگا " حجابات حرم میں حسن بیوجہ نہیں کیونکہ ذوق طلب یوں ہی بڑھایا نہیں جاتا " مصرعۂ ثانی میں " یوں ہی " کا لفظ آیا ہے یہ لفظ یوں ہی اور یونہیں دونوں طرح سے مستعمل ہے اس کے ایک معنی ہیں اسی روش پر یا اسی طرح ؎

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہل جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

محاورے میں دوسرے معنی بیوجہ کے بھی ہیں۔

یُو نہیں دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا کہ عدو کو میرے یارب ملے میری زندگانی (غالب)

دونوں معنی بھی یہاں چسپاں نہیں نتیجہ یہ کہ باعتبار الفاظ۔ طرز بیان اور معنی و مفہوم شعر مہمل ہو کے رہ گیا۔

بربادئی دل عشق میں دیکھی نہیں جاتی نقش تمنا ہے مٹایا نہیں جاتا

"نقش تمنا" سے مراد عشق ہے لہذا اوس کے بعد "ہے" کا لفظ مخل معنی ہے (بھی) ہونا چاہیئے۔ معنا یہ تخیل بھی صحیح نہیں عاشق کو "بربادئی دل" سے خوف یا ہمدردی نہیں ہوسکتی وہ تو اسی میں فنا ہونے کو اپنی خوش بختی سمجھتا ہے یہ رتبہ سب کو نصیب نہیں ہوتا۔

معجز نگر کہ کشتہ شمشیر عشق یافت مرگے کہ زندگان بدعا یاد می کنند

عاشق کی موت اور بربادی کو عالم اجسام کی موت اور بربادی پر قیاس نہیں کرسکتے۔ عشق میں مرمٹنا ایک طرف جس سے "بربادئی دل" دیکھی نہیں جاتی اور "نقش تمنا" بھی مٹایا نہیں جاتا اوسی کو بوالہوس کہتے ہیں۔

دیوانگی جوش محبت کا گلہ کیا دیوانہ کو جب ہوش میں لایا نہیں جاتا

جوش محبت کی دیوانگی سے مراد عشق ہے اور جوش محبت کا دیوانہ عاشق۔ محبت کا دیوانہ یعنی عاشق "ہوش" میں آگیا تو رہا کیا باقی گویا محبت جاتی رہی لذت عشق سے محروم ہوگیا۔ دیوانہ کو عاقل بنانا کہتے ہیں دیوانہ کے مقابلہ کا لفظ عاقل ہے نہ کہ ہوش۔ بیہوش کو ہوش میں لانا تو بولتے ہیں مگر دیوانہ کو ہوش میں لانا نہیں کہتے۔ "جوش محبت کا دیوانہ" تو "دیوانہ بکار خود ہشیار" کی مصداق ہے۔

سو زخم بھلا دیتا ہے انسان جہاں میں اک زخم مگر دل کا بھلایا نہیں جاتا

زخم کی تکلیف بھولنا یا بھلانا تو کہتے ہیں مگر "زخم بھلانا" غلط ہے۔ "سو زخم" بھی صحیح نہیں اس سے تعداد ظاہر ہوتی ہے حالانکہ مقصد اقسام بتانا ہے اس لئے سو طرح کے زخم کہنا چاہیئے۔ "دل کا زخم" کنایہ ہے ناقابل برداشت مصیبت آفت یا مرگ محبوب کے۔ تیر نظر سے گھائل ہونے کا کنایہ اوس وقت ہوگا جب کہ اوس کا قرینہ ہو یہاں ایسا کوئی قرینہ نہیں۔ جہان اور دنیا مترادف الفاظ ہیں مگر اردو میں ایسے موقع پر جیسا کہ اس شعر میں ہے دنیا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

ہر لحظہ تری یاد سے بڑھتی ہے خلش اور اور بھولنا چاہیں تو بھلایا نہیں جاتا

لفظ "اور" کا اس طرح متصل استعمال خلاف فصاحت ہے "خلش" حاصل بالمصدر ہے خلیدن سے جس کے معنی ہیں تکلیف ایذا کھٹک۔ سے

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو ۔۔۔ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا (غالب)

کیا محبوب کی یاد سے عاشق کو ایسی تکلیف ہوسکتی ہے جو وہ اس تکلیف کی وجہ محبوب کی یاد ہی کو دل سے بھلادینا چاہتا ہے۔

پنہاں نہیں رہتا نگہ حسن سے حسرت ۔۔۔ وہ راز محبت جو بتایا نہیں جاتا

"حسن" کے معنی ہیں خوبی یا خوبصورتی "نگہ حسن" یعنی خوبصورتی کی نگہ یہ غلط اور بے معنی ہے نگہ ناز یا نگہ یار کہتے تو مصرعہ بامعنی ہوتا "راز محبت بتانا بھی صحیح نہیں راز محبت یا راز عشق کہلنا یا راز کی بات بتانا مستعمل ہے۔

اے ذوق اپنا سب پہ کھلے کیوں راز عشق ۔۔۔ ہر نالہ اک کلید درگنج راز ہے

شاعر سے خطاب

جناب سید محمد حسین صاحب آزاد حیدرآبادی

او شاعر زمانہ! دنیا میں ہیں بلائیں ۔۔۔ دنیا تمھارہی ہے ظلم و ستم جفائیں

تیری خیالی دنیا! دنیا سے کیا الگ ہے؟ ۔۔۔ بکتا رہے گا کب تک؟ تو آئیں بائیں شائیں

دلدادہ تو خیالی دلبر ترا خیالی ۔۔۔ گویا ہیں سب خیالی انداز او ادائیں

کھویا ہوا ہے بالکل اپنے خیال میں تو ۔۔۔ کھول اپنی آنکھ دم بھر دیکھ اپنے دائیں بائیں

تو بھی تو آدمی ہے اوروں کی بے خبر اب ۔۔۔ ہیں آدمی وہی جو اوروں کے کام آئیں

لفظوں میں تو پھنسا ہے معنی سے بے خبر ہے ۔۔۔ معنی اگر نہوں کچھ کیا لفظ رنگ لائیں

تو ہے خطا کا پتلا تیرا کلام باطل ۔۔۔ ہاں وہ کلام حق ہے جس میں نہوں خطائیں

اس میں کمال کیا ہے؟ یہ بھی کمال ہے کچھ ۔۔۔ اشعار تیرے شاعر کیا رنڈیاں ہی گائیں

اشعار تیرے گندے اور منہ بھی ان کے گندے ۔۔۔ ان گندگیوں سے بس گندے ہی لطف اٹھائیں

اخلاق کی تباہی اعمال کی خرابی ۔۔۔ کرنی ہے جن کو حضرت! وہ رنڈیاں نچائیں

کہتا ہوں میں ادب سے یاں شاعری نہ کیجئے ۔۔۔ ہاں بھاڑ جھونکنے کو دلی میں آپ جائیں

نوجوانوں سے خطاب

جناب نور الحسن صاحب بی۔ اے، بی، ٹی (علیگ) ڈپ۔ ایڈ (گلاسگو)

کامیابی کی تمنا کس کو نہیں ہوتی۔ لیکن اس تمنا کے پورا ہونے کے لئے جن خوبیوں پر عمل کرنے اور جن خرابیوں سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے ان سے کم لوگ واقف ہیں اور اگر جانتے بھی ہیں تو ان پر عمل کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ عزت اور حکومت کی آرزو کس کے دل میں نہیں ہوتی لیکن اس بلندی پر پہنچنے کے لئے جن دشوار گذار راستوں کو طے کرنا اور مصیبتوں کی جن سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا ہے ان کے لئے تیار ہونا بہت مشکل ہے دولت کے خواب کون نہیں دیکھتا۔ لیکن ایسے خواب صرف دماغی پریشانی کا نتیجہ ہوتے ہیں اور بہت کم سچے نکلتے ہیں۔ نام اور شہرت کی تلاش میں کون سرگرداں نہیں ہے۔ لیکن اس کمیاب موتی کو پانے کے لئے مصیبتوں کے سمندر میں غوطہ لگانا پڑتا ہے جس کی موجوں کے تصور سے بھی دل کانپ اوٹھتے ہیں۔ آرام کی خواہش کس کو نہیں لیکن آرام حاصل کرنے سے پہلے جن بے آرامیوں کو سہنا پڑتا ہے ان سے کم ہمت جان چراتے ہیں۔ کامیابی کا گلدستہ بنانے کے لئے جن پھولوں کے چننے اور جن کانٹوں سے بچنے کی ضرورت ہے یا جن کانٹوں سے گھائل ہونا پڑتا ہے ہم تمھارے سامنے ان ہی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ مقصد کے نایاب موتی نکالنے کے لئے جن طوفانی موجوں سے بچ جانا ضروری ہے اور تکلیفوں کی جن لہروں سے تم کو ٹکرانا لازمی ہے ان ہی کو بیان کرنا ہمارا مقصود ہے۔

سب سے پہلے خوب سمجھکر یہ فیصلہ کرلو کہ تمھیں کیا کرنا ہے اور کیا بننا ہے، پھر نڈر ہوکر لوگوں کی نکتہ چینی کی پروا کئے بغیر ایک سرفروش مجاہد کی طرح میدان عمل میں قدم رکھو اور اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے لگاتار کوشش کئے جاؤ۔ صحیح راستہ پر قدم رکھنے کے بعد لوگوں کی مخالفتوں سے ہرگز مت گھبراؤ۔ تکلیفوں سے ڈر کر قدم پیچھے ہٹانے کا خیال تک بھی دل میں نہ لاؤ بلکہ مصیبتوں کی وجہ سے ہمت میں زیادہ بلندی اور ارادہ میں زیادہ مضبوطی پیدا کرو۔

کامیابی کے لئے دھن کا پورا اور بات کا پکا ہونا ضروری ہے۔ ہمت و استقلال کی بدولت ناامیدیاں امیدوں سے بدل جاتی ہیں اور ناکامیاں کامیابی کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ ناکامی سے مت گھبراؤ کیونکہ راستہ میں ناکامیاں بھی انہیں کو پیش آتی ہیں جو عمل کے میدان میں مردوں کی طرح لڑتے ہیں۔ بغیر خطروں کے زندگی بےمزہ اور بے معنی ہوجاتی ہے۔ جب تک غوطہ خور جان ہتھیلی پر رکھ کر سمندر کی تہ میں غوطہ نہیں لگاتا، نایاب موتی

نہیں پاتا۔ ناکامی انہیں کو ہوتی ہے جو کسی کام کے کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر یاد رکھو کہ یہ ناکامیاں عارضی ہوتی ہیں۔ ان سے تمہاری قوت، ہمت، صبر اور استقلال کا امتحان ہو جاتا ہے اگر تم نے ناکامیوں کے باوجود ہمت نہ ہاری تو ضرور کامیابی کا انعام پاؤ گے۔

تم ارادہ کے پکے بنو اور استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ تمہارا ارادہ نہایت بلند ہونا چاہئیے کیونکہ جس کا ارادہ بلند ہوتا ہے اس کی ہمت بھی بلند ہو جاتی ہے۔ معمولی تکلیفیں اس کی نظروں میں نہیں سماتیں۔ لوگوں کی ملامتوں اور ان کے طعنوں کا خیال نہ کرو۔ جراءت اور ہمت سے کام لو اور آگے بڑھے جاؤ۔ اگر آج ہراس اور یاس کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہو تو یقین جانو کہ ہمت اور محنت کی بدولت کل کامیابی کے آسمان پر روشن ستارے بن کر چمکو گے۔

کامیابی کا یقین رکھو۔ تم ضرور کامیاب ہو گے۔ کیونکہ اسی یقین کے بعد وہ خصوصیات تم اپنے میں پیدا کرنے کی کوشش کرو گے جو کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ عزم، ہمت اور خود اعتمادی ترقی کے راز ہیں۔ ان رازوں کو پاکر تم آسانی سے کامیابی کا سراغ لگا سکتے ہو۔ مسلسل کوشش اور لگاتار محنت تمہاری قسمت کے معمار ہیں۔ جو تمہارے لئے کامیابی کا ایک شاندار محل چن کر تیار کر دیں گے۔

اچھی طرح یاد رکھو کہ جوانی ایک بے پناہ جوش کا نام ہے۔ اگر اس میں جمود پیدا ہوا تو تمہارے ولولے ماند پڑ جائیں گے نیک خواہشیں مٹ جائیں گی۔ تم وقت سے پہلے مرجھا جاؤ گے۔ جوانی کی کیفیتوں کو تحریر کے دائرہ میں نہیں لایا جا سکتا۔ سمندر کی زندگی طوفان، دریا کی زندگی روانی اور آگ کی زندگی جلنا جلانا ہے۔ ان کی فطرت بدلنے کی کوشش بیکار ہے بفرض محال ایسا ممکن بھی ہو تو سمندر سمندر نہیں رہتا، دریا دریا نہیں رہتا، اور آگ آگ نہیں کہلائی جا سکتی۔ اسی طرح اگر جوانی میں ولولے نہ ہوں، جوش نہ ہو، بلند ہمتی نہ ہو، نت نئی باتیں نہ سوجھیں تو وہ جوانی نہیں بلکہ اور کچھ بلا ہے لیکن اگر اس جوانی کو ضائع کیا گیا تو یہ جوانی تمہاری راحتوں کو ملیامیٹ کر دے گی۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ دنیا کی لذتوں کو چھوڑ دینا اور تارک الدنیا ہو جانا جوانوں کا مقصود ہونا چاہئیے بلکہ اس کے برخلاف میرے نزدیک دنیا کی لذتوں کو چھوڑ دینا آسان اور کم ہمتی کی علامت ہے۔ مرد وہی ہے جو پاکیزہ لذتوں کو حاصل کرے۔ خواہشوں کا مٹنا بلند ہمتی کی موت ہے مگر یاد رکھو کہ جوانی کی چند خواہشیں سراب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ تمہارا دل ضرور خواہشوں کا آماجگاہ اور تمناؤں کا مسکن ہونا چاہئیے لیکن وہ خواہشیں ایسی ہوں جن کو حاصل کرنے کے بعد تم کو پشیمان نہ ہونا پڑے، تمہارا ضمیر صاف، اخلاق وسیع، پیشانی شرمندگی کے پسینے سے پاک اور اطوار پسندیدہ ہونے چاہئیں۔

دائمی امن وسکون زندگی کی نہیں موت کی علامت ہے ۔ جمود کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے ۔ زندگی کا راز تغیر اور انقلاب میں پوشیدہ ہے ۔ دنیاوی تکلیفوں سے دوچار ہونا، مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا، رکاوٹوں کو دور کرنا، اور مشکلوں پر قابو پانا زندگی ہے ۔ دنیا کشمکش اور جدوجہد کا مقام ہے ۔ راحت وسکون کا گھر نہیں۔ یہاں کی ہر راحت میں کلفت پوشیدہ ہے اور یہاں کا ہر آرام تکلیف برداشت کرنے کے بعد ملتا ہے۔

جس طرح مختلف اعضاء کے کمزور ہونے سے انسانی جسم کی مشین خراب ہو جاتی ہے اسی طرح افراد کی کمزوریوں سے قوم کمزور ۔ اور پھر برباد ہو جاتی ہے ۔ قوم کے لئے جمود ایک گھن ہے جو زندہ کو نیم مردہ اور نیم مردہ کو مردہ کر دیتا ہے۔ اگر قوم کو تندرست اور طاقتور بنانا ہے تو اس کے افراد میں حرکت پیدا ہونی ضروری ہے تاکہ عزم، ہمت، تحمل اور جدوجہد کی اعلیٰ خوبیوں کی بدولت اور محبت، ہمدردی، مساوات، خود اعتمادی اور اتفاق کی عمدہ صفات کے ذریعہ سے نہ صرف افراد کی زندگی درست ہو جائے بلکہ مردہ قوم میں زندگی کی روح دوڑ جائے ۔

شروع سے ہی انسانیت کے بہی خواہوں نے مذہب اور اخلاق کے ذریعہ سے محبت، ہمدردی اور مساوات کا ہر زمانہ میں سبق سکھایا تھا لیکن غافل اور غرض مند دنیا نے اس کے بھلانے میں کمی نہیں کی ۔ عاجزی، نرمی، ہمدردی، محبت، مساوات، فرض شناسی اور اتفاق کی جگہ غرور، سنگ دلی، بیدردی، نفرت، فخر، غیر ذمہ داری اور نفاق کا دور دورہ ہو گیا۔

انسان کا پہلا فرض خود اپنے نفس سے جنگ کرنا ہے، ظاہر ہے نفس سے جنگ کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے یہ خدا کی راہ میں جہاد ہے ۔ جس میں سرخروئی حاصل کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ سچائی کے لئے تکلیفیں اٹھائی جائیں اور دوسروں کی خاطر اپنی ہستی کو مٹایا جائے ۔ غرضمند اور نفس پرست ضرور آڑے آئیں گے اپنی عیش و عشرت کی دنیا کو برباد ہوتے ہوئے دیکھکر انتہائی مخالفت کریں گے ۔ لیکن حق پرستوں کو خاموشی اور بے نیازی سے اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے اور یقین رکھنا چاہیئے کہ حق کی طاقت ایک نہ ایک دن باطل کو مٹا کر رہے گی ۔ ہوس پرست ہمیشہ مادی فائدہ کی تلاش میں رہتا ہے ۔ لیکن حق پرست نہایت بے غرضی کے ساتھ مخلوق کی خدمت میں مصروف رہتا ہے

کامیابی کے لئے خودداری اور خود اعتمادی نہایت ضروری اوصاف ہیں ۔ اگر تم میں یہ خوبیاں موجود نہیں ہیں تو تم کو باعزت زندگی ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی ۔ انسان وہی ہے جو اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کرے اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر سر بلند رکھے اگر دوسروں کے سہارے اور خاندانی وسیلہ سے عوام کی نظر میں عزت پا بھی لی تو خواص کی نظر میں اور بھی گر جاؤ گے ۔ چند روزہ آرام جس کے تم گرویدہ نظر آتے ہو فانی ہے ۔ ضمیر کو بیچ کر بے شرما

بن کر اور دوسروں کی خوشامد کر کے اگر دو روزہ زندگی عیش سے گذار بھی لی، تو خوب یاد رکھو کہ یہ زندگی چوپایوں کی زندگی سے بھی بدتر ہے۔ امیروں کے گھروں کے غلام بھی اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے ہیں لیکن ان کی زبانوں پر مہر لگی ہوئی ہوتی ہے۔ مجال نہیں کہ حق اور انصاف کی حمایت میں ایک لفظ بھی ان کی زبان سے نکل سکے۔ اگر شک بھی ہو جائے کہ وہ اپنے مالک کی ذہنیت کے خلاف خیالات رکھتے ہیں تو ان کی آفت آجاتی ہے۔ ان کا مالک شرابخوار عیاش اور ظالم ہی کیوں نہ ہو لیکن ان کا کام اس کے حکموں کی تعمیل کرنا ہے۔ خواہ وہ حکم کتنے ہی بیہودہ اور ظالمانہ کیوں نہ ہوں۔ ذرا غور تو کرو کہ ان غلاموں کی اور کتوں کی زندگی میں کیا فرق ہے۔

بربادی اور ذلت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس مادیت پرستی کے زمانہ میں انسان نے اپنی ضرورتیں بڑھالی ہیں اور غیر ضروری چیزوں کا محتاج بن گیا ہے۔ وہ اپنے نفس کی آزادی کو بیچ کر ان مصنوعی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ جن سے اس کے جسم کو وقتی طور پر آرام ملتا ہے لیکن حقیقی خوشی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ نئے نئے فیشنوں کو پورا کر کے لئے غریبوں اور بیکسوں کو لوٹتا ہے۔ قناعت ایسے لوگ جانتے ہی نہیں۔ صبر و رضا سے ایسے افراد بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ ان کی ہوس دن دونی اور رات چوگنی ہوتی جاتی ہے۔ ایک خواہش کی تکمیل پر دوسری خواہش پیدا ہو جاتی ہے یہ سلسلہ ختم ہونے نہیں پاتا یہاں تک کہ انہیں بیہودگیوں میں ان کی عمر ختم ہو جاتی ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ قوم اور ملک کی بھلائی چاہنے والے منچلے اور ذہین نوجوان جو سچائی کی خاطر ہر قسم کی قربانی کرنے کیلئے تیار نظر آتے تھے۔ آج بھیگی بلّی بنے ہوئے خاموش ہیں۔ کیوں؟ ان کے جوش و خروش کو کیا ہو گیا؟ آخر انھیں کون سا سانپ سونگھ گیا؟ ان کو اس جادو کے سانپ نے ڈس لیا جو دولت اور حکومت کی پاسبانی کرتا ہے۔ کل لوگوں کے دلوں میں ان کی حقیقی عزت تھی آج ان کی حیثیت بدل گئی چونکہ اب وہ سرمایہ دار کے کھلونے ہیں اور کٹھ پتلیوں کی طرح ان کے حکم پر ناچ رہے ہیں۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ انہیں عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کا شوق تھا اور اس کیلئے دولت والوں کی غلامی ضروری ہے۔ لہٰذا انھوں نے سچائی اور آزادی کو چھوڑ کر آرام کے ساتھ غلامی کی زندگی گذارنی شروع کر دی۔

خاص کرمداران سرکار عالی اور معاونین کرام کو اگر اندرون ۱۵ تاریخ کوئی پرچہ نہ ملے تو مکرر طلب کریں ورنہ اس کے بعد دفتر تعمیل فرمائش میں مجبور ہے۔

مضامینِ عظمت حصہ دوم

(۳)

اس سے پہلے مضامین حصہ اوّل اور سریلے بول، ارباب ذوق ادب کے مطالعہ سے گذر چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ ہے اون مضامین کا جو مختلف رسائل میں شائع ہو کر شہرت عام اور بقائے دوام کی سند حاصل کر چکے ہیں ان کی ادبی حیثیت کی نسبت اتنا کہدینا کافی ہے کہ اردو شاعری میں مرحوم نے جو بنیاد قایم کی اور اردو نثر میں جو اسلوب اختیار کیا تھا اوس کی تقلید کسی سے نہ ہوسکی۔

قدرۃ کی جانب سے اونہیں ایک جدت پسند دماغ ملا تھا وہ ہر کہنہ شراب کو نئے پیمانوں میں پیش کر کے دو آتشہ بنانا چاہتے تھے۔ اور اہل قلم کو مشورہ دینے اور اون کا دل بڑہانے میں کبھی چوکتے نہ تھے اون کا دیوان خانہ کیا تھا ایک خاصہ ادبستان تھا جہاں مختلف مسائل ادب پر نقد و بحث ہوتی رہتی تھی۔ اور ہر شخص آزادانہ بول رہا ہے وہ نئے الفاظ تراشنے میں اچھا ملکہ رکھتے تھے اردو میں (ماسٹر پیس) کا ترجمہ غالباً مہدی حسن افادی الاقتصادی نے اختراعات فائقہ کیا تھا اور یہ اردو میں چل نکلا۔ اس کے کچھ سال بعد میرے پاس ایک فارسی پرچہ آیا جس میں ماسٹر پیس کو 'شاہکار' لکھا گیا تھا جس کو پڑھکر مجھ سے رہا نہ گیا اور سید عا مرحوم کی خدمت میں پہنچا۔ جہاں مرزا رفیق بیگ اڈیٹر نمائش بھی بیٹھے تھے۔ میں نے پرچہ دیکھکر کہا کہ دیکھئے کتنا حسین لفظ ہے۔ مرحوم پھڑک اوٹھے اور خوب داد دی، مگر یہاں بھی ان کے جدت پسند دماغ نے چین نہ لیا۔ کہنے لگے۔ بھئی "شاہکار" تو اوس کو کہیں گے جو ہماری نگارشات میں بہتر ہو لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسی شاہکار میں ایک جملہ مضمون کی جان ہوتا ہے آخر اس کو کیا کہیں۔ چلئے بحث کا دروازہ کہل گیا۔ رفیق نے کچھ رہا اور میں نے کچھ مرحوم نے بھی دو چار لفظ انتخاب کئے پھر خود ہی اوس کی تردید کر دی تھوڑی دیر غور و فکر کے بعد قہقہہ لگا کر کہنے لگے کہ خوب لفظ ہاتھ آیا ہے ہم اس کو شہ پارہ کیوں نہ کہیں ہم نے بھی داد دی فرمانے لگے اب کی مرتبہ جو مضمون لکھوں گا اوس میں ضرور شہ پارہ ٹھونس دونگا۔ چنانچہ یہ لفظ اردو ادب میں رائج ہو گیا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ شہ پارہ کا خالق بجز مرحوم کے کوئی نہیں ہوسکتا۔

ایک اور واقعہ سنئے اگرچہ وہ دلّی کے تھے فطرۃً دلی کی زبان سے اونہیں محبت ہونی چاہئیے مگر وہ اردو کو پرانی ڈگر پر دیکھنے کے عادی نہ تھے الفاظ میں جدت اور اردو کو وسعت دینا چاہتے تھے اس لئے اون کے پیش نظر

ئے سے مطلب ہے کسی کی ہوا گرلائی ہوئی"۔ ذہین مرحوم حیدرآبادی جن کی نظمیں بچوں کے پند و نصائح کیلئے مشہور تھیں۔ ایک دفعہ خان صاحب کے پاس تشریف لائے اور بیان کیا کہ میں نے اپنی بعض نظموں میں گہانس کے ذخیرہ کو گری استعمال کیا ہے۔ لیکن مولانا طباطبائی نظم اس کے خلاف ہیں کہ یہ اہل زبان کا لفظ نہیں ہے تو خان صاحب فرمانے لگے کوئی وجہ نہیں کہ جب یہ لفظ ان عام معنوں میں بولا جاتا ہے اور ہمیں ایک اچھا لفظ ملتا ہے تو اس کے استعمال کو یہ کہکر جائز نہ رکھیں کہ اہل زبان ایسا نہیں کہتے یہ تو اردو کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ مرحوم ذہین نے آپ کے مشورہ پر عمل کیا تھا۔

مری کتاب "صنف نازک" پر جو دیباچہ لکھا ہے وہ خود اردو ادب کا نچوڑ اور روشن دماغی کا بہترین شاہکار ہے۔ عورت کی نسبت کیا خوب لکھا ہے "کروروں نظاہر رنگ و بو کا پھول ہے اور کروروں جذبات ارتقائی کا ایک مقناطیس ہے جس کی رسیلی آنکھ متوالا کرے۔ چوٹی کی ناگن ڈسے۔ ہونٹ کی رس بھری پھانک امرت پلائے۔ پھول سے نازک بدن کا لہراتا اتار چڑھاؤ مستی کا تموج بپا کرے۔ ملائمت اور گدراہٹ، لوچ اور گہلاوٹ تڑپا دے۔ اک اک ادا گویا ہوا کی ڈالیوں اور موجوں سے اٹکھیلیاں دل لبھائے۔ آنکھوں کی گہرائیاں۔ باتوں کی شوخیاں۔ مزاج کی رنگینیاں اور لاکھوں نفسیاتی لاینحل گتھیاں آپ کی ہستی کو موہ لیں بس اسی کا نام 'عورت' ہے۔

غرض مرحوم اردو زبان کو عالمگیر اور دلچسپ بنانا چاہتے تھے اون کی روشن دماغی اور آزادانہ خیالات اس کے بھی حامی تھے کہ عریاں سے عریاں واقعات کے اظہار میں مضمون نگار کو ہمیشہ آزاد خیال رہنا چاہئے مگر اسلوب بیان اتنا بلند ہو کہ سطحی دماغ اس کی نزاکت کو نہ سمجھ سکے چنانچہ اپنی شکل کا بھی اظہار کیا تھا۔

بہرحال اس قدر طوالت سے میرا مقصد یہ دکھانا ہے کہ مرحوم کس قدر بلند اور آزاد خیالات کے مالک تھے اور ان کے پیش نظر اردو کس قدر وسعت چاہتی تھی۔ مگر "موت کس کو رستگاری ہے" ہم بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ کاش کچھ روز اور جئے ہوتے تو آج آپ دیکھتے کہ اردو ادب ہر قسم کے لٹریچر سے مالامال دکھائی دیتا اس مجموعہ میں آپ وہی نوائے ترکیب جدت۔ اچھوتا پن دیکھیں گے کہ گویا مرحوم احباب میں بیٹھے ہنس بول رہے ہیں۔

بیگم عظمت اللہ خاں مرحوم اور ان کے صاحبزادہ قابل ستائش ہیں کہ مضامین کتابی صورت میں شائع کئے ہیں یہ ہمارا آپ کا کام ہے کہ اس کا خیر مقدم کریں اور ہر پڑھے لکھے گھر میں ایک ایک نسخہ رہے لکھوائی چھپوائی اچھی ہے۔ کتابت کی ناگوار غلطیاں تکلیف دہ ہیں۔ قیمت (عہ) مرحوم کے صاحبزادہ علی اسد اللہ خان صاحب بی۔ ایس۔ سی برکت منزل شگفتہ چمن حیدرآباد اور حیدرآباد بک ڈپو چادرگھاٹ حیدرآباد دکن سے مل سکیگی؛

'ب'

"لمحۂ زندگی"

جناب سید محی الدین احمد صاحب (عثمانیہ)

اس کی سنہری کشتی افق کے قریب تیر رہی تھی۔ اور میں وہیں دریا کے کنارے کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ خوف و دہشت کی حالت مجھ پر طاری تھی۔ جب مجھے یہ خیال گذرتا کہ اس کی کشتی بہتے بہتے افق کے سنہرے پہاڑوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی تو میں سر سے پیر تک کانپ اٹھتا۔ میں اپنے آنکھوں کی سنہری کرنیں اس کی کشتی کے تعاقب میں چھوڑی تھیں۔ لیکن آہ وہ اس کی کشتی سے ٹکرا کر ناکام واپس لوٹتیں میں وہاں کھڑا بے چین سا ہو گیا۔ لیکن رہ رہ کر وہ سکون و اطمینان کی دنیا میں بہہ رہی تھی۔

مجھے کہاں چین نصیب ہوگا۔ میرے چین اور سکون کی ساری راحتیں مجھ سے زبردستی چھینی جا رہی تھیں اور میں کسی کے پیچھے آوارہ پھر رہا تھا۔ میرے اس چھوٹے سے دل میں وہ کیا خلش ہوگی جو مجھے لئے یوں جنگل جنگل اس کے پیچھے آوارہ پھر رہی ہے۔ کاش! وہ میرے اضطراب خلش کی بے چینی و کسک کو محسوس کر سکتی۔ لیکن آہ میرے دل کی اتاہ گہرائیوں میں اس کی محبت صرف اس کی ہی پاک محبت پناہ گزین ہے۔ میں اضطراب و بے چینی کے عالم میں ایک سرور انگیز تڑپ اور مسرت بخش بے چینی محسوس کرتا ہوں۔ میرا جی یہی چاہتا ہے کہ میں اس سے قریب تر ہو جاؤں اور وہ مجھ سے دور ـــ بہت دور بھاگتی رہے۔

ایک رات جبکہ زلف۔ لیلیٰ شب آہستہ آہستہ کائنات پر چھانے لگی نیلے آسمان پر ستاروں نے اپنی بساط بچھا دی۔ میں دریا کے کنارے اس دیوی کے انتظار میں کھڑا رہا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ لیکن فضا اس کے نغموں سے ابھی تک خاموش تھی۔ جوں جوں تاریکی بڑھتی گئی میرا دل بیٹھتا ہی گیا۔ بے اختیار آہوں کا سیلاب میرے دل کے ظلمت خانہ سے نکلنا شروع ہوا۔ اور میری آنکھوں نے اشکوں کا ایک خوبصورت ہار بنانا شروع کیا۔ اور میرے تخیلات نے تاروں کی تابناک روشنی سے اس کے لئے پازیب تیار کرنا شروع کئے تاکہ وہ کشتی سے اتر کر چھم چھم کرتی ہوئی میری طرف آئے اور مجھے اپنی آغوش میں بٹھائے۔ اور مجھے اپنے سینہ سے لگالے۔ اس وقت میں اپنے اشکوں سے بنایا ہوا ہار اس کے چمکدار گلہ میں ڈالدوں گا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنا چہرہ اس کی گود میں چھپالوں۔

یوں ہی میں اس کے تصور میں لا بنی لا بنی گھانس میں کھڑا رہا۔ مجھے پیچھے سے روشنی کا سایہ بڑھتا ہوا معلوم ہوا۔ خوشی اور مسرت کی ہلکی ہلکی لہریں میرے جسم میں دوڑ گیئں۔ میں سمجھ گیا کہ "وہ آ رہی ہے" خاموش چپ چاپ

بے اختیار میری نظریں پیچھے کی طرف اوٹھ گئیں۔ آہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ اس کی بجائے ایک حسین وجمیل دوشیزہ بڑھتی ہوئی میری طرف آرہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں شمع تھی۔ اور اس کا شعلہ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں کانپ رہا ہے وہ دوشیزہ شعلہ پر اپنے دامن کا اوٹ کئے ہوئے خراماں خراماں میری طرف آرہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں حوروں کی سی پاکیزگی رقصاں ہے۔ اس کی پیشانی معصومیت کے نور سے تابناک ہے۔ اور اس کا آنچل ہوا میں اڑ رہا ہے۔ جب وہ میرے قریب سے گذرنے لگی تو میں نے پوچھا "اے دوشیزہ میرے تاریک دل کو اپنے اس شعلہ سے روشن کرنے" وہ چپ چاپ میرے قریب کھڑی ہوگئی۔ اس کی زبان پر خاموشی برس رہی تھی۔ آنکھوں میں نور چھلک رہا تھا۔ نظریں میرے سوال کو حل کر رہی تھیں۔ وہ جانے لگی ــــ بے اختیار میں نے اس کا نازک ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بول اٹھا "دیوی . . . . دیوی مجھے کچھ دیتی جاؤ" وہ رک گئی ــ مجھے گھورنے لگی۔ اور اس کی نظریں میرے سیاہ دل کی عمیق گہرائیوں میں دھنسنے لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے دل کے تاریک گوشے آہستہ آہستہ روشن ہو رہے ہیں وہ کچھ دیر تک یوں ہی گھورتی رہی۔ روح کی ساری قوت اس کی ان دو غزالی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی مسکراہٹ کی ہلکی ہلکی لہریں اس کے معنی خیز چہرہ پر چھا گئیں۔ دنیا اس کے نور سے روشن ہوگئی۔ کائنات کی ساری چیزیں اس کی نور کی چاندنی میں اشنان کرنے لگیں۔ میری آنکھوں نے درختوں کی ٹہنیوں کو ہلتا۔ آبشار کو گرتا۔ سبزے کو لہلہاتا۔ پانی کو بہتا۔ اور ہوا کو رقص کرتا دیکھا، آہستہ ــــ اس نے اپنا نقاب چہرہ سے اٹھایا۔ اور مجھ سے پوچھا "کیا تو مجھے پہچانتا ہے" اس روشن ستارے کو دیکھتے ہی میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ فرط مسرت سے میرا جسم لرز اٹھا، اور میرے نس نس نے پکار اوٹھا "تو وہی ہے، تو وہی ہے" جس کے انتظار میں میں آج تک بھٹکتا رہا۔ میں جواب میں کچھ بولنا چاہا لیکن بول نہ سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ کسی نے میری زبان کی ساری گویائی سلب کرلی ہے۔ میرے لب ہل کر رہ گئے۔

اس نے میری پیشانی کا بوسہ لیا۔ اور مجھے اپنے گلے لگا لیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری روح کی ساری کثافتیں دھل گئی ہیں اور میرا باطن ضمیر کی طرح پاک ہوگیا ہے۔ میری آنکھیں ثریا کی طرح چمکدار ہوگئی ہیں اور میری روح جنت کی ساری خوشبوؤں سے معطر ہوگئی ہے۔ میں اور وہ آہستہ آہستہ لانبی لانبی گھانس کو روندتے ہوئے ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ اس کے حسین بازو میرے گلے کے گرد حمائل تھے۔ اور اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں دھنسی ہوئی کچھ ٹٹول رہی تھیں۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگی "تو مجھے جانتا ہے۔ بتا کس قدر جانتا ہے" میری خاموش نظروں نے میرے دل کی ساری کیفیت بیان کردی۔ طنز آمیز قہقہہ ہوا میں بلند ہوا۔ میں لرز اٹھا کہ مبادا میں اسے کھو نہ دوں۔

وہ یوں ہی قہقہہ لگاتی رہی۔ ساری فضا سنہری قہقہوں سے معمور ہو چکی۔ میں چلا اٹھا۔ دیوی۔ ۔ ۔ ۔ دیوی۔ لوگ مجھے مجنون کہتے ہیں۔ میرے اس آوارہ پن پر ہنستے ہیں۔ میرا مذاق اڑاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ میں تیرے پیچھے یوں آوارہ کیوں بھٹک رہا ہوں۔ وہ مجھ سے تیرا نام پوچھتے ہیں، جواب میں، میں موت کا سا سکوت اختیار کر لیتا ہوں تو حقارت آمیز تبسم سے وہ میری طرف دیکھتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ دیوی کیا تم کو ابھی تک میری محبت میں شبہ ہے۔ دیوی تم اپنے جام جہاں نما میں میرے ظاہر و باطن کو عریاں دیکھ سکتی ہو۔ پھر مجھ پر یہ طنز آمیز فقرہ کیوں؟ للہ دیوی مجھ وہ من مانی مراد دید و جس کی مجھے آرزو ہے۔ اب مجھ میں وہ طاقت نہیں رہی کہ میں یوں ہی تمھارے پیچھے مارا مارا پھروں۔ میرے پاؤں کانٹوں سے چھلنی ہو گئے ہیں۔ میرے بال ہوا میں اڑ اڑ کر پریشان ہو گئے ہیں۔ میرا جسم نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے لاغر ہو گیا ہے اور میری راحتیں اور آسائشیں میرے پیچھے بے چین پھر رہی ہیں۔ دیوی مجھے وہ چیز دید و جس کی مجھ کو آرزو ہے۔

وہ بے چین سی ہو گئی۔ بیخودی کے عالم میں وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب میں مسرت کی دنیا میں سانس لے رہا ہوں۔ میرا سر اس کی گود میں تھا۔ اور اس کی نظریں مجھ پر۔ رات کے مہیب سناٹے میں ایشیا کا راگ موسیقی کے دریا بہا رہا تھا۔ میں نے کہا دیوی اس ترنم میں تم بھی اپنے راگ کو ہم آہنگ کر دو۔ میرے کہنے پر اس نے ایک میٹھا راگ الاپا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ساری کائنات موسیقی کے نور سے دھل رہی ہے۔ اس کے اس نغمہ میں ایک راحت تھی۔ ایک ابدی سکون تھا۔ وہ گاتی رہی۔ اور اس کی موسیقی ہوا کی لہروں میں بس کر اوپر کی طرف پرواز کرنے لگی۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں ان سریلے نغموں میں بند ہو گئی تھیں ـــــ اب میں دوسری دنیا میں تھا۔ وہاں ـــــ میں دیکھتا ہوں کہ میرا ہاتھ دیوی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ معلوم نہیں کس سمت لیجا رہی ہے اور میں اس کے پیچھے کھنچا جا رہا ہوں۔ ہم دونوں جنگل کے قطعات کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ سامنے ٹمٹماتے ہوئے دیئے دکھائی دئے ـــــ ہم تیز تیز ان مٹ مٹ کرتی ہوئی روشنیوں کی طرف بڑھتے ہی گئے۔ جوں جوں ہم آبادی کے قریب ہوتے گئے برقی روشنی کی شعاعیں ہماری آنکھوں میں تیز تیز دھنسنے لگیں۔ ہم دونوں آنکھوں کو مضطرب کر دینے والی دنیا میں پہنچ گئے۔ آہ اس دنیا میں کیسی فلک بوس عمارتیں کھڑیں غرور و گھمنڈ کے جھولوں میں جھول رہی تھیں۔ عالیشان کمرے بہترین آرائشی سامان سے سجے ہوئے تھے۔ کمروں کے سامنے چھوٹی چھوٹی کیاریاں۔ خوشنما اڑتے ہوئے فوارے صحن میں جل تھل کر رہے تھے رنگ برنگ کی مچھلیاں نیلگوں پانی میں تیر رہی تھیں۔ برقی روشنی خوبصورتی سے پانی کی سطح سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ فرش زمین سبزہ سے آراستہ تھی۔ موتیا۔ رات کی رانی۔ یاسمن کے گلدستے

فضا مہک رہی تھی۔ کمروں کے دروازے پر رنگ برنگ کے پھولدار پردے ہوا کی لہروں میں مچل رہے تھے۔ ایک طرف میز دھرا تھا لکھنے پڑھنے کی ساری چیزیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے کنارے سنگ مرمر کا ایک مجسمہ اور اس مجسمے کے ہاتھ میں ایک روشن برقی لیمپ۔ کرسی پر ایک حسین لڑکی بیٹھی ہوئی کچھ لکھ رہی تھی۔ وہ فیشن کے سارے کیل کانٹوں سے آراستہ تھی اس کے چہرہ کی اصلی رنگت غازہ میں پوشیدہ تھی۔ رخسار گلنار کی طرح سرخ ہونٹوں میں شوخ سرخی مچل رہی تھی۔ لانبی لانبی پلکوں کے نیچے مصنوعی حیا۔ ریشم کے قیمتی لباس کے اندر گناہ آلود جسم، عریاں بازو، کمر سے لپٹی ہوئی مہین ساڑی میں عضو عضو رقصاں نظر آتا تھا۔ مصنوعی بالوں سے سجائی ہوئی لانبی لانبی لٹیں کمر کی بلائیاں لے رہی تھیں۔ وہ کچھ لکھ رہی تھی۔

جانِ من! محبت نامہ ملا۔ آنکھوں سے چھوا۔ ہونٹوں نے چوما، اور دل نے اپنے آپ کو اس پرسے نثار کرنا چاہا۔ گھڑی کی ٹک ٹک مجھے مسرت اور شادمانی کا پیام سنا رہی ہے اور اس کے گھومنے والے کانٹے ہماری مصیبتوں اور فراق کے کٹھن لمحات کو موت کی طرح کاٹ رہے ہیں۔ آہ رات کے بارہ بجے ہم دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں گے۔ ہمارا مسکن ان تاروں بھرے آسمان کے نیچے، پہاڑوں کے دامن میں، بہتے ہوئے چشمے کے قریب، آبادی سے کوسوں دور، پرندا و چرند کے ہمسایہ میں ہوگا۔ آہ اس وقت کتنا سرور ہماری روح کو ہوگا جیسا کہ ہم دونوں زندگی کی کشتی میں بیٹھے ہوئے مسرت اور انبساط کے چپوں سے اپنی کشتی کو کھیتے ہوئے سکون کے پانی میں بہہ رہے ہوں۔ کبھی تمہارا سر میرے زانو پر ہوگا اور کبھی میرا سر تمہارے کندھوں پر۔ آہ۔ اس وقت کتنا سکون ہوگا ہم کو۔ کیا تم اس مسرت کا اندازہ لگا سکتے ہو؟ میری راحت جان! وہ لمحے کتنے سرور انگیز ہوں گے جب کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کو سنتے ہوئے زندگی جیسی مہیب اور لامتناہی طوالت کو شاد شاد بسر کر دیں گے۔ اور جب موت اپنا آخری پیام لیکر ہمارے پاس آئے گی اس وقت ہم اپنے تئیں بخوشی اس کے حوالے کر دیں گے۔ یہ ہوگا ہماری محبت کا انجام۔ یہ ہوگا ہماری زندگی کی کامیڈی۔ تمہاری خاطر۔ نہیں۔ نہیں۔ محبت کی خاطر مجھے ماں باپ، عزیز و اقارب اور سب کو چھوڑنا ہوگا۔ میں تمہاری خاطر ان سب کو چھوڑ دوں گی۔ ہمیشہ کیلئے چھوڑ دوں گی۔ ان کی صورتوں سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک خوفناک اژدہے کی مانند ڈسنے کیلئے میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ اور وہ وقت قریب ہے کہ میری زندگی کا شیرازہ ان کی مسرتوں کے مزار پر بکھر کر رہ جائے گا۔ اس وقت میں آپ ہی کانپ اٹھتی ہوں۔ لیکن اس فریب خرد۔ لمحات میں میرے دل کی گہرائیوں سے ہلکی ہلکی خوشی کی لہریں نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اور بڑھتے بڑھتے میرے ہونٹوں تک آجاتی ہیں۔ میرے ہونٹ زیرلب کچھ گنگنانے لگتے ہیں۔ شاید وہ آپ کے نام کی مالا جپتے ہوں۔ آج رات کے ٹھیک بارہ بجے آبشار کے قریب میرا انتظار کرنا۔

ہم دونوں وہاں سے چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک ویران مقام میں داخل ہوئے۔ ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی جس میں تین زندگیاں کرب و بے چینی میں تلملا رہی تھیں۔ ایک بیمار بچہ گھانس کے بستر پر پڑا ہوا زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا۔ ماں اپنے گوشِ جگر کے سرہانے بیٹھی ہوئی امید کا سہارا لئے ہوئے بچہ کا سر دبا رہی تھی۔ سامنے ایک دیا جل رہا تھا۔ بچہ کا باپ دوا خریدنے کیلئے باہر چلا گیا — خالی جیب — ایک کوڑی بھی اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ امید کے ہاتھوں ہاتھ دئے ہوئے اپنے آقا کے حضور میں حاضر ہوا۔ وہاں سے مایوس لوٹا۔ راستہ میں دواخانہ دکھائی دیا۔ بے اختیار اس کے پاؤں ڈاکٹر کے رحم و کرم کی طرف اٹھ گئے۔ اس کے وہاں پہنچنے پہنچنے تک ڈاکٹر کسی مریض کے ساتھ معائنہ کے کمرہ میں چلا گیا۔ چند نوٹ میز پر بکھرے پڑے تھے۔ ایک طرف ضمیر دوسری طرف فرض اور سامنے بکھرے ہوئے نوٹ۔ ضمیر اور فرض میں کشمکش پیدا ہوگئی۔ ہاتھ نوٹوں کی طرف بڑھتے ہوئے لرزنے لگے۔ دل بار بار اس کی ہمت کا ساتھ چھوڑتا گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیری چھاگئی۔ سر چکرانے لگا۔ لیکن آہ اس وقت اس کے تصور کے پردوں میں اس کے بچہ کا ناتوان چہرہ مرجھاتا ہوا معلوم ہوا۔ کھوئی ہوئی طاقتیں سمٹ کر یکجا جمع ہوگئیں۔ آنکھیں خوفناک چمک سے کھل پڑیں۔ غیر متزلزل قوت کی رو میں ضمیر تڑپتا رہ گیا۔ نامعلوم قوت سے وہ ایک نوٹ اٹھاکر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ جیب اس کے بوجھ سے وزنی معلوم ہونے لگا۔ ڈاکٹر آیا۔ مریض کا حال پوچھ کر نسخہ لکھدیا۔ دوا تیار ہوگئی اور وہ قیمت اداکر کے چلتا بنا۔ جوں جوں وہ چلتا گیا وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے پاؤں مَن مَن بھر وزنی ہوگئے ہیں۔ وہ اپنے میں ایک گران قدر شیئی کی کمی محسوس کرنے لگا۔ دنیا کی ساری چیزیں خوفناک آنکھوں سے اس کی طرف گھورتی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ حتی کہ اس کا بچہ بھی اس کی طرف ناراضی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کانپ اٹھا۔ لیکن وہ برابر آگے بڑھتا گیا۔ وہ جارہا تھا لیکن راستہ کی مسافت کسی طرح کم ہوتی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ جوں ہی وہ دروازہ کی چوکھٹ میں قدم رکھا۔ ٹھوکر کھاکر وہیں پر گر پڑا۔ شیشی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی اور اس کی دوا زمین پر پھیل گئی۔ وہ ایسے وقت جھونپڑی میں داخل ہوا جب کہ بچہ کی روح پرواز ہو رہی تھی۔ معصوم بچہ نے اپنے باپ کی طرف ایک آخری بار دیکھکر مسکرایا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور — بہت دور چلا گیا۔ ماں رونے چلانے لگی۔ باپ سر پھوڑنے لگا۔

خاموش رات کی چاندنی میں باپ اپنے بچہ کی لاش لئے ہوئے قبرستان کی طرف چلا گیا۔ ماں روتے روتے وہیں گر پڑی۔ نیند نے اپنے سکون کا لحاف اس کے وجود پر ڈالدیا۔ عالمِ بے خیالی میں پاؤں کی ٹھوکر سے شمع الٹ کر گھانس پر گر پڑی۔ آن کی آن میں سارا جھونپڑا جل کر راکھ کا ڈھیر ہوگیا۔ جب اس کا شوہر واپس ہوا تو سوائے

راکھ کے اور کچھ نہ پا سکا۔

یہ رقت انگیز منظر دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ دیوی میرے قریب آئی اور مجھ سے کہنے لگی ان دو زندگیوں میں سے تجھ کو کون سی پسند ہے۔ عیش یا افلاس؟

میں چلا اٹھا۔ دیوی مجھے اس غریب مفلس انسان کا سارا دکھ، درد، آہ و فغاں، محبت ہمدردی اور شرافت دیدو۔ وہ مسکرا اٹھی۔ اور اس نے اپنے شہد جیسے میٹھے ہونٹ میری پیشانی پر چسپاں کردیئے۔ ایک رقت آمیز سرور کی میٹھی میٹھی لہریں میرے جسم کے اندر نفوذ ہو رہی تھیں۔ میں اس ٹھنڈے پیار سے چونک اٹھا۔ جب میں نے آنکھ کھولی۔ نہ وہ دیوی تھی، نہ وہ دردناک منظر۔ صرف میں تھا اور میرا نرم نرم بستر۔ سامنے میز پر کتابوں کا ایک انبار۔

نذرِ ساقی

جناب عظیم صاحب (پرکال)

خدا کے واسطے اک جام اور پلا ساقی
اُسی طرح سے ذرا اور مسکرا ساقی

نفس نفس میں میرے کس نے آگ بھڑکا دی
یہ کیا نوازش پیہم کا ہے صلا ساقی

میں اپنے عزم مسلسل کی داد پالوں گا
نقاب رخ سے اٹھا دے اگر ذرا ساقی

زمانہ بھر کے میں رنج والم کو ٹھکرا دوں
اک ایسا جام مسرت مجھے پلا ساقی

تیرے کرم سے یہ عالم ہے میری ہستی کا
فغاں بھی بنتی ہے لب پر میرے دعا ساقی

تعینات بہار و خزاں نہیں معلوم
تیرا کرم ہے فقط، ورنہ اور کیا ساقی

نکال کر میرے اس دل سے خوفِ مرگ دوام
حیات کو میرے قدموں پہ پھر جھکا ساقی

مئے الست کی موجوں کا رقص ہو جس میں
عظیم کو بھی وہی جام کر عطا ساقی

انگریزی آمیز اردو

جناب احمد عبد الوحید صاحب (میدک گلشن آباد)

اردو زبان ہندوستانیوں کے مشترکہ میل جول سے عالم وجود میں آئی۔ یہ زبان ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس کے پرستار نہ صرف ہندوستانی ہیں بلکہ یورپ و امریکہ میں بھی اس زبان کے سمجھنے اور بولنے والے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اردو ہندوستان کی واحد نمائندہ زبان ہے۔ یہ زبان ہمارے جسم و جان میں اس طرح بس گئی ہے کہ تعصب کی زبردست آندھیاں بھی اس کو ہم سے جدا نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ اکثر یہ چاہتے ہیں کہ اس کو مٹا کر اور زبان کو مروج کیا جائے۔ اس کی رنگین بیانی خود اس کے بقا کی ضامن ہے۔

ممالک غیر سے جو خبریں ہندوستانیوں کے لئے نشر کیجاتی ہیں وہ اردو ہی میں ہوتی ہیں تاکہ سب آسانی سے سمجھ سکیں۔ کیا یہ امر اردو کے ہندوستان کی واحد نمائندہ زبان ہونے کا کھلم کھلا ثبوت نہیں ہے۔

یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ ایک زبان میں غیر زبان کے الفاظ استعمال کرنا اور اس زبان کو بگاڑنا کتنی معیوب بات ہے۔ ہندوستانی جب اعلیٰ تعلیم پاتے ہیں یا جب انگلستان ہو کے آتے ہیں تو ہم ان میں ایک عجیب فرق پاتے ہیں۔ جب وہ ہم سے اردو میں گفتگو کرتے ہیں تو تقریباً نصف انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں، اور اسی پر ناز ہے۔ ان میں اکثر وہی ہوتے ہیں جو پہلے خود کو اردو کا سچا خادم سمجھتے تھے۔ یہ اثر اب ہندوستانیوں میں اتنی سرعت سے سرایت کر گیا ہے کہ عوام، مدراس کے طلبا بغیر انگریزی الفاظ کی آمیزش کے ایک جملہ بھی اردو میں ادا نہیں کرتے۔ اگر یہی رفتار رہے تو وہ دن دُور نہیں جبکہ ساری اردو زبان گورا شاہی ہو کر رہ جائیگی۔

اب آپ ہی ذرا صدق دل سے غور کیجئے کہ انگریزی الفاظ کی بیجا آمیزش سے زبان اردو کو کتنا زبردست نقصان پہنچتا ہے۔ جب آپ انگریزی میں گفتگو کرتے ہیں تو حتی الامکان آپ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ نہایت فصاحت سے گفتگو ہو، یہی نہیں بلکہ لب و لہجہ تک اہل زبان کا سا ہو۔ لیکن برخلاف اس کے آپ اردو میں بے تحاشا انگریزی الفاظ ملاتے جاتے ہیں اور آپ کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اُس کا نعم البدل اردو لفظ ڈھونڈ لیں۔ اچھا یہ بتائیے کہ انگریزی میں اردو الفاظ ملا کر آپ گفتگو کیوں نہیں کرتے؟

ایک ایسی زبان میں جو اپنی رنگینی کی وجہ سے دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے دوش بدوش کھڑی ہو سکتی ہے کیوں ہم غیر زبان کے الفاظ استعمال کریں؟ در اصل ہم اُس کا گلا گھونٹ رہے ہیں اور یہ تو سراسر نا انصافی ہے۔

البتہ جو انگریزی الفاظ اردو میں بالکل مستعمل ہو چکے ہیں اور ان کے بدلے کوئی اردو الفاظ موجود نہ ہوں انہیں ہم اردو ہی سمجھ کر استعمال کریں مثلاً "کوٹ" "ڈاکٹر" "ریڈیو" "موٹر" وغیرہ لیکن جو الفاظ اردو میں مستعمل نہ ہوں، اردو دانوں سے میری ادباً التجا ہے کہ ان کو مستعمل کرنے کی ہرگز ہرگز کوشش نہ کریں۔ مجھے آپ کا "اڈریس" مطلوب ہے۔ اب کیا ٹیم ہے؟ آپ کون سے "اسکول" میں پڑھتے ہیں؟ یہ سوالات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ میں ان سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا ہماری عالمگیر زبان میں اڈریس کے بجائے 'پتہ'، ٹیم کے بدلے 'وقت'، اور اسکول کے بدلے 'مدرسہ' کے الفاظ موجود نہیں ہیں؟ کیا مسز کے بجائے اہلیہ اور مس کے بجائے آنسہ نہیں کہا جا سکتا۔ جب بیوی کا ذکر آتا ہے تو کہتے ہیں کہ میری "وائف" کا مزاج ناساز ہے وغیرہ۔ کیا آپ کو بیوی کہنے میں شرم آتی ہے؟ کیا آپ وائف نہ کہیں تو وہ آپ کی بیوی نہ رہے گی؟

اسی طرح مدیر صاحبان سے میں ملتجی ہوں کہ وہ ایڈیٹر کے بجائے مدیر یا مسئول لکھا کریں اس پر بھی حضرات اگر گورا شاہی اردو سے باز نہ آئیں تو اس زبان کی بدبختی پر کسے شبہ ہوسکے گا؟ خود ہمارے بزرگ اور خادمان اردو یہ عمل کرتے ہیں وہ دواخانہ کو ضرور ہسپتال کہیں گے مدرسہ کو اسکول اور حکومت کو ضرور گورنمنٹ کہیں گے۔ اس میں بیچارے عوام کا کیا قصور، ہمارے بزرگوں کا عمل اور جاہل ہندوستانیوں کی اندھی تقلید!!

انجمن ترقی اردو کی مرتبہ درسی کتابیں جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں ان میں اکثر انگریزی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں تاکہ طلبا شروع ہی سے انگریزی آمیز اردو کے عادی ہو جائیں چنانچہ جماعت چہارم کی اردو کتاب میں "پرائیوٹ سکریٹری" کا بیجا استعمال کیا گیا ہے انھوں نے انگریزی میں بھی ابھی یہ لفظ نہیں پڑھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر "معتمد خاص" استعمال کیا جاتا۔ سب کچھ ہو سکتا ہے گر چشم بصیرت ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ اکثر لوگ اپنے ناموں میں انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں مثلاً جس کا نام سید عبد المجید ہے اس کا نام آج کل "یس۔ اے۔ مجید" بن گیا ہے۔ کیا اردو کی ترقی اسی میں مضمر ہے؟ کیا یہ امر اردو کی بدبختی کا پیش خیمہ نہیں ہے؟ اردو لغت میں یس: اے وغیرہ کوئی الفاظ نہیں ہیں۔ اگر آپ اختصار پسند ہیں تو س۔ ع۔ مجید بھی لکھ سکتے ہیں۔ ع۔ ایں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است۔

بہر حال میرے لکھنے کا یہ مقصد ہے کہ ہم بہت جلد اپنی حالت کو سنواریں۔ گنگا جمنی اردو نہ بولیں۔ بول چال اور تحریر میں خالص اردو استعمال کریں اور جلد نشۂ غفلت سے بیدار ہوں

جب کہ حال ہی میں دفاتر میں اردو کے رواج کی نسبت احکامات صادر ہوئے ہیں ہمارے لئے اچھا موقع ہے۔

آئینہ کے روبرو

یوں تو کسی کی یاد جزوِ زندگی بنی ہوئی ہے۔ اگر بھلانا بھی چاہوں تو ناممکن ہے مگر بھلاؤں کیوں؟ جب کہ اس کی یاد میں میرے دن اور راتیں بہت ہی پر لطف ہوا کرتی ہیں۔ شام میں جب دن بھر کی مصروفیتوں کے بعد کچھ لمحے فرصت کے ملتے ہیں تو اُس میں تنہائی کھائے جاتی ہے اور اس تنہائی کا اگر کوئی مونس ہے تو وہ تیری یاد ہے۔ تو! وہ کہ جس کے لئے میں نے کئی بار راتوں کو آسمان پر تارے گنے ہیں۔ وہ کہ جس کے انتظار میں میں نے اپنی عمر صرف کی ہے۔ کوئی لمحہ زندگی کا ایسا نہیں گذرا جس میں بے چینی نے اپنا پورا زور نہ دکھایا ہو، یہ چند شعر کسی شاعر نے میری ہی کیفیت سے متاثر ہو کر لکھے ہیں :-

جوانی گومگو میں کٹ رہی ہے دل پریشان ہے — امنگیں سرنگوں ارمان دل سر در گریباں ہے
مجھے کچھ زندگانی میں کمی معلوم ہوتی ہے — نظام جسم و جان میں برہمی معلوم ہوتی ہے
یہ حالت ہے کہ جیسے ہو کسی کی آرزو مجھ کو — ابھی ہے ایک نامعلوم شیٔ کی آرزو مجھ کو
گھٹائیں جھومتی ہیں بجلیاں جب مسکراتی ہیں — امنگیں اس گھڑی رہ رہ کے دل میں کسمساتی ہیں
گِنے ہیں چاندنی راتوں میں تارے تا سحر میں نے — کیا ہے بیشتر اشکوں سے دامن تر بتر میں نے
گنی ہیں چھت کی کڑیاں موسم سرما کی راتوں میں — کٹی ہے رات اکثر اپنے دل سے باتوں باتوں میں
عجب ہے کشمکش ہیجان اک دل میں نرالا ہے — جوانی ہے کہ میں نے آستیں میں سانپ پالا ہے
نہ دن کو چین آتا ہے نہ شب کو نیند آتی ہے — تخیل گنگناتا ہے جوانی کُنمُناتی ہے

اب بتاؤ کہ کیا دنیا میں کوئی اور مثال بھی ہو سکتی ہے جس سے اپنی بے چین گھڑیوں کا ثبوت دے سکوں؟ دیوانگی کا یہ عالم کہ جب کبھی آئینہ کے روبرو ہو جاؤں تو اپنے عکس پر تمہارا گمان ہو جائے۔ آنکھوں میں جب آنسو بھر آتے ہیں تو وہ عکس تصور کی محویت میں تمہاری تصویر آنکھوں کے روبرو پیش کرتا ہے اور دیوانہ وار اس عکس کو بوسہ دیتا ہوں۔ کبھی ہنستا ہوں اور کبھی روتا ہوں۔ ایسے منظر کو دیکھ کر بے اختیار یہ شعر زبان سے ادا ہوتا ہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی — تا کس نگوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

جب اس کیفیت نے اپنا رنگ بدلا تو زمین پر گرنے کے قریب ہو جاتا ہوں کہ تمہارا تخیل میرا ہاتھ تھام لیتا ہے

والدین کا فرض

راقمہ جمیلۃ النساء بیگم - رعنا

بچہ کی تربیت و تعلیم اوسی وقت بہتر ہوسکتی ہے جبکہ بچپن کے زمانہ ہی سے شروع کیجائے۔ پانچ سال سے لیکر پندرہ سال تک کی عمر کا زمانہ۔ یہ ایک ایسا زمانہ ہے کہ جس میں بچہ کو انسان اور مکمل انسان بنانے کی کوشش باروَر ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اوس کے قوائے جسمانی کی طرح قوائے ذہنی بھی ترقی پر ہوتے ہیں۔ حافظہ تیز ہوتا ہے۔ قوت خیالیہ غالب اور قوت مدرکہ عروج پر ہوتی ہے ہر بات میں تجسس اور کرید کا مادہ اوسے بچپن رکھتا ہے۔ دوسروں کی اچھی عادتوں کا دیکھنا اچھی اور نیک صحبتوں میں بیٹھنا نہایت موثر ہوتا ہے۔ اوس بچہ کی مثال ایک سادہ اور صاف پتھر کے ہوتی ہے کہ اوس پر جیسا اور جس طرح کا اور جس قدر گہرا نقش کہود دیا جائے اتنا ہی دیرپا ہوگا۔ پس بچہ کی حقیقی تعلیم و تربیت کا بھی زمانہ ہوتا ہے اسی میں علمی اور اخلاقی تخم ریزی ہوسکتی ہے۔ اگر یہ زمانہ گذر گیا تو پھر کچھ نہیں ہوتا۔ عمر بھر کف افسوس ملنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے بچہ اس عمر میں ہر قسم کی تعلیم اور اخلاق کو قبول کرلیتا ہے۔ اسی زمانہ کی علمی و تربیتی اور اخلاقی تخم ریزی سے عمدہ پھل نکلتے اور خوبصورت پھول کہلتے ہیں۔ اس لئے والدین کا اولین فرض ہے کہ ابتدائے عمر ہی سے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کریں۔ اور دن رات اسی میں منہمک رہیں۔ پس جو والدین اس طرف توجہ نہیں کرتے وہ گویا اپنے ایک حقیقی فرض سے غفلت برتنے کے ملزم ہوتے ہیں۔ وہ اس الزام سے بچ نہیں سکتے کہ انھوں نے اپنی اولاد کو جو حقیقۃً ایک قوم اور نسل اور ملک کے بچے ہیں اون کو ملک و قوم کیلئے مفید اور کار آمد بننے سے روک دیا۔ بچہ یہ نہیں سمجھتا کہ اوسے کس راہ چلنا اور کس طریقہ پر عمل کرنا چاہئے۔ وہ تو صرف کھیل کود ہی کو اچھا سمجھتا ہے۔ بعض والدین اپنی لاعلمی غفلت اور فرط محبت سے اپنی اولاد کو لاڈ پیار کرکے بگاڑ دیتے ہیں۔ اوس کی ہر جائز او ناجائز ضدیں پوری کرتے اور اوس کے ہر طرح کے ناز اٹھا کر اوس کی زندگی کو نادانستہ او خفیہ طور پر برباد کردیتے ہیں۔ ایسا کرنا اوس کے حق میں سم قاتل ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے بچہ ضدی بن جاتا ہے۔ بات بات پر ضد کرنے کا عادی ہوجاتا ہے۔ پڑھنے سے جی چراتا اور ہر وقت کھیل کود میں مصروف رہتا یا اوس کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ اور وہ عادت رفتہ رفتہ طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے جس کا بدلنا دشوار نہیں بلکہ ناممکن ہوجاتا ہے۔ وہ نہ ماں باپ کا ادب کرتا ہے اور نہ چھوٹے بھائی بہنوں کی محبت۔ پھر جب بات مشہور ہوجاتی ہے تو وہ لڑکا چاہے کیسا ہی عالی خاندان کیوں نہ ہو ہر شخص کی نظر میں حقیر و ذلیل ہوجاتا ہے۔ کیا اوس کی اس ذلت کے باعث والدین نہیں ہیں۔ اگر اون ہی سے والدین کا ڈر اور خوف غالب ہوتا تو اوس کو ہرگز یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ "بچہ کو کہلائے سونے کا نوالہ اور دیکھے دشمن کی نگاہ"۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب ان باتوں کا

وقت گذر جاتا ہے تو والدین ان باتوں کو یاد کرکے افسوس کرتے ہیں لیکن اس وقت افسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے "جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔ پس اگر والدین ایسے رنج سے نجات پانا چاہیں تو اس کا علاج یہی ہے کہ موجودہ وقت کو غنیمت سمجھیں یعنی بچہ کے ہوش سنبھالتے ہی یعنی جس کو شرع نے ایک مبارک اور مسرور کن تقریب یعنی رسم "تسمیہ خوانی" کے ساتھ موسوم کیا ہے۔ تعلیم و تربیت کے باب کا آغاز کردیں۔ اور بچہ کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ اس کے ہر جائز کام اور خواہش میں مدد دیں اور حوصلہ افزائی کریں اور ناجائز کام اور خواہش سے اوسے نرمی کیساتھ روکیں۔

بعض والدین ہر بات کو بچہ سے بیہودگی اور غصہ سے کہتے ہیں۔ اس سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ ایک تو بچہ ایک بات سے نفرت کرنے لگتا ہے دوسرے ماں کا ادب اور محبت رخصت ہو جاتی ہے۔ اسلئے جو بات بچہ سے منوائی جائے اوس کے فوائد اور خوبیاں اچھے طریقہ اور نرم لفظوں میں اوس کے ذہن نشین کئے جائیں یا جس بات سے باز رکھنا اور روکنا یا ترک کرانا چاہیں تو بچہ کا دل اوس چیز سے معقول اور مناسب طریقے سے پھیریں اور اوس کے کرنے سے اسے بلطائف الحیل ٹالیں۔ اس سے "سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی"۔ یعنی بچہ کسی کام کی اچھائی یا برائی کی صورت کو اوس کے اصلی رنگ میں دیکھکر خود بخود اوس کی طرف مائل یا اوس سے منحرف ہو جائے گا اور یہی ایک شریف ماں باپ کا منشاء ہوگا۔ پس حقیقی تربیت یہی ہے کہ بچہ کی نفسیات کا مطالعہ اچھی طرح کرکے اوس سے کوئی کام لینا یا نہ لینے کا معقول طریقہ اختیار کیا جائے۔ ایسا کرنا اگرچہ زیادہ تر ماں باپ کے تعلیم یافتہ ہونے پر موقوف ہے اگر شریف گھرانوں کے غیر تعلیم یافتہ اصحاب بھی اپنے بزرگوں کی تربیت کی وجہ سے اپنے بچوں کی تربیت اچھے طریقہ پر کرتے اور کرسکتے ہیں۔

بعض والدین یہ چاہتے ہیں کہ بچوں کو علم گھول کر پلادیں اور بچہ کل کے آتے آج ہی سب خوبیوں کا حامل بن جائے۔ یہ نظریہ غلط اور قانون ارتقاء اور قانون قدرت کے خلاف ہے۔ قدرت کا ہر کاروبار تدریجی ترقی کر رہا ہے۔ پس انسان اسی کو اپنا رہبر بنائے۔ اور بچوں پر تعلیم کا زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔ بلکہ بچہ کے جسمانی اور دماغی نشو و نما کے ساتھ تعلیم جاری رکھے۔ ایسا کرنے سے وہ اپنی محنت میں کامیاب اور بچہ کو پروان چڑھتا دیکھ سکیں گے۔ اس کے برعکس تعلیم میں عجلت کرنے سے قانون فطرت کے خلاف کرکے وہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ بلکہ ایک بڑا اندیشہ یہ پیدا ہو جائیگا کہ اس کا الٹا اثر بچہ کی صحت و تندرستی اور اوس کے نشو و نما پر پڑکر آئندہ ترقیوں کا سدباب کردے گا۔ رات دن کا مشاہدہ ہے کہ ہزاروں ہونہار بچے اپنے ماں باپ کی اس غلطی کا شکار ہو کر اپنی زیست یا تندرستی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کی بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

مکتوبات جمیل

جہاں بانو ایم - اے

اس قافلہ میں کوئی دل اسنا نہیں ہے   ٹکڑے گلے کے اپنے ناحق نہ اے جرس کر

صبو جی! کبھی تم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو آگ لگا کر پانی کو دوڑتے ہیں؟ ہیں ایسے لوگ دنیا میں۔ اُن کا وجود سماج کے بندھنوں کیلئے بہت ہی خطرناک ثابت ہوا ہے۔ مگر جہاں تک ہو سکے ایسے لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرو جو صرف بکواس ہی کرنی جانتے ہیں۔ جو اپنی طول کلامی اور فطری کمزوری سے کیا کچھ نہیں کہہ ڈالتے۔ بعض وقت تو ان کی زبان کے نشتروں سے زندگیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ ایسے لوگ سوچتے کم ہیں۔ خیال تو کرو اگر ہماری زبان سے کسی کا جیون بگڑ جائے تو پھر ہماری ہستی کتنی ہولناک ہو جاتی ہے۔ ایسی بک بک سے چُپ ہی بھلی۔ خاموشی کبھی خطرناک نہیں ہوتی نہ اپنے لئے نہ دوسرے کیلئے۔ پس اتنا ہی ہوگا نا کہ لوگ تمھیں بے ضروری سمجھیں گے۔ تمھاری موجودگی و غیر موجودگی کا کسی کو احساس نہ ہوگا۔ لیکن خاموش و متین طبیعتیں بے ضرر ہوتی ہیں بے ضروری ہوں تو ہوں۔ ایسی چپ جس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے بہتر ہے اس واہی تباہی گفتگو سے جو کسی کے احساسات کے آبگینہ کو پاش پاش کر دے۔ کسی کے دل کو ایسی ٹھیس لگے کہ پھر وہ کمبخت دل سنبھل ہی نہ سکے۔ تمھارے ایسے طریق عمل سے تمھارا وقار کیسے قایم رہ سکتا ہے؟ تم دوسرے کو ذلیل کرنا چاہو گی لیکن تم خود سماج کی نظروں سے گر جاؤ گی۔ تمھاری جو عزت کرتا ہے وہ تمھیں ذلت کی نگاہ ہو سے دیکھنے پر مجبور ہو جائے گا۔ زبان قدرت نے اس لئے نہیں دی کہ تم اس سے نشتر کا کام لو۔ زبان کی مٹھاس سے جو دل میں گھر کر لیتے ہیں وہ اپنی اسی زبان کی تلخی سے اسی گھر کو اجاڑ بھی دیتے ہیں۔ اور صبو جی! دل کا بسنا سہل نہیں ہے۔ جہاں تمھیں یہ حق حاصل نہیں کہ کسی کے گھر جا کر، یا کسی کو اپنے گھر بلا کر ملول کرو۔ وہاں تمھیں یہ حق کب سے حاصل ہو گیا کہ تم کسی کے گھر محض سے جا کر دوسری زندگیوں سے متعلق حاشیہ آرائی کرو۔ زیب داستان کے لئے کسی کی زندگی کے ادنیٰ و معمولی واقعات کو غیر معمولی بنا دو۔ پوچ و ناقابل گرفت حالات کو جو آئے دن اور روزمرہ ہوتے رہتے ہیں اتنی اہمیت دو کہ وہ اہم ترین ہو جائیں۔ دلوں میں ہراس آ جائے۔

یہ مانا فن لسانی ایک کامیاب فن ہے جس کی طاقت سے دنیا الٹ پلٹ ہو سکتی ہے۔ اور انقلاب دہر میں اس کا بہت ہی اہم حصہ ہے۔

زبان قدرت نے سب کو دی ہے۔ بے زبانی کی بھی زبان ہوتی ہے۔ آنکھوں کی بھی زبان ہوتی ہے۔ غصہ، محبت،

رنج، رشک وحسد، غرض آنکھوں سے کیا کچھ عیاں نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح حرکات وسکنات کی بھی زبان ہوتی ہے۔ کسی سے بے رخی کا اظہار زبان سے نہ بھی کرنا ہو تو حرکات سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ لیکن سب سے زبردست حصہ زبان کا ہے۔ اس سے زندگی سنبھل بھی سکتی ہے بگڑ بھی سکتی ہے۔ لیکن ایسے ستم ظریف دنیا کی آبادی میں بہت زیادہ ہیں۔ جو۔ جہاں بیٹھ گئے آگ لگا کر اوٹھے۔

تم ذہنیتوں کو کیسے بدل سکو گی؟ جو عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں ان کا دُور کرنا آسان نہیں۔ معلم اور مولوی کو مداری کا تماشا کرنا پڑتا ہے۔ اس معیار کے مطابق وہ خود کو تیار کرتا ہے۔ اسی طرح ایک بے ضروری باتیں کرنے والا شخص جس کو خموشی کے جوہر نہیں معلوم خود کو ایک قابل ومستند مقرر سمجھتا ہے۔ لیکن اس کی بے محل تقریر چھوٹی چھوٹی پر لطف معصوم بے ضرر زندگیوں کے شیرازے بکھیر دیتی ہے۔

اب تم ذرا اس خاموش انسان کا بھی گہرا مطالعہ کرو۔ جو بظاہر بہت خاموش معلوم ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی جو بات کر دیتا ہے اس سے دل کے پرزے اڑا دیتا ہے۔ گویا ایک ایسا پتھر کھینچ مارتا ہے جس سے نظام عصبی تہہ وبالا ہو جائے۔ کسی کے احساسات کا اس کو بھی تو خیال نہیں۔ اور ایسے شخص کی یہ نپی تُلی، سُوجھی بُوجھی بات بہت ہی موثر ہوتی ہے۔ اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ سُننے والے کے دل میں گہرے زخم ڈال دیتی ہے۔ جو مدت العمر مندمل نہیں ہوتا۔ وہ اپنی غرض کا بندہ ہوتا ہے جب اس کی کوئی غرض یا اس کی کوئی التجا پوری نہیں ہوتی تو اس کی زبان دل کی بھڑاس اُبلنے لگتی ہے۔ وہ کسی بیمار کی مزاج پرسی کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس کی عیادت کا بھی اس کو سلیقہ نہیں۔ یہ سب نیک نفسی پر منحصر ہے۔ جو حساس ونیکدل ہوتے ہیں وہ کسی کا دل دکھا نہیں سکتے۔ شقی القلب بے حس انسانوں سے کیا بعید ہے۔ آئے دن دل کا توڑنا ان کا ایک دلچسپ شغلہ ہو جاتا ہے ـــ اور جن کا دل کبھی ٹوٹا نہیں وہ کیا جانیں کہ دل ٹوٹنے میں کیا اذیت ہوتی ہے۔ اچھا صبوحہ! اب ہم رخصت ہوتے ہیں۔ تم نے لکھا تھا کہ تمھیں نیند آرہی ہے؟ تو اب تم آرام کرو۔ ہم بھی یہ کہتے ہوئے چپ ہو جاتے ہیں۔

شکایت کروں ہوں تو سونے لگے ہے   میری سرگذشت اب ہوئی ہے کہانی

مسز باری آور! معاف فرمائیں ہمارا مقصد یہ تھا ڈاکٹری یعنی چیر پھاڑ کا فن کیا پردہ کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو اون کی آسانیاں اور نہ ہونے کی صورت میں اوس کی دشواریاں بتائی جائیں۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ حکمت سے متعلق ہے حکمت کے حاصل کرنے میں بے پردگی کی ضرورت نہیں۔ سوال یہاں پردہ سے متعلق ہے کہ سرجری نے آج کل جو ترقی کی ہے اوس میں عورتیں کیا پردہ کے ساتھ کامیاب ہو سکیں گی؟

موسیقی

مسز آصف جہاں معین الدین (بلگرامی)

موسیقی کی ایک قسم تو وہ ہے جسے سُن کر دماغ اچھا یا بُرا کسی قسم کا اثر قبول نہ کرے اور خیالات میں خارج نہ ہو۔ ایک قسم وہ جسے سُن کر دماغ ہر قسم کا دکھ درد بھول کر ایک قسم کا سکون سا محسوس کرتا ہے۔

موسیقی کی ایک قسم وہ بھی ہے جسے سُن کر اور پھر میزبان کی طرف دہشت زدہ اور منت آمیز نظر ڈال کر لیکن ساتھ ہی "خفیہ" نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے آپ فرار ہونے کی راہ تلاش کریں۔ یا پھر دل ہی دل میں دعا مانگنے لگیں کہ خدا کرے بمباری ہو جائے اور کان بھرے ہو جائیں یا پھر کوئی ایسا معجزہ رونما ہو کہ یہ گانا بند ہو جائے۔ بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ موسیقی کی ایک قسم وہ بھی ہے جو سننے والے کو دنیا سے بیزار کر دے۔

موسیقی کی ایک اور قسم وہ ہے جسے سُن کر دل و دماغ پر ایک قسم کا وجد سا طاری ہو جاتا ہے، دماغ موسیقی کے سوا دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز سا ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا روح قالب سے جدا ہو کر بلندی پر ––– بہت زیادہ بلندی پر دھنک جیسی رنگین فضا میں پرواز کر رہی ہے لیکن ایسی موسیقی شاذ و نادر ہی سُننے کو ملتی ہے۔ شاید زندگی میں ایک آدھ مرتبہ۔

مثل مشہور ہے گانا اور رونا کسے نہیں آتا لیکن معاف کیجئے اگر میں یہ کہوں کہ گانا اور رونا دونوں فن ہیں۔ نہ رونا ہر کس و ناکس کو آسکتا ہے اور نہ ہی گانا جناب۔ رونے کے لئے بھی طریقہ چاہئے۔ بہت کم خوش قسمت ان فنون سے واقف ہوتے ہیں خیر رونے کا تو اس وقت ذکر نہیں کیونکہ یہ بجائے خود ایک الگ موضوع ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں کم از کم پچھتر فیصدی لوگ گانا نہیں بلکہ گانا رونا جانتے ہیں۔ ہاں اگر آپ اسے بھی گانا کہیں تو یہ آپکی خوش قسمتی ہے۔ غریب اور جاہل گھرانوں میں گانے کا تعلق فطرت سے ہوتا ہے۔ لیکن متوسط گھرانوں میں اگر آپ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے۔ رومال سے پسینہ نہ خشک کرنے لگیں تو میں کہوں گی ..... خیر جانے دیجئے بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر پردہ پڑا رہنا ہی مناسب ہے۔

ہاں تو متوسط گھرانوں میں عام طور پر آپ کو بچے سے بڑے تک سب لوگ موسیقی کے مرض میں مبتلا نظر آئیں گے۔ اور اگر گھر میں ہارمونیم یا اسی قسم کا کوئی باجا بھی ہوا تو بس سمجھ لیجئے کہ آپ کی نظروں کے سامنے سے ہاتھی نکل کر جا سکتا ہے لیکن باجے کا نظر انداز ہونا ––– قطعی ناممکن۔ ایسے گھروں میں آپ موقع کی نزاکت دیکھکر

ہزار احتیاط برتیں کہ گفتگو کے مرکز کا موسیقی سے بالکل تعلق نہ ہو بلکہ گفتگو کو موسیقی کی ہوا بھی نہ لگنے پائے مگر توبہ کیجئے موسیقی مثلاً عدالت کے قانون کی طرح اٹل ہو جاتا ہے۔

اور جب میزبان صاحبہ خود موسیقی کو گفتگو کا مرکز بنانے میں کسی نہ کسی طرح کامیاب ہو جاتی ہیں یا بار بار ان صاحبزادے یا صاحبزادی کی تعریف کرنا شروع کر دیتی ہیں (جو ان کے خیال میں موسیقی کی ماہرفن ہیں) تو آپ کیا کر سکتی ہیں سوائے اس کے کہ کپکپاتے ہوئے دل سے اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے گانا سُننے کی نہ صرف خواہش ظاہر کریں بلکہ اصرار بھی کریں (گویا دل کی حرکت ہی تو بند ہو جائے گی آپ کی اگر آپ نے گانا نہ سُنا)

جس وقت ہارمونیم پر تھرتھراتی ہوئی آواز کے ساتھ موٹی موٹی سی نازک اور مختصر سی انگلیاں رقص کرنے لگتی ہیں اور "سانوری صورت پر میں جاؤں واری" کی آواز کے ساتھ موسیقی کی ایک لہر سی نکل کر فضا میں ابر کے مانند چاروں طرف چھا جاتی ہے تو بتایئے کیا آپ یہ نہیں محسوس کرتیں کہ بادل گرج رہا ہے۔ آندھی چل رہی ہے۔ چھاجوں پانی پڑ رہا ہے اور آپ کی روح پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر آوارہ سی پھر رہی ہے؟ —— یہ بھی موسیقی کی ایک قسم ہے۔ کیا وہ دردناک اور نزع کے مریض کی سانسوں کی مانند دبی دبی اور رُکی رُکی آہیں جو اس وقت آپ کے دل سے نکلتی ہیں اس خواہش میں ڈوبی ہوئی نہیں ہوتیں کہ وہ گانے والی کے دل میں اتر کر گانے کے جذبے کو اپنے آپ میں جذب کر لیں؟ اور کیا وہ تمام جاپانی گراما فون جن پر ریکارڈ بجتے کم ہیں لیکن "گھر" "گھر" زیادہ کرتے ہیں اور جن کی سوئیاں گھسے ہوئے ریکارڈ کے کسی ٹوٹے ہوئے حصہ پہ آکر رک جاتی ہیں اور "تم پر لاکھوں سلام سلام سلام" سے آگے بڑھنے سے انکار کر کے یکایک گویا ستیاگرہ کر دیتی ہیں۔ اور یہ "سلام سلام سلام" کا ورد اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ آپ میزبان سے رحم کی التجا کرتے ہوئے۔ یہ نہ کہیں کہ "بجن باجا بند کر دو۔ شاید ریکارڈ ٹوٹا ہوا ہے" اس قابل نہیں کہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ مع متعلقین یعنی ریکارڈوں کے باؤلیوں میں پھینک دئے جائیں؟

ایک اور قسم کی موسیقی جو اونچے طبقہ میں رائج ہے اس کا تعلق بڑی حد تک سینما سے ہے۔ کیا آپ نے ملمع کئے ہوئے زیورات اور خوبصورتی سے ہیروں کی طرح تراشے ہوئے رنگین اور چمکدار کانچ کے ٹکڑوں کو دیکھا ہے؟ اس طبقہ کی موسیقی کی حقیقت کو جاننے کیلئے ان ملمع کئے ہوئے زیورات اور خوبصورت کانچ کے ٹکڑوں کو دیکھ لینا کافی ہے۔

اور ہاں آپ یقیناً موسیقی کی اس قسم کو تو ہرگز نہ بھولی ہوں گی جنھیں استادی گانے یا پکے گانے کہتے ہیں۔

پکے گانوں کے متعلق کچھ عرض کرنا ــــ "کارے دارد" ہے۔ "پکے گانے" جن سے ریڈیو اکثر آپ کے کانوں کی ضیافت
کرتا رہتا ہے۔ اس کی تعریف کرنے کے لئے ــــ جی۔ کچھ نہیں۔ بس ذرا پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔

لیکن اب آپ سے کیا پردہ ؟ واقعہ دراصل یہ ہے کہ "پکا گانا" موسیقی کی اس شاخ کا نام ہے جسے سُن کر اختلاج
ہونے لگے یا جسے منکر کوئی انگریز ریڈیو والوں پر "جبر و تشدد کا جرم عائد کردے ۔۔۔۔۔۔ مگر یہاں ایک بات یاد
رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ میں نے پکے گانوں کے متعلق اپنے صحیح خیالات کا اظہار تو کرلیا ہے لیکن اگر آپ گانے کی کسی
پارٹی میں پکے گانوں کے متعلق مجھ سے دریافت کریں تو اس وقت میری رائے بالکل دوسری ہوگی یعنی اس وقت پکے
گانے سننے کے لئے میرا اشتیاق دیکھکر آپ یہ تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں گی کہ واقعی پکے گانوں کو مجھ سے زیادہ کوئی دوسرا
نہیں سمجھ سکتا کیونکہ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتی کہ جہاں پکے گانوں کے دو چار ماہرین فن جمع ہوں وہاں میں لاعلمی یا
بیزارگی ظاہر کرکے اپنی کمزوری کا ثبوت دوں۔ مجھے پکے گانوں کے بہت سے نام یاد ہیں۔ بھیم پلاس، میاں کی توڑی، جھنجوٹی، تلک
کامود، کافی، یمن کلیان وغیرہ وغیرہ۔ اور طبلے کی کئی تالوں مثلاً ترتال، جھپتال وغیرہ سے بھی واقف ہوں۔ تان کھینچنے پر
بیخودی کا اظہار، با موقع "واہ واہ کیا چیز ہوئی ہے" کہکر اور داد دینے کا دوسرے مختلف طریقوں سے بھی ناواقف نہیں
پھر بھلا میں اپنی کمزوری کا اعتراف کس طرح کرسکتی ہوں کیا مجھے "پکے گانے" ناپسند ہیں؟

آپ کیا جانیں پکے گانے کیا ہیں؟ جناب! یہ گانے ساون بھادوں کی جھڑی لگا سکتے ہیں۔ آندھی چلا سکتے ہیں۔
ہوا کو روک دیسکتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ چرند پرند کو مسحور تک کرسکتے ہیں۔

کبھی کبھی آپ نے سڑکوں پر رات کی تاریکی میں اور چلچلاتی ہوئی دھوپ میں بالشت برابر کے لونڈوں سے لیکر
"تانگے والوں کی قسم کے آدمیوں کو "ساون کے نظارے ہیں" اور "میرے چھوٹے سے من میں چھوٹی سی دنیا رے" وغیرہ الاپتے
ہوئے سُنا ہوگا جو سکون کے متلاشی دلوں کو ہتھوڑے کی ضربوں سے زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوتے ہیں ــــ یہ بھی موسیقی ہے۔

کیا آپ نے جاہل عورتوں کو کبھی کبھی گیت گاتے ہوئے سنا ہے؟ ان کے پاس نہ ہارمونیم ہوتا ہے نہ پیانو۔ نہ
کسی قسم کا آرگن۔ چکی کی آوازیں۔ ہل چلاتے وقت۔ موٹھ کھینچتے وقت یہ سُر ملاکر گا سکتی ہیں ــــ یہ بھی موسیقی ہے۔
لیکن کتنی سادہ گویا چلچلاتی دھوپ میں ندی کا تازہ پانی پی رہے ہیں۔

آپ نے کبھی کسی اندھے کو گاتے ہوئے سنا ہے؟ کیا آپ نے کسی دیہاتی لڑکی کو گوبر تھاپتے ہوئے گنگناتے سُنا ہے
کیا آپ نے کسی غریب عورت کے پوجا کرتے وقت کے گانے کے احساسات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے؟ کیا آپ نے ایک ایسی
عورت کو گھر کا [illegible] دور اس پگڈنڈی کی طرف دیکھتے ہوئے جو شہر کی سمت جاتی ہے جدھر ہر [illegible] اس کا شوہر دن بھر محنت کر کے

سامنے والا ہو گاتے ہوئے دیکھا ہے؟ کیا سخت ناامیدی کی حالت میں دل کے تاروں کا چھیڑا ہوئے نغمے میں بھی آپ نے دلکشی محسوس کی ہے؟
کیا آپ نے اس ماں کا گانا بھی کبھی سنا ہے جس کے بیٹے کو مسلسل کئی روز کے فاقوں اور ٹھوکروں کے بعد ملازمت ملی ہو؟ ——
یہ بھی موسیقی ہے۔ کتنی سادہ —— کتنی فطرتی۔ ایک ایک راگ دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کتنا دکھ، کتنا درد۔
اور کبھی کبھی کتنی مسرت اور سرور محسوس ہوتا ہے ان نغموں کے سُننے سے؟ گو یا کبھی ہم گرتے جا رہے ہیں۔ کھائی میں۔ لامتناہی
گہرائیوں میں! اور کبھی کبھی گویا ہم اڑ رہے ہیں بلندی پر۔ دھنک جیسی رنگین فضاؤں میں۔

موسیقی —— جس میں اس بات کا ڈر نہ ہو کہ ذرا آواز اِدھر سے اُدھر بھٹکی یا ضرورت سے زیادہ اونچی یا نیچی ہوئی
اور تال اور سر ٹوٹ گیا۔ راگ غلط ہوگا۔ یا۔ موسیقی —— دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی۔ آواز خیالات کی ترجمان سوز و
گداز یا کیف و سرور کے نغمے فضا میں چاروں طرف بکھیرتی ہوئی موسیقی جس کا تعلق روح سے ہو —— کہہ دیجئے نا کہ یہی
غیر شاعرانہ اور سکنڈ ہینڈ پسند ہے ——

انتقام

منظّر سلطانہ

شام کی تاریکی آہستہ آہستہ سفیدی پر قبضہ کر رہی تھی اور میں اپنے کمرے میں اوداس بیٹھی دلچسپی کیلئے کوئی مشغلہ سوچ
رہی تھی کہ کمرہ کا پردہ خفیف سی جنبش سے اوٹھا اور شامہ داخل ہوئی یہ میرے ہمسایہ کی ایک غریب اور نہایت شریف لڑکی
تھی جو اکثر و بیشتر آیا کرتی تھی مگر آج اوس کے چہرے سے جوش اور عزم ٹپک رہا تھا۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا شامہ تم تو
آج مجھے بہت خوفناک دکھائی دے رہی ہو۔ کہنے لگی ہاں "انتقام" پر جب کوئی آمادہ ہو جاتا ہے تو چہرہ کا آثار چڑھاؤ اوس کے
جذبات کی صحیح تصویر کھینچ دیتا ہے میں نے خوفناک نظروں سے دیکھ کر کہا "انتقام"! ہاں! ہاں انتقام۔ بلّی جب غصہ
میں آجاتی ہے تو شیر پر حملہ کرنے سے نہیں ڈرتی۔ میں نے آج تک آپ سے پوشیدہ رکھا میری شرافت نے کبھی یہ گوارا
نہ کیا کہ کسی کے آگے دست سوال دراز کروں ایسی بہت سی راتیں ہم پر گذر چکی ہیں کہ خالی پیٹ سو گئے اور کئی دن ایسے
بیت گئے ہیں کہ ہمارے چولھے سے آگ کا دھواں نہ اٹھا۔ لیکن راجو کی علالت نے ہم کو پریشان کر دیا ہم نے اس کے
دوا درمن کیلئے سب کچھ برداشت کرنے پر آمادگی ظاہر کی مگر ظالم ساہوکار تو بھوکوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے
اور غریبوں کا آخری قطرہ خون تک چوسنے تیار ہیں) بابو نے اپنے ساہوت انتہائی عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ

وہ اس وقت کچھ قرضہ دے جو بچہ کی علالت میں کام آئے۔ لیکن پتھر میں جونک کب لگتی ہے" بات بھی کہوں التجا کرکے"۔
کوئی تدبیر ذہن میں نہ آتی تھی کہ اپنے ننھے بھائی کو موت کے چنگل سے کیوں کر رہائی دلاؤں کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ دوڑ کر کواڑ کھولے۔ بوڑھا ساہوکار کھڑا مسکرا رہا ہے۔ میں معنی خیز تبسم دیکھکر چونک گئی وہ کہنے لگا کیا تیرے بابو ہیں؟ اتنے میں باتوں کی آواز سن کر بابو جی خود باہر آگئے۔ ساہو نے نہایت خشامدانہ پوچھا۔ کہو رام لعل کیسی گذر رہی ہے؟ بھگوان کی کرپا درکار ہے۔ ارے بھگوان بھگوان کی رٹ ہمیشہ تمہارے زبان پر رہتی ہے تم چاہو تو آج انند ہوجائے۔ بابو نے پوچھا وہ کیسے؟ میں بتاؤں شامہ سندر ہوتی جاتی ہے اگر اس کا بیاہ مجھ سے ہو جائے تو آج تمہارا بچہ موت کے چنگل سے چھوٹے اور دروازے پر ہاتھی ڈولے۔ چونکہ میں بازو کے کمرے سے یہ سن رہی تھی۔ مجھ پر بجلی ٹوٹ پڑی مگر میں نے ارادہ کرلیا کہ بھائی کے بچانے کو اپنی قربانی دیدوں۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ بابو نے اس کا جواب کیا دیا۔ وہ میرے کمرے میں آئے میں نے قدم پکڑ لئے اور انتہائی عاجزی کے ساتھ رو رو کر عرض کیا کہ بابو راجو کو بچانے کے لئے میری قربانی دیدیجئے۔ وہ بگڑ کر کہنے لگے۔ پگلی میں تیری زندگی برباد کردوں جا سو۔ وہ ساہوکار کا بچہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوگا۔ شامہ صرف اچھا کھانا اور اچھا پہننا زندگی نہیں ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں تو اور راجو بھوکوں نہیں مریں گے۔

آہ! بابو جی کو کیا خبر تھی کہ صبح تک کیا ہونے والا ہے۔ کیونکہ راجو کی کرب و بے چینی دیکھی نہیں جاتی تھی بابو سے صبر نہ ہو سکا۔ تاریک اور اندھیری رات میں کہیں اور قسمت آزمائی کیلئے چل پڑے اور میں مریض کے سرہانے بیٹھی اس کے کرب و بے چینی پر آنسو بہا رہی تھی۔ بھوک کی تکلیف اور مرض کی تاب نہ لاکر راجو ایڑیاں رگڑتا ہوا چل بسا اور میں چلا اوٹھی۔ راجو مت جا۔ مت جا۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا کہ اتنے میں صبح ہوگئی اور دروازہ پر کسی نے آواز دی میں دوڑی گئی کہ بابو جی آگئے لیکن ایک نامعلوم شخص نے یہ خبر سنائی کہ رام لعل موٹر کی ٹکر سے چل بسے ہیں اور دواخانہ میں نعش پڑی ہوئی ہے۔

یہ المناک واقعات کہکر شامہ کھڑی ہوگئی۔ تاریک کمرے میں اس کی آنکھیں بجلی کے قمقموں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے پوچھا اب کیا ہوگا؟ اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ کیا ہوگا؟ ظالم کو ظلم کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ بجلی کی طرح ایک خنجر میری آنکھوں کے سامنے چمکا اس کے ساتھ ہی وہ پکار اٹھی "انتقام"

میں نے گھبرا کر چیخ ماری۔ آنکھیں کھل گئیں۔ بستر پر پڑی ہوئی ہوں، لمپ جل رہا ہے اور بازو "شہاب" کا پرچہ رکھا ہوا ہے۔

تاج محل

نجمہ سمیع اللہ شاہ (کوہستان)

بادشاہ نے دل شکستہ ہو کر اپنی چہیتی بیوی سے کہا "خدا ہمیں جدا کرنا چاہتا ہے — زندگی کے غموں سے تم نڈھال ہوگئی ہو — کہیں دنیا تمھیں ہمیشہ کیلئے نہ بھلا دے۔ میں تمھیں ایک حسین گنبد میں سلاؤں گا — تاکہ تم ہمیشہ یاد رہو کیونکہ تم میری محبوب اور پیاری بیوی ہو۔"

اور — شاہ نے عقلمند اور ہوشیار کاریگروں کو بلوایا جنھوں نے اس کی محبوبہ کیلئے زریں۔ خوبصورت۔ ابدی آرامگاہ تیار کی۔ بادشاہ نے غم میں گھٹتے ہوئے اس مرمریں عمارت کو جمنا کنارے استادہ دیکھا — اور روتے ہوئے اس یادگار محبوب کا نظارہ کیا۔ جس کی چمک کبھی ماند نہیں ہوگی — جو ہمیشہ نئی رہے گی۔

غموں کی زیادتی سے شاہ ضعیف اور موت سے قریب تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں مسلسل آنسوؤں کی روانی سے دھندلی اور ہمیشہ کیلئے بند ہوگئیں۔ لوگوں نے اس کو اس کی محبوبہ کے قریب سلادیا — اور ان کی محبت کی یادگار تاج اب بھی اس داستان کو دھرا رہا ہے۔ جو آگرہ میں استادہ ہے — سفید چمکتا ہوا۔ شاندار — اور اپنے حسن و جمال میں یکتا — جہاں "وہ" سو رہے ہیں۔ دو محبت کرنے والے دل جو زندگی میں ایک دوسرے سے مدت تک جدا رہے — کیونکہ موت نے انہیں علٰحدہ کردیا لیکن ان کی محبت کو نہیں چھین سکی۔ کیونکہ سچی محبت کبھی فنا نہیں ہوتی — اور وہ تمام چیزوں پر غالب آتی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ رہتی ہے ؛

پیمانۂ محبت

جناب کوثری بیگم۔ کوثر بنت نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

ڈرتی ہوں سنانے میں افسانہ محبت کا
کوثر نہ چھلک جائے پیمانہ محبت کا

بے سمجھے جسے توڑا برباد کیا جس کو
ظالم وہ میرا دل تھا کاشانہ محبت کا

اپنے میں رقیبوں میں وہ فرق ہی کیا جانے
الفت کا جو بندہ ہو دیوانہ محبت کا

قربان ترے ساقی ان مست نگاہوں سے
کچھ اور پلادیتا پیمانہ محبت کا

کچھ یاد خدا دل میں۔ کچھ یاد بتوں کی ہے
یہ کعبے کا کعبہ ہے بت خانہ محبت کا

دیتی ہو دعا ساقی پیکر مٹے الفت کو
آباد رہے تیرا میخانہ محبت کا

کوثر یہ نوازش ہے ساقی کی عنایت ہے
سرشار کیا دے کر پیمانہ محبت کا

نیلگوں آسمانوں پر

نزہت سلطانہ

آپ جانتے ہیں مجھے اپنے بچپن سے ہی نا شگفتہ غنچوں، خوشبو دار پھولوں، رنگین شگوفوں سے کس درجہ محبت ہے۔ جب قدرت کی رنگینیاں فطرت کی سادگی میں گھل مل کر کائنات کو رنگ و بو کے سمندر میں غرق کر دیتی ہیں اس وقت میری خواب پرست روح جیسے آپ سے آپ جاگ پڑتی ہے۔ میرے دل کی بند کلی کھل کر خود بخود اپنی خوشگوار بو میں بس کر رہ جاتی ہے۔

عجب طرح کی مسرت خیز اور پراسرار کیفیت میرے دل و دماغ پر از خود چھا جاتی ہے۔ جس میں گم ہو کر میں خود بخود پھولوں کی سمت چلی جاتی ہوں۔ کوئی چھپی ہوئی پرکشش قوت مجھے کشاں کشاں زرد گلاب کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی بنچ کی طرف لیجاتی ہے جہاں سے ہمارے باغ کے سامنے بہنے والے دریائے ژرون کی خفتہ لہروں کے آغوش میں کھیلنے والی پرانے چاند کی زرد گوں کرنیں صاف طور سے دکھائی دیتی ہیں۔

میری دیرینہ عادت شاید آپ جانتے ہیں کہ صبح ہی صبح شب خوابی کے لباس پر سے لانبا کوٹ پہن کر مرمریں زینے کی راہ سے باغیچے کی طرف اتر آتی ہوں۔

شرلی کی روح بھی میری طرح کچھ خیال پرست واقع ہوئی ہے۔ بنچ کے قریب ہی کچھ فاصلے پر نارنگی کے درختوں کے جھنڈ میں اپنی سفید دُم کو دانتوں میں دبائے یاسمن کی خوبصورت کلیوں سے کھیلا کرتی ہے۔

رفتہ رفتہ افق مشرق سے تاریکیوں کے نقاب اٹھتے چلے جاتے ہیں اور پرانا چاند اپنی سفیدیوں کو سمیٹتا ہوا دوسری دنیاؤں کی سیر کو جانے کی تیاری میں مصروف ہو جاتا ہے۔ صبح کی نیلمیں روشنیاں جیسے آپ ہی آپ اونچے آسمانوں میں روپوش ہونے لگتی ہیں۔ جھیل کی گہرائیوں میں آبگوں کنول چشم نیم باز سے سیاہ پانیوں کے اوپر جاگ اٹھنے والی دنیاؤں میں سنہری مکھیوں کی تلاش میں تیرنے لگتے ہیں۔ ایشیائی بھونرے اپنی خوابگاہوں سے آنکھیں ملتے ہوئے کیتکی کی کیاریوں کی جانب آ نکلتے ہیں۔

نرگس شہلا اپنی چشم فسوں ساز کو وا کر کے ایشیائی شاعر کی روح کو بے طرح تڑپا دیتی ہے۔ اتنے میں کہیں دُور پر یاسمن کی جھاڑیوں میں خوابیدہ بلبل کے دلنواز فردوسی خواب روپوش ہو جاتے ہیں اور وہ بے چین ہو کر اپنے طلائی بربط پر کوئی ایسا دلنواز اور ایسا سریلا راگ چھیڑ دیتی ہے جس سے سوئی ہوئی کائنات کا ذرہ ذرہ سنہرے آفتاب کی

طرح چمک اٹھتا ہے۔ اس کی نشیبی تانیں باغ کی پُر بہار فضاؤں میں گونج اوٹھتی ہیں یہاں تک کہ شاہ خاور کی تیز سنہری کرنوں سے باغ کی سرخ روشیں رنگین ہو جاتی ہیں اور صبح کا ناشر اپنے آرکسٹرا پر نغمہ چراغ سحر بجانے لگتا ہے۔ صبح جیسے کوئی نور کی چادر بن کر کائنات پر چھا جاتی ہے۔ میں کاہل حسن پرست کی طرح اپنی اس بیکاری پر تاسف کرتی ہوئی سست رفتار سے باتھ روم کے دروازہ کی جانب چلی جاتی ہوں۔ جہاں سے نکلتے ہی مجھے دریا کی طرف کھلے ہوئے دریچوں کے سامنے میز پر تازہ سرخ پھلوں اور سنہری بسکٹوں کی سفید پلیٹیں سجاتی ہوئی شیراز کا بوڑھا حسین چہرہ اپنی جھریوں دار خوشنما آنکھوں سے دیکھتا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسری طرف خوابگاہ کے ارغوانی پردوں میں سے خواب آلودہ انجم برآمد ہوتے ہوئے۔ اور صبح کے گرم اونی لباس میں لپٹا ہوا انجمی پر اشتیاق نگاہوں سے سرخ پھلوں کی جانب دیکھتا ہوا لباس خانے سے نکلتا ہے۔

ان دونوں کی کشش ناچار مجھے پھر ایکبار برآمدے کی محدود فضاؤں میں کھینچ لاتی ہے۔ اپنے لئے ایک کرسی کھینچ کر میں میز کے قریب لے آتی ہوں اور اپنی خوبصورت پلیٹ میں تھوڑے چاکولیٹ اور سنہری بسکٹ لے کر چپ چاپ ناشتہ کی سرگرمیوں میں شریک ہو جاتی ہوں۔ نیچی تپائیوں پر سنہری پھولدار پیالیاں سبز چاء اور کافی کا سامان رکھکر شیراز اس طرح آہستگی سے دبے پاؤں واپس چلی جاتی ہے گویا آئی ہی نہ تھی۔ اپنے مرغوب ترین سنہری رنگت کے بسکٹ کترتی ہوئی میں افق کی گہرائیوں میں پرواز کرنے والے صبح کے پرندوں کے غول کی جانب کچھ اس انداز سے تکنے لگتی ہوں جیسے میری خیال پرست روح کی گہرائیوں میں بھی پروں کو پھڑپھڑا کر دفعتہً پرواز کر جانے کی کوئی ایسی ہی آرزوں پوشیدہ ہے جس طرح یہ خوشنما پرندے صبح کے نیلگوں آسمانوں پر تیرتے چلے جا رہے ہیں ؛

افسانوی خط

رشید قادر حسین سعید

(بسلسلہ گذشتہ)

میں اس کے گلے میں باہیں ڈالدی اور بہت ہی پیار بھرے لہجہ میں کہنے لگی۔ روحی پیاری کیا تم مجھ سے یہ امید کرسکتی ہو۔ تمہاری قسمتی تم سے کوئی راز پوشیدہ رکھ سکتی ہے۔ آہ تم نے میری محبت کا غلط اندازہ لگایا۔ کاش تم مجھ کو سمجھ سکتیں یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے اور میں ان کو دبانے کی کوشش کی مگر رائیگاں گئی۔ آخر وہ ڈھلک کر میرے

چہرہ پر آ ہی گئے۔ اس حالت کو دیکھکر وہ اپنی خفگی وغیرہ بھول گئی اور مجھے اپنے گلے سے لپٹا لیا اور کہنے لگی۔ یہ ہی تو مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میری شمسی مجھ سے چھپا رہی ہے۔ مگر بہن مجھے کامل یقین ہے کہ عارف صاحب کو تم سے محبت ہو گئی ہے جو ان کے بشرہ سے عیاں تھی۔ اور پھر روحی نے کہا۔ جان روحی اگر تم بھی کرنے لگو تو کیا برائی ہے۔ صاحب خاندان ہیں خوبصورت بہترین اخلاق وعادات ہیں۔ پھر اور تم کو کیا چاہیئے۔

میں نے کہا پگلی محبت بھی خاندان اور خوبصورتی کا خیال کرتی ہے وہ تو اندھی ہوتی ہے۔ اسکو ان تمام چیزوں سے کیا کام۔ وہ تو ایک ایسی پاک چیز ہوتی ہے جو صرف ایک لمحہ میں یا ایک نظر میں ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی۔ خدا کا شکر ہے میں اس سے مبرا ہوں اور رہنا بھی چاہتی ہوں جس چیز کو تم آسان سمجھ رہی ہو وہ اتنی آسان شئی نہیں ہے خدا تم کو مبارک کرے۔ دلی دعا ہے کہ تم اس میں کامیاب ہو۔ اور کوئی تکلیف یا مصیبت تمھارے پاس نہ پھٹکے جن عید ہو اور رات شب برات" بس نانی اماں بس بہت کچھ دعا دے چکی۔ جو عائی تمھارے باتوں سے۔ بڑی آئی باتیں بگھارنے والی۔ مگر اس غریب کا تو کچھ خیال کرو۔ جو تمھارے لئے تباہ ہو رہا ہے۔ ضبط کی بھی انتہا ہے۔ روحی نے اظہار افسوس میں کہا۔

میں خاموش ہو گئی۔ روحی نے تمسخر آمیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ آخر لاجواب ہو ہی گئی۔

میں نے کہا۔ رات زیادہ آگئی ہے۔ تم سو جاؤ۔ تمھیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں تمھارے نصیب دشمناں کچھ نقصان پہنچے۔ پھر صبح ملیں گے۔ شب بخیر۔ یہ کہکر میں اٹھنا چاہ رہی تھی کہ روحی نے زبردستی روکا اور کہنے لگی۔ مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ تم یہیں ٹھیرو۔ مجھے تسکین رہے گی۔ جانتی ہوں۔ تمھارے خیالات کہاں کہاں پرواز کر رہے ہیں۔ آج کی رات تو تمھاری اختر شماری میں گذرے گی۔ اور اگر اتفاقاً نیند آبھی گئی تو۔ سپنوں میں بھی . . . .

"سپنوں میں کوئی آتا ہے"

اس وقت روحی کے ہر عضو بدن سے معلوم ہو رہا تھا کہ مسرت کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ چہرا گلاب کے پھول کی مانند سرخی مائل ہو رہا تھا۔ مسکراہٹ سے یہ پتہ چلتا تھا کہ کلیاں کھل رہی ہیں۔ آنکھوں میں چمک آچکی تھی جو اس وقت اور بھی زیادہ حسن کو دوبالا کر رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ بس رہنے دو یہ نخرے۔ اٹھا رکھو کل کے لئے۔ وہ ہی سہیں گے۔ مجھے کیا۔ غرض جو تمھاری یہ پیاری پیاری اور من موہنی کے قربان جاؤں۔ غرض روحی رات بھر سخت بے چین رہی اس کو کسی کروٹ چین ہی نہیں آرہا تھا۔ خالو اور خالہ جان نے سمجھا کہ تکلیف کی وجہ سے

یہ حالت ہو گی - اسی طرح سویرا ہوا - صبح کا سہانا وقت دلوں پر ایک عجب کیفیت طاری کرتا ہے - اور انسان کچھ دیر کے
لئے تمام فکروں سے آزاد - خدائے تعالیٰ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا - انسان تو انسان حیوان تک بھی وجد میں
آ کر میٹھے راگ الاپتے ہیں کہ سننے والوں پر ایک خاص اثر ہوتا ہے اور انسان بھی خدا کی قدرت کے نظارے میں
اس درجہ بیخود ہو جاتا ہے کہ اس کو دوسری کسی بات کی فکر نہیں رہتی - خوش الحان پرندے کے سریلے نغمے اس قدر
سرور بخشتے ہیں کہ انسان اس میں محو ہو جاتا ہے - دل چاہے اس وقت کتنا ہی غمگین اور اداس کیوں نہ ہو -
بشاش ہو جاتا ہے - وہ صبح ہوا کی تازگی - دوسرے دن کی خوشی - دلوں کو مسرور کر دیتی ہے - یہ ہی حال روحی کا اور
میرا ہوا - ہم لوگ اس وقت تمام تکلیفوں اور خیالات کو بھول کر خدائے تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو گئے - اور دل سے
اس کی تعریف حمد و ثنا پڑھی - اتنے میں شاہد و عارف آ گئے - اسی طرح ان لوگوں کی اور ہماری ملاقات بڑھتے بڑھتے
بے تکلفی کی حد کو پہنچ گئی تھی - مگر عارف صاحب کا وہی حال تھا نہ انھوں نے اس کا اظہار کیا اور نہ ہم لوگوں نے
اس طرف توجہ کی - اور اب تک وہ ہم سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوئے تھے اور کسی قدر کھچے کھچے رہتے - خصوصاً روحی سے
زیادہ دور رہنے کی کوشش کرتے - اور زیادہ باتوں کا موقع ہی نہیں دیتے - پہلے تو ہم نے خیال کیا شاید ان کی
طبیعت ہی کچھ ایسی ہو - شاہد سے معلوم ہوا کہ وہ بہت خوش مذاق اور چلبلے طبیعت کے تھے - معلوم نہیں کیوں
کچھ دنوں سے یہ بہت خاموش ہو گئے ہیں - اور ان کی طبیعت بھی جو پہلے کبھی سست نہیں رہتی ہے اور نہ کبھی یہ بیمار
ہی ہوتے تھے) کچھ خراب اور سست رہنے لگی ہے - اور اب بہت ہی سنجیدہ ہو گئے ہیں - اب ان کا دل کالج میں
بھی نہیں لگتا - اور جب میں ان سے باتیں کرتا ہوں تو اکھڑی اکھڑی باتیں کرتے ہیں - اور مجھ سے دُور رہنے کی
بہت کوشش کرتے ہیں - ان کی اس تبدیلی سے کالج کے تمام پروفیسر و لڑکے حیران ہیں - مگر وہ بہت ضبط سے کام لے رہے
ہیں - کسی کو بھی انھوں نے اپنا راز نہیں بتلایا - عزیز سے عزیز دوست بھی اس بارے میں ہار مان گئے مگر وہ صرف یہ
کہتے ہیں امتحان کی آمد نے مجھے پریشان کر دیا ہے - دیکھا ہے کہ وہ بہت رات گئے سوتے ہیں - کچھ کہنے پر کہتے ہیں امتحان
قریب ہے مجھے زیادہ پڑھنا پڑتا ہے - میں شاہد کے یہ کہنے پر بھی کہ پہلے امتحان کے قریب تم اتنی محنت نہیں کرتے تھے -
اب کیا وجہ ہے اس پر وہ کہتے ہیں کہ میری صحت خراب ہوتی جا رہی ہے - شاید میں امتحان کے سامنے محنت نہ کر سکوں
اسی لئے اب پڑھ رہا ہوں - اسی طرح کر کے وہ ٹال جاتے -

برخلاف اس کے شاہد کے چلبلا پن اور شرارت ہنسی مذاق میں اضافہ ہو گیا تھا - بات بات پر وہ مذاق
کرتے ہنستے - ہر روز ان کا معمول تھا کہ ایک چکر ضرور کرتے - عارف صاحب بھی کبھی کبھی بہ مجبوری آجاتے مگر زیادہ

تو خاموش رہتے۔ اور روحی سے تو وہ بچنے کی کوشش کرتے

شاہد و روحی کا خیال تھا کہ وہ میری محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں میں دیکھتی تھی کہ کبھی میری طرف نظر التفات نہیں کرتے۔ بہن کی طرح پیش آتے یہ معمہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں بھی گہری فکر میں رہتی کہ یہ راز جو ابتک پوشیدہ ہے ضرور معلوم کرکے رہوں گی۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو بہت آسانی سے مجھ سے کہہ سکتے تھے۔ کوئی امر نہیں تھا کہ وہ مجھ سے چھپاتے۔ یہ راز مجھ کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ اور اس کو حل کرنے کی فکر میں ہر وقت غوطہ زن رہتی۔

روحی اب رو بہ صحت ہو چکی تھی اور اس کی صحت کی خوشی میں ایک جشن ترتیب دیا جانے والا تھا۔ رقعے تقسیم ہو چکے تھے اور مکان بجلی کی روشنی سے بقعہ نور بنایا گیا تھا۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ شاہد صاحب تو وقت سے پہلے ہی آموجود ہوئے تھے۔ مگر عارف صاحب کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہم لوگ حیران تھے۔ شاہد سے پوچھنے پر بھی وہ کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکے۔ کیونکہ وہ خود بے خبر تھے۔ چونکہ وہ لوگ بہت بے تکلف تھے۔ شریف الطبع تھے اس لئے خالوا بانے کہا۔ شمسی تم کارے کر عارف کے ہاں جاؤ اور ان کو بہ اصرار لیتی آنا۔ سُنا ہے کہ ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ جب وہ یہاں آئیں گے تو ان کی طبیعت بہل جائے گی۔ روحی نے کہا ہاں شمسی تمہارے بلانے سے وہ ضرور آئیں گے۔ رقعہ میں تمہارا نام ہوتا تو وہ ضرور چلے آتے۔ میں نے روحی کو غصہ سے دیکھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں شرارت کھیل رہی تھی۔ اور وہ ہلکے آسمانی رنگ کی کامدانی کی ساڑی میں اس قدر بھلی لگ رہی تھی کہ میں خود ٹھٹک کر رہ گئی اور کتنی دیر تک اس کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ پھر میں نے کہا چشم بد دور۔ خوب رنگ نکلا ہے۔ کہیں میری جان کو نظر نہ لگ جائے۔ آج شاہد کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ ان کو سنبھالنے کی سخت ضرورت ہے کہیں وہ بیہوش نہ ہو جائیں۔

روحی اسی شرارت آمیز مسکراہٹ سے کہنے لگی۔ رہنے دے یہ باتیں بڑی آئی نظر لگانے والی۔ خیر شاہد کو تو میں سنبھال لوں گی۔ اور کافی لوگ ہیں ان کی دیکھ بھال کو۔ تم عارف کو سنبھالو۔ کہیں اس کے بوجھ سے ہی نہ دب جانا۔ کہیں تم کو ہی دیکھکر عارف صاحب نہ بیہوش ہو جائیں خوب حُسن نکھرا ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں میری ننھی منی جان اس آفت ناگہانی میں نہ پڑ جائے۔ ذرا ساتھ ڈاکٹر کو بھی لیتی جانا۔

میں نے کہا خیال تھا کہ ڈاکٹر شاہد ہی کو لیتی جاؤں مگر تمہارے خیال سے خاموش ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں اپنا بندوبست آپ کرلوں گی۔ (باقی)

محمودیہ پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب بیرون دبیر پورہ سے شائع ہوا۔

جلد ۱۱ عدد ۱۱

شہاب

شہاب

جلد ۱۱ مہر ۱۳۵۲ فصلی م اگست ۱۹۴۳ عیسوی نمبر ۱۱

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے سالانہ چندہ (للعہ) گورنمنٹ سے (ہعہ)

غزل

جناب مسلمؔ حیدرآبادی

آشنائے می شناسد روئے زرد آشنا ‌‌‌‌‌‌‌‌‌ آشنائے خوب داند آہِ سردِ آشنا

نالہ و فریاد کردن پیشِ بیگانہ خطاست ‌‌‌‌‌‌‌‌ آشنائے می رسد اے دل بہ دردِ آشنا

کس نمی داند مآل عشق چوں خواہد شدن ‌‌‌‌‌‌‌‌ مرگ ما باشد سر آغازِ نبردِ آشنا

جز وصال آشنا چیزے نباشد در سرش ‌‌‌‌‌‌‌‌ جز خیال آشنا ناید بسر مرد آشنا

روئے گرد آلود سینہ چاک۔ وبا پائے فگار
مسلما صد مرحبا اے کوچہ گرد آشنا

ملک الشعراء شیخ غلام قادر گرامی

جناب سردار کریم نواز خاں صاحب ایم اے (کانگڑہ)

اعلیٰحضرت نواب میر محبوب علی خاں والی دکن کے شاعر دربار ملک الشعراء شیخ غلام قادر گرامی مرحوم کا مولد شہر جالندھر (پنجاب) تھا۔ چنانچہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ پر آپ نے جو نظم پڑھی اس میں دو شعر اسی طرف اشارہ

نظم دلکش بخواں بطرز دگر — مولد ایست شہر جالندھر

ذرہ اش برستارہ چشمک ریز — خاکِ جالندھر است مردم خیز

آپ ایک نجیب مگر متوسط الحال خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مکتب میں اردو اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وار برٹن صاحب سپرنٹنڈنٹ پولس کے وقت میں پولیس میں ہیڈ کانسٹبل بھرتی ہوگئے۔ ایک روز گرامی مرحوم دیگر مردمان پولیس کے ہمراہ رائفل پریڈ کر رہے تھے اور وار برٹن صاحب پریڈ کا معائنہ کر رہا تھا۔ اتنے میں گرامی مرحوم نے اپنے ایک دیرینہ دوست کو دور سے آتے دیکھا عین پریڈ کے دوران میں رائفل وغیرہ چھوڑ کر اپنے دوست سے جا بغلگیر ہوئے۔ اس جرم پر محکمہ پولیس سے برخاست کئے گئے۔ اور ہندوستان کا ایک مایۂ ناز شاعر پولیس ایسے غیر شاعرانہ ماحول سے نکل کر افق ادب پر جلوہ نما ہوا۔

تلاش روزگار میں پٹیالہ تشریف لیگئے اور وہاں کے اس عہد کے وزیر اعظم خلیفہ سید محمد حسن صاحب کے پیش ہوئے اور ملازمت کی استدعا کی۔ اس وقت گرامی صاحب بالکل نوعمر تھے خلیفہ صاحب نے دریافت فرمایا کہ وہ کس ملازمت کے اہل ہیں گرامی صاحب نے کہا کہ وہ شعر کہہ سکتے ہیں اور اگر دربار پٹیالہ سے وابستہ ہوجائیں تو فکر معاش سے سبکدوش ہوجائیں گے۔ خلیفہ صاحب نے امتحاناً یہ مصرع غزل کہنے کے لئے دیا ع بدستِ دستۂ نرگس بدستِ ماہرو دستے۔

گرامی صاحب نے اس مصرع پر فی البدیہہ آٹھ شعر کہے ؎

من اول شستہ ام اے محتسب از آبرو دستے — زدم آنگاہ بے باکانہ بر جام و سبو دستے

چو عقرب بر سرِ مژگاں بچشمم می زند نشتر — اگر بینم شبے در کاکل آں ماہرو دستے

کدامیں می دہد تعلیم بے رحمی باں ظالم — من از دنبال نالاں غیر را در دست او دستے

الٰہی کو شبِ ماہتاب و ذوقِ مے پرستی ہا — بدستِ دستۂ نرگس بدست ماہرو دستے

خوشا رندے کہ می دارد بہ بزمِ بادہ پیمایاں — بدستے ساغر صہبا و بر دوشش سبو دستے

من و گمنامی و دشتِ جنون شد در تغافلہا — زپا افتادگاں راے وزیر نا مجو دستے
بقولِ عرفیم ممنون منتہائے یک منعم — کشائم کے بحاجت چوں گدائے کو بکو دستے
گرامی بزم وصل عاشقاں دارد تماشائے — بدستِ حیلہ جو دستے بدستِ آرزو دستے

خلیفہ صاحب یہ اشعار سُن کر سکتہ میں رہ گئے۔ مگر پٹیالہ کا دربار فارسی کے شاعر کے لئے موزوں نہ تھا۔ اسلئے گرامی صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ کسی مسلمان ریاست میں روزگار تلاش کریں۔ جہاں پر ان کے علم اور بلند پایہ شاعری کی قدر ہو سکے۔ بالآخر میر محبوب علی خاں آفتاب دکن کی معارف پرور نظر نے گرامی کو دربار دکن کا شاعر منتخب کر لیا۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی دربار کے اردو کے شاعر تھے اور ملک الشعرا گرامی مرحوم فارسی کے شاعر دربار مقرر ہوئے۔

گرامی کی شاعری اپنی زبان کے اعتبار سے ہندوستان کے تمام فارسی شاعروں میں ممتاز ہے۔ اور اگر مصنف کا نام معلوم نہ ہو تو ان کے کلام پر اہل زبان کے کلام کا گمان ہوتا ہے۔ تغزل میں مولانا کو عرفی کا پایہ حاصل ہے اور چنانچہ خود مولانا نے اپنے آپ کو عرفی کا جانشیں کہا ہے۔

بصورت جانشینِ عرفیم در منعیم عرفی — کہ گردد مستقل قایم مقام آہستہ آہستہ

افسوس ہے کہ مولانا مرحوم کا پورا کلام مرتب نہیں ہوا اور آپ کے کلام کا بہت حصہ آپ کے عزیزوں اور مرزا عبدالرب صاحب ریٹائرڈ سشن جج لاہور کے پاس جمع ہے جو بعض وجوہ سے طبع نہیں ہو سکا۔ مگر جس قدر کلام ہم تک پہنچا ہے اُس کے مطالعہ سے بلامبالغہ ہندوستان کے فارسی شعرا میں گرامی کو صف اوّل میں جگہ حاصل ہے ناصر علی سرہندی اور مرزا صائب ایرانی ہمعصر تھے اور ان کی آپس میں چشمک رہا کرتی تھی۔ ناصر علی نے ایک غزل کہی جس کا آخری مصرع یہ تھا ع "بہ ایراں می فرستم تا کہ می گوید جوابش را"

یہ مرزا صائب پر چوٹ تھی۔ صائب نے یہ غزل پڑھکر جواب میں لکھا ؎

نہالے را کہ می دادم زخون دیدہ آبش را — چساں بینم کہ آخر دیگرے چیند گلابش را
عنانِ طفلِ بدخو را بدست غیر می بینم — بوقتِ نے سواری می گرفتم من رکابش را

اور مقطع تھا ؎

بہ ایراں کے خرامد فکر بکر ناصرِ ہندی — کہ طفلِ مکتبِ صائب بدراند حجابش را

گرامی مرحوم نے اس غزل پر ایک نعت اور ایک غزل لکھی۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بلا در ہر شکن پیچیدہ زلفِ نیمتابش را — اجل در یک گریباں ست چشم نیم خوابش را
تمنا بر نیاید زامتحان فتنہ عنوانش — تماشا بر نتابد جلوہ ہائے سینہ تابش را
دماغ فتنہ را خوں کرد آں چشم سخندانش — قیامت سر بزانو غمزۂ حاضر جوابش را
گرامی را بہ مجلس آں پری در دیدہ دید امشب — بلا گرداں روم پنہاں نگاہ انتخابش را
بخواہد آتش ملائے روم اے شمس تبریزی — زند آتش پنبہ زارش را آب افگن کبابش را
غزل گفت آتشیں مضموں گرامی گفت محمودم — دہد ناصر علی خطے جواب لا جوابش را

ایک اور غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎ —

در کنشت و کعبہ ما را اتفاق افتادہ بود — اتفاقِ ایں و آں داغِ نفاق افتادہ بود
دوش در میخانہ از وارفتگیہا یم مپرس — مست بودم شیشۂ عقلم بطاق افتادہ بود
طاق را از جفت نشناسیم ما سودائیاں — ابرواں را جفت برخواندیم طاق افتادہ بود
یار آمد بر سر بالیں من لیکن چہ سود — درمیانِ جسم و جانِ من فراق افتادہ بود
طفلِ اشکم گر ز چشم افتاد ہیچش بر مسنج — ناخلف بود ست پنداری کہ عاق افتادہ بود

مولانا بہت سنجیدہ مزاج اور متقی اور پارسا فطرت کے تھے مگر بعض اوقات جذبات کی رَو میں ایسے اشعار بھی کہہ جاتے تھے جو ان کی شان تقدس پر سبک ہوں مثلاً اسی غزل کا ایک شعر ہے۔

کو شبِ مہتاب و آں آویزشِ ناز و نیاز — ساعدش در گردنم دستم بساق افتادہ بود

حالانکہ مثنوی "پنجاب" میں جہاں سراپائے معشوق بیان فرماتے ہیں ساق کی حکایت چھپلتی نظر سے عبور کر کے ایک خاص انداز میں چھوڑ دیتے ہیں۔

ز ساق و ساعدش گلبا ز ذوقم — ہم دست و گریباں صبر و شوقم
ز ساقش بے خبر فکر بلندم — حدیث ساعد آمد دل پسندم

اسی مثنوی میں سراپائے معشوق کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں۔

بلا در چشم بیمارش نہفتہ — اجل در آشیانِ فتنہ خفتہ
ز رخسارش مپرس از من کہ چون است — نگاہ بیدلاں سرجوشِ خون است
چہ می پرسی ز زلفِ مشکبارش — بلا اندر بلا ہر تار تارش

تبسم چاشنی گیر لبانش | بخود پیچیدہ بوسہ درمیانش
تکلم باخموشی در ستیزہ | تبسم درمیانش ریزہ ریزہ
دہانش تنگ چوں دست گرامی | کمر باریک چوں فکر نظامی
ز پیچاک میانش نقش بستم | قلم در دست بیتابی شکستم

مرزا صاحب کی ایک غزل پر گرامی مرحوم کی غزل ملاحظہ ہو :-

آں پری گر از چمن گرم عتاب آید بروں | بلبل از گل۔ گل ز بو۔ بو از گلاب آید بروں
موجم از سر رفت اما شور عشق از سر نہ رفت | جائے خوں از زخمہائے کہنہ آب آید بروں
گنجہائے رنجہا ناید بدست اے بوالہوس | نافہ خونہا می خورد تا مشکناب آید بروں
تو بچشم آمدی من گریہ سر کردم بلے | آفتاب آید بچشم از دیدہ آب آید بروں
سفلہ راپیچد بسر باد غرور از جمع مال | متصل آب اندر آب افتد حباب آید بروں
اے گرامی در جواب صائب آتش زباں | اینک از کلکم جواب لاجواب آید بروں
گر رسد آوازۂ ایں پارسی در ہند و پارس | خسرو از دہلی ظہیر از فاریاب آید بروں

حضرت گرامی عقاید میں تصوف سے مانوس تھے۔ صوفی فرقہ عشق مجازی کو عشق حقیقی کی سیڑھی سمجھتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک مقرب خدا ہونے کے لئے پہلے کسی مجازی عشق کے آواگوں میں گرفتار ہونا ازبس ضروری ہے۔ اسی تصوف کا اثر ہماری فارسی شاعری پر غالب ہے۔ عورت سے عشق کرنے میں اخلاقی لغزش کا احتمال زیادہ ہے اس لئے علماء تصوف نے لڑکے سے عشق اور اس پر جذباتی شاعری کو ترجیح دی ہے۔ اور اسی وجہ سے فارسی شاعری میں لڑکے کو بطور معشوق مخاطب کیا جاتا ہے اور اس سے امرد پرستی کی بیل داغ پڑ گئی۔ چنانچہ جب فارسی شاعری کا اثر ہندوستان پر غالب ہوا تو یہاں پر بھی شعروں میں براہمن زادہ کی پرستش ہونے لگی۔ شیخ علی حزیں کہتے ہیں

از بنارس نروم معبد عام است اینجا | ہر براہمن بچۂ لچھمن و رام است اینجا

ہندی شاعری میں عورت مرد سے محبت کرتی ہے۔ اور تمام شاعری اس فطرتی جذبہ سے معمور ہے۔ فارسی میں مرد لڑکے سے محبت کرتا ہے۔ ایران کا وہ شاعر یحییٰ عراقی بھی ایک لڑکے کے دام محبت میں گرفتار ہوگیا۔ وہ لڑکا ایک قافلہ کے ہمراہ ملتان میں آیا تو حضرت عراقی بھی برہنہ پا اس کے پیچھے پیچھے تشریف لائے۔ اور ملتان کے بازار میں اس لڑکے کے تعاقب میں اشعار پڑھتے رہتے۔ خواجہ بہاؤالدین صاحب قدس سرہ جو اپنے عہد کے ولی تھے زندہ تھے۔

ملتان کے لوگوں نے اس دیوانے کی خواجہ صاحب کے پاس جاکر شکایت کی۔ خواجہ صاحب نے عراقی کو اپنے حضور طلب فرمایا اور اس لغو حرکت پر طعن کیا۔ اس وقت عراقی نے یہ اشعار فی البدیہہ عرض کئے ،۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند ز چشم مست ساقی وام کردند

بعالم ہر کجا رنج و غمے بود بہم کردند و عشقش نام کردند

چو خود کردند راز خویشتن فاش عراقی را چرا بدنام کردند

چنانچہ یہ اشعار سن کر خواجہ صاحب وجد میں آگئے اور کئی گھنٹوں تک مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کئے۔ اردو شاعری نے آنکھ فارسی شاعری کی گود میں کھولی۔ چنانچہ ابتدا ہی سے امرد پرستی اس شعرا کا شیوہ رہا۔ میر تقی میر کہتے ہیں ؎ میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب اسی عطار کے بچے سے دوا لیتے ہیں

مرزا غالب بھی اس پست جذبہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔

سبزۂ خط سے ترے کاکل سرکش نہ دبا یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

مظہر جان جاناں اپنے عہد کے ایک حسین شاعر تاباں پر فریفتہ تھے۔ چنانچہ ان کے کلام میں لڑکے سے محبت کے بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ ایک شعر کسی حیدر آبادی لڑکے پر لکھا ہوا ہے۔

گشتہ ام محو سواد خط سبزان دکن دل نشیں افتاد نقش حیدر آبادی مرا

مولانا غنیمت کنجاہی جو گجرات (پنجاب) کے باشندے تھے اور اپنی لافانی مثنوی کے باعث ابد تک زندہ رہ گئے۔ فرماتے ہیں ؎ شنیدم دوش از طرز آشنائے کہ از مکتب نکوتر نیست جائے

خصوصاً مکتب عشق آفرینے مقام ہمچو شاہد نازنینے

بر آمد بر در مکتب خروشم کہ من سیپارۂ دل می فروشم

اتنے میں ایک لڑکا برآمد ہوا اور سیپارۂ دل کی قیمت دریافت فرمائی۔ چنانچہ

بگفتا پیش تر آ پیش رفتم تکلف برطرف از خویش رفتم

بگفتا قیمتش۔ گفتم نگاہے بگفتا کم ترک۔ گفتم کہ گاہے

ایک اور بزرگ اپنا حسین مشغلہ یہ سمجھتے ہیں کہ ،۔

یار من در مدرسہ من بر سر راہ منتظر منتظر بارے کہ یار آید با کتاب آید دو دل

مکتب اور مدرسہ کی تعلیم شروع ہو گئی۔ استاد بچارے قلیل تنخواہ پاتے اور لڑکوں سے عشق کرکے وقت بسر کرتے۔

چنانچہ ؎ بہ مکتب آمدہ طفل پری زاد مبارک باد مرگِ نو بہ استاد

کوئی حسین لڑکا مدرسہ میں داخل ہوجاتا تو معلم صاحب خود کو اس مرگ نو پر مبارکباد کہتے ہوتے مدرسہ سے کالج بن گئے مگر مخلوط تعلیم ابھی نہیں جاری ہوئی تھی۔ اور تصوف کا یہ عطیہ یعنی لڑکوں سے عشق کا سودا ترقی کرتا گیا۔ پھر انفرادی طور پر کسی لڑکے پر شعر کہنا تو درکنار بھرے ہوسٹل پر شعر لکھے جانے لگے۔ چنانچہ فارمن کرسچن کالج لاہور کے ایک ہوسٹل ایوننگ ہال پر ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ؎

یہ ایوننگ ہال یہ انوار کا پر کیف کاشانہ یہ میخانے کا میخانہ یہ بت خانہ کا بتخانہ
تجلی خانہ یہ بانکے سجیلے نو جوانوں کا امیں حسن و محبت کی منوہر داستانوں کا
یہ ہے کاشانہ حسن و دلبری شاہزادوں کا یہاں رہتا ہے مجمع پریم پیاسے نامرادوں کا

صرف یہی نہیں۔ ایک صاحب تو فرماتے ہیں کہ ؎

خدا جو پوچھے گا کیوں جان دی جوانی میں تمھیں دکھا کے کہوں گا کہ اس جواں کے لئے

اس سے گزر کر ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

اگر کالج میں تم پڑھتے تو لنگا سنگھ کے دفتر میں تمہارے ہاتھ ہم بکتے کسی دن کا پیاں ہوکر

یہ وبا کالج کے احاطہ سے گذر کر ٹک شاپ تک بھی پہنچ گئی چنانچہ ٹک شاپ کے حلوائی بھی جب لڑکے تفریح کے لئے پریڈ میں چائے یا دودھ پینے آتے تو کہتے ؎

کہوں کیا رخ کی ہیں اس کے صفائی ہو جیسے دودھ پر ہلکی ملائی

کالج کے احاطہ سے نکل کر شہر کی منڈی کے مہاجنوں اور بنیوں تک بھی یہ وبا پھیل گئی چنانچہ ایک مہاجن لکھتا ہے کہ ؎

کل جو جاناں کا میسر مجھ کو بوسہ ہو گیا میں نے یہ جانا کہ گڑ منڈی میں ارزاں ہو گیا

چنانچہ تصوف کی یہ رَو مولانا گرامی ایسے نیک بزرگ کو بھی بہا کر لے گئی۔ فرماتے ہیں ؎

گر خواہی حقیقت رو بمیدانِ مجاز آور رسند از نردباں بالائے بام آہستہ آہستہ
کشیدم اے گرامی در بر آں شب بچو زنارش! شد آخر آں برہمن زادہ رام آہستہ آہستہ

پھر راز محبت کی محافظت کے بھی قائل نہیں ؎

چہ می کوشی بحفظِ رازِ عشق آیا نمیدانی کہ آخر طشت می افتد زبام آہستہ آہستہ

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

چناں افتاد بازلفِ برہمن زادگاں کارم — کہ تسبیح امامِ شہر زنار است پنداری

پھر فرماتے ہیں ؎ زہوشم برد از یک جلوہ آں طفلِ خود آرائے — قیامت قامتے۔ محشر خرامے۔ فتنہ بالائے

مگر سوائے معدودے چند اشعار کے گرامی صاحب کے کلام میں فطرتی عشق کی داستانیں بھی موجود ہیں ؎

بند بکشادی ز برقع شعلہ در دلہا زدی — زلف بشکستی بجانہا پیچ و تاب انداختی
دادی از یک جلوۂ عارض ملائک را فریب — عقدہا در کارِ ماہ و آفتاب انداختی
جلوہ گر ماہِ نو از سرِ چشمۂ خورشید شد — سایۂ ابرو چو در جامِ شراب انداختی

چونکہ پنجاب میں پردے کا رواج زیادہ سختی سے ہے اسلئے گرامی بیچارے کو یا تو کبھی بند برقعہ کی کشاد سے جلوہ نظر آجاتا اور یا سربام ایک گریز پا جھلک نظر آجاتی اور اسی پر اکتفا کر لیتے۔

چشم ہست سیاہ مستے دل ہست سیاہ کارے — دردے بجگر دارد بیمار ز بیمارے
آہم بسر راہے ماہم بسر بامے — دیوار بامید امید بدیوارے
اے عقل چہ تدبیرے۔ اے ہوش چہ افسونے — شد رہزن ایمانم آں سادۂ پرکارے

گرامی صاحب شکوہ سنج ہیں کہ نیک اور بے لوث محبت ہمیشہ ناکام اور بسر خاک رہتی ہے اور بوالہوس ہمیشہ کامگار اور کامیاب۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کچھ جھوٹ بھی نہیں ؎

تمہید وفا سنجاں خاریست تہہ پائے — امید ہوس کوشاں گل بر سرِ دستارے

پنجاب کی ناز آفریں اور حسن بداماں سرزمین کے بتانِ نوخیز کی عقیدت میں آپ نے ایک مثنوی رقم فرمائی اور فطرتی عشق کے جذبات کا معراج پیش کیا ہے۔

من و دلگرمیٔ آہِ جگر تاب — من و سرجوشِ حسن آبادِ پنجاب
برآمد حرفِ پنجاب از زبانم — زباں شد موجِ کوثر در دہانم
چہ می پرسی ز خاکِ دلفریبش — فریبِ نوخطاں جامہ زیبش
بجائے لالہ آتش لیلیٰ دمیدہ — بجائے بید مجنوں سرکشیدہ
فرو گسترده در ہر گوشہ دامے — قیامت قامتے محشر خرامے
سرِ راہے دو چارم شد نگارے — گل اندر گل بہار اندر بہارے
نگارے دلربائے دل فریبے — نگارے خود فروشے جامہ زیبے

پری دختے پری دیوانہ ماہے پری و ماہ را داغ نگاہے
شبے نظارۂ آں ماہ کردم تپیدم ۔ نالہ کردم ۔ آہ کردم
بلا پابوسِ زلفِ نیمتا بش اجل فرو در چشم نیم خوابش
ز انگیزش ادا در فتنہ کوشی ز بالائش بلا در خود فروشی
امید یک نظر سودائے خام است مژہ برہم زند کارم تمام است

علی ہذا القیاس سراپا لکھتے لکھتے گرامی صاحب کچھ ایسے بیخود ہوگئے کہ حکایت ساق کے بیان میں تو بزرگانہ اغماض کر گئے مگر بہار حسن کی بلندیوں تک جا کر ایسے پھسلے کہ آخر سخنہائے گفتنی بھی فاش کر دئے ۔ چنانچہ

"...... دو نار نارسیدہ نسیم جنبش مژگاں ندیدہ
دل حسرت کشاں ایجاد و نیم است شہید فتنۂ امید و بیم است
تکلف برطرف آں فتنہ پرواز کرشمہ در کرشمہ ناز در ناز

کبھی کبھی شب ہائے وصل کی نشاط آفرینیوں کا تذکرہ بھی چھیڑ بیٹھتے ہیں ۔

شبہائے وصل و گوشۂ چشم عنایتے مائیم و زلفِ یار و مسلسل حکایتے
ہاں وارسی بہ نکتۂ مضمونِ باغ خلد خوانی اگر ز مصحفِ رخسار آئیتے
عنوانِ یک نگاہِ تو خونریز عالمے تمہید نیم خندہ تو مرگ و لائیتے
تاچند امتحانِ تغافل ۔ تبسمے دیرینہ بندہ ایست گرامی رعائیتے

اگر بادشاہ رعیت کے ایک ادنیٰ فرد کی محبت میں گرفتار ہو جائے تو سلطنت کیلئے کتنا بڑا سانحہ ہوگا مگر تاریخ اور واقعات مناسب یا غیر مناسب محمود و نامحمود اسلوبات سے بیگانہ رہے ہیں ۔ ڈیوک آف ونڈسر کی حکایت ہی ایک ایسی حکایت نہیں بلکہ بسا اوقات شاعرانہ جذبات کے تموج سے کئی سلاطین ایسی لغزش شاعرانہ کے مرتکب ہوئے ۔ محمود و ایاز کی کہانی پرانی ہو چکی مگر تاریخ اپنا سبق دہرایا کرتی ہے چنانچہ ایسے حالات کے لئے گرامی صاحب نے چند شعر کہے ہیں ۔ خدا معلوم یہ واقعات کی پیش بندی تھی یا حکایات کا مداوا ۔ فرماتے ہیں ؎

بآہو نگاہاں بپیچاں سبیے کہ تا برتو آہو نگیرد کسے
تو شیری مکن برخود آہو دلیر مبادا کہ آہو کند صید شیر
بآہو و شیر آشنائی کہ چہ نظر بازی و دلربائی کہ چہ

تو شاہنشہی عشق و مستی چرا | تو ظلِ اللہی بت پرستی چرا
ستم کوششی چرخ معلوم شد | کہ حاکم زمیں بوسِ محکوم شد
خداوند شد بندہ را بندۂ | سر افگندۂ را سر افگندۂ
قیامت قیامت بلا در بلا | خداوند را بندہ فرماں روا
بود خارج آہنگِ قانونِ ہوش | اگر خواجہ شد بندہ را سفتہ گوش
سر خواجگی چوں پذیرد نظام | اگر خواجہ گردد غلامِ غلام
تو شاہی ترا عشق بازی چرا | تو محمود ولہا ایازی چرا
تو شاہی ترا عشق مطلوب نیست | کہ محبوب تر جز تو محبوب نیست
مخواں سفلہ را بر سر خواں دلیر | نگردند ہم کاسہ روباہ و شیر

داغ اردو کا شاعر دربار تھا اور گرامی فارسی کا شاعر۔ گرامی کی فطرت میں انکساری کا مادہ بہت زیادہ تھا اور بعض لوگوں کی طرح خود پر روشنی ڈال کر دوسروں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کے فن سے قطعاً عاری۔ داغ صرف شاعر ہی نہ تھا بلکہ ان امور ترقی سے بھی آگاہ تھا چنانچہ داغ تاجدارِ دکن کا زیادہ مقرب بن گیا مگر گرامی بیچارہ جہاں تھا وہیں پر رہا چنانچہ (۱۹۵) ماہانہ وظیفہ جو دربار سے عطا ہوتا تھا ایک شاعر دربار کے رتبہ کو برقرار رکھنے کے لئے غیر مکتفی تھا۔ آخر جب اعلیٰحضرت کی چشم توجہ خود بخود منعطف نہ ہوئی تو گرامی نے ایک قطعہ لکھکر پیش کیا۔

من و دامانِ آصف ہفتم | حضرتِ مدظلہ العالی
در ستانش کشیدہ سر بفلک | سر بد خواہ وقف پامالی
اے شہنشاہِ آفتاب ضمیر | چہ دہم شرح بے پر و بالی
طبع من پست شد چو ہمت من | از تہی دستی و کہن سالی
چہ ترا وو ز فکر من کہ مرا | کیسہ و کاسہ ہر دو شد خالی
نہ خطابم ز جنگی و ملکی | نہ براتم ز منصب و مالی
نہ اتالیق شاہ و شاہزادہ | نہ زمیں بوسِ درگہِ عالی
شاعر اینم بے مثل من و داغ | ہر دو را پایہ در سخن عالی
خوانش از مرغ و برہ نیست تہی | خوانم از ترّہ و نمک خالی

داغ و ذوقِ خطابہای شہی　　من و دشنامہائے بقالی

شاعرِ شاہم و چنیں مفلس　　نقل ہر محفلم ز نقالی

شعر بانی چو کیئے نمی ارزد　　پا بچرخ آورم ز قوالی

شکوہ از گردش فلک چہ کنم　　حالِ خود عرض می کنم حالی

چیست از آسماں امید وفا　　چہ تراود ز شیشۂ خالی

نالہ بستم ازیں ستم کہ مرا　　گہ نخواندی کہ برچہ منوالی

گہ نگفتی کہ اے گرامیِ ما　　گریہ چوں سرد ہی چرا نالی

تا گرامی بجائے قدر نشست　　قدر معنی ست در فلک بالی

با گرامی دو کم دو صد بدہند　　قدر را بودہ چار صد حالی

افسوس ہے کہ احبابِ دکن نے گرامیؔ ایسے شاعر کے حالات اور شاعری پر پوری بسط و شرح سے ابھی تک کوئی کتاب نہیں لکھی۔ حالانکہ گرامیؔ کا مقام فارسی علم و ادب کی تاریخ میں بہت بلند ہے۔

نقد و نظر

جناب عطارد صاحب

ماہ تیر ۱۳۵۲ ف کے رسالہ شہاب میں سراج الدین علی خاں صاحب بی۔ اے عثمانیہ نے ایک تاریخی محفل کے بعض دلچسپ حالات کا تذکرہ فرمایا ہے صاحب موصوف کا میں مشکور ہوں کہ اس ضمن میں مجھ کو حضرت جگر مرادآبادی کے تازہ کلام سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا۔ حضرت امام الفن استاد جلیل کے دو تلامذہ میں نہیں کی فرمایش پر حضرت جگر نے اپنے خاص دلکش انداز میں دو منتخب استادی غزلیں سنائیں جس سے "پر کیف نغمے فضاؤں میں پھیل گئے" یہ حضرت جگر ملک کے مشہور اور حیدرآباد کے نوجوانوں میں مقبول شاعر ہیں۔ پروفیسر عبد القادر سروری کا تو یہ فیصلہ ہے کہ "استاد داغ کی شعری کائنات ایک سمندر ہے جس کا آب معطر جگر کی شاعری ہے[1]" آج کل شاعری کے دو مکتب قرار دئے گئے ہیں ایک قدیم دوسرا جدید حضرت جگر مرادآبادی کو عہد جدید کے نوجوان مکتب جدید کا استاد تسلیم کرتے ہیں اور ہم بھی ہیں اچھے پر گو شاعر مگر جو غزل امام الفن حضرت استاد جلیل کو سنائی گئی اوس میں جب ہم کو بعض ایسے الفاظ تراکیب اور محاورات نظر آتے ہیں جو متقدمین یا متاخرین اساتذان فن کی زبان اور طرز بیان کے خلاف ہیں تو ہماری جیرت و استعجاب کی کوئی حد نہیں رہتی۔ یہ ہم کیسے کہیں حضرت جگر نے غلطی کی یا آپ سے سہو ہوا غرض حضرت جگر سے سہو ہوا ہو یا ہمارا اپنا ہی قصور فہم ہو جو شبہات ہم کو ہوئے ہیں اون کو ہم سخن فہم قارئین کرام کے ملاحظہ میں پیش کرتے ہیں تاکہ وہ خود تصفیہ فرمائیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

[1] جدید اردو شاعری

آنکھوں میں بس کے دل میں سما کر چلے گئے خوابیدہ زندگی کو جگا کر چلے گئے

"آنکھوں میں بسنا دل میں سمانا" صحیح نہیں اس کے برعکس دل میں بسنا آنکھوں میں سمانا اردو کا محاورہ ہے ؎

آنکھ زلفیں تری بستی نقیں اور آنکھیں تری ملک دل اپنا ہمیشہ کافرستان ہی رہا (ناسخ)

جب سے آنکھوں میں سمائی ہیں وہ کافر نظریں رات دن اپنی نظر سے ہے تو ہم مجھ کو (داغ)

حسن ازل کی شان دکھا کر چلے گئے اک واقعہ سا یاد دلا کر چلے گئے

ادب اردو میں الفاظ سا سے سی یعنی مانند بطور ادات تشبیہ مستعمل ہیں ع دیکھ کر خورشید سا چہرہ جو ہم غش کر گئے (ناسخ) یعنی خورشید کے مانند چہرہ ع الٰہی بھیجدے گھر میں مرے یوسف سے مہماں کو (آتش) یعنی یوسف کے مانند مہماں ؎

آپ اپنے کو جو شاگرد کا شاگرد کہے داغ سا ہم نے تو استاد نہ دیکھا نہ سنا

یعنی داغ کے مانند استاد۔ زیر نظر شعر میں "اک واقعہ" مشبہ بہ مذکور اور مشبہ مفقود ہے مصرعہ اولیٰ میں اور "اک واقعہ" میں کوئی وجہ شبہ نہیں۔

چہرہ تک آستین وہ لا کر چلے گئے ؛ کیا راز تھا کہ جس کو چھپا کر چلے گئے

"چہرے تک آستین لا کر چلے گئے" کوئی چست با محاورہ فقرہ نہیں ہے اس سے مراد اگر منھ چھپانا ہے تو مصرعۂ ثانی میں ضمیر موصولہ "جس کو" صحیح نہیں کیونکہ اوس کا مرجع "راز" ہے۔ پوشیدہ بات کو راز کہتے ہیں چھپی ہوئی چیز کو چھپانا کیا معنی ضمیر غائب حالت اضافی میں ہوتی یا مصرع کو اس طرح بدل دیتے تو زیادہ اچھا ہوتا ع کیا راز تھا کہ منھ کو چھپا کر چلے گئے۔ اس سے چہرے تک آستین لانے کی تشریح ہو جاتی۔

دے کر خود اپنے ہاتھ سے اک درد لادوا میری خودی کو ہوش میں لا کر چلے گئے

"درد دینا" اردو کا محاورہ نہیں یہ غلط ہے اور "ہاتھ سے درد دینا" غلط در غلط۔ البتہ فارسی میں درد دادن محاورہ ہے۔

جان زتن بردی و در جانی ہنوز دردہا دادی و درمانی ہنوز (خسرو)

"خودی" ضد بیخودی جس کے مفہوم میں ہوش داخل ہے بیخودی سے ہوش میں لایا جا سکتا ہے جو خود اپنی خودی یعنی ہوش میں ہو اوس کو ہوش میں لانا مہمل ہے۔

سمجھا کے پستیاں مرے اوج کمال کی اپنی بلندیاں وہ دکھا کر چلے گئے

"پستیاں سمجھانا" عجیب بات ہے۔ پستی اور بلندی مفرد اور جمع دونوں کے واسطے استعمال کیا جا سکتی ہے مگر وزن شعر کی خاطر پستیاں اور بلندیاں کہنا پڑا "اوج کمال" کمال کی بلندی یعنی منتہائے کمال وہ کمال جس میں نقائص یا "پستیاں" ہوں اوس کو "اوج کمال" کہنا ہی صحیح نہیں۔

اپنے فروغ حسن کی دکھلا کے وسعتیں میری حدود شوق بڑھا کر چلے گئے

"وسعتیں" بصیغہ جمع محض وزن شعر کی خاطر ہے اور خود" فروغ حسن کی وسعت" معنی خیز نہیں "حدِ شوق" باعتبار جزِ ثانی مذکر مستعمل ہے جو الفاظ ترکیب میں مضاف اور مضاف الیہ واقع ہوں ان کی تذکیر و تانیث میں عموماً مضاف الیہ کا لحاظ رکھا جائے گا۔ حکیم ضامن حسین جلال مرحوم رسالہ مفید الشعرا میں لکھتے ہیں "مشت مٹھی کے معنی پر مونث ہے لیکن مشت غبار کو مذکر اور مشت خاک کو مونث استعمال کریں گے۔

بعد فنا ہے کوچۂ گیسو کی جستجو سودا تو دیکھتا مرے مشت غبار کا (آتش)

ع مشت غبار کے صبا نے اڑا دیا (میر) ع یہ مشت خاک مری خاک میں اگر مل جائے (ناسخ)

بات یہ ہے کہ اضافت بیانی اور اضافت تشبیہی میں اصل کا لحاظ رکھا جاتا ہے خواہ وہ مضاف ہو یا مضاف الیہ-

شکر کرم کے ساتھ یہ شکوہ بھی ہو قبول اپنا سا مجھکو کیوں نہ بنا کر چلے گئے

مخاطب معشوق اور مطلب واضح ہے اس محرومی پر ہم بھی اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔

آئے تھے دل کی پیاس بجھانے کے واسطے اک آگ سی وہ اور لگا کر چلے گئے

"آگ سی" یعنی آگ کے مانند آخر یہ "آگ سی" ہے کیا چیز مشبہ کا ذکر لازم تھا۔

یہ کس کی لو ہے اے دل مضطر لگی ہوئی اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی (داغ)

یعنی کسی کی لو سینہ میں آگ کے مانند لگی ہوئی ہے۔

آئے تھے چشم شوق کی حسرت نکالنے سر تا قدم نگاہ بنا کر چلے گئے

"نگاہ بنانا" اردو کا محاورہ نہیں ہے نگاہ اور نظر مرادف الفاظ ہیں۔ نگاہ مادی چیز نہیں جو بنائی جاسکے۔

اب کاروبار عشق سے فرصت مجھے کہاں کونین کا وہ درد بڑھا کر چلے گئے

عشق کے کاروبار خدا جانے کسے کہتے ہیں اور وہ کیا ہیں "کونین کا درد" یعنی دین و دنیا کا درد۔ درد مقابل درمان مجازاً عشق و محبت کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

گر درد ہے کہو نا دل مضطر سے کسی کے پانی دو پلا دار کے سر پر سے کسی کے (ذوق)

جس عشق کے کاروبار میں پہلے سے مصروف ہیں وہ دنیا کا عشق ہوگا یا دین کا یا ان میں سے کسی کے جز یا کل کا اس سے خارج تو کوئی شئی ہو نہیں سکتی لہذا "کونین کا درد" یہاں بے محل ہے

میری حیات عشق کو دیکر جنون شوق مجھکو تمام ہوش بنا کر چلے گئے

میری حیات عشق یا میرے حیات عشق مطلب تو عشق سے ہے اس لئے میرے حیات عشق کہنا چاہیئے۔
وفور شوق ہی کا نام عشق ہے۔ عشق کو شوق دینا یا "حیات عشق" کو "جنون شوق" دینا بلحاظ زبان اور باعتبار
بیان صحیح نہیں۔ "ہوش بنانا" نہ اردو کی بول چال ہے نہ محاورہ "تمام ہوش بنانا" سراسر مہمل اور بے معنی ہے۔

لب تھرتھرا کے رہ گئے لیکن وہ اے جگر جاتے ہوئے نگاہ ملا کر چلے گئے

"نگاہ ملانا" بصیغۂ متعدی کم از کم ہماری نظر سے نہیں گزرا آنکھیں ملانا یا نگاہ ملنا تو معلوم ہے۔

غزل

جناب میر تُراب علی خاں صاحب بازؔ

عاشق لیلیٰ کہیں دیوانۂ محمل کہیں
قیس تجھ کو عاشقوں میں عاشق کامل کہیں

آدمیت ہی نہیں حیواں سے بد تر ہے وہ
جو نہ ہو عاشق کسی کا اس کو لاطائل کہیں

دولت و شہرت حکومت سا تھ کچھ جاتا نہیں
حاصل دنیا ہے جو کچھ اس کو لاحاصل کہیں

کور باطن کہتے ہیں ملحد تو کہنے دو انہیں
اہل باطن سب کے سب منصور کو کامل کہیں

مرنے والے چین سے سوتے رہیں حشر تک
قبر جس کو کہتے ہیں آرام کی منزل کہیں

چاہنے والوں کو اپنے دیتے ہیں کیا کیا خطاب
خوبیٔ الطاف ہے ظالم کہیں جاہل کہیں

قطرۂ خوں جمنے سے اک نام اوس کا پڑ گیا
گوشت کا ٹکڑا ہے اک پہلو میں جسکو دل کہیں

گفتگو میں ہے کبھی وحشت کبھی عرفاں کا رنگ
بازؔ کو دیوانہ سمجھیں یا کہ اہلِ دل کہیں!

عملی زندگی

جناب سید نورالحسن صاحب بی۔ اے (علیگ) ڈپٹی انڈرسکریٹری (گلا)

دوسروں کی ضرورتوں کو معلوم کرنا، اُن کے حل کی راہیں بتانا، اُن کی خوشی اور رنج کا ساتھی ہونا، اُن کی تمناؤں، آرزؤں اور خواہشوں سے دلچسپی کا اظہار کرنا، اُن کی باتوں کو دلچسپی سے سننا، اُن کی کمزوریوں کو نظرانداز کرنا اور اچھائیوں کی دل کھول کر تعریف کرنا انسان کو ہردلعزیز بنا دیتا ہے۔ اگر تم کو دوسروں کے کاروبار سے دلچسپی نہیں تو دوسروں کو بھی تم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ تم خودغرض ہو اور خودغرض آدمی سے ہر ایک کم از کم دل میں بیزاری کا جذبہ محسوس کرتا ہے۔ خودغرض آدمی دنیا میں شاید و باید ہی کامیاب ہوتا ہے اور وہ دوسروں کا دل اپنی تلخ باتوں سے توڑتا ہے جس سے اُس کو کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن دوسروں کی زندگی ناکام اور خراب ہو جاتی ہے۔ الفرڈ اڈلر کہتا ہے کہ اِن جیسی ہستیوں ہی کی وجہ سے انسانی ناکامیاں وجود میں آتی ہیں۔

لنکن امریکہ کا صدر بیحد ہردلعزیز تھا کیونکہ اُس میں خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے نوکروں تک سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا اور اُن کی ضرورتوں کا خیال رکھتا تھا۔ اُس میں یہ کمال تھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے عام و خاص کا دل موہ لیتا تھا۔

یاد رکھنے کے قابل یہ نکتہ ہے کہ ہم اُس کو ضرور پسند کرتے ہیں جو ہم کو پسند کرتا ہے اور ہماری تعریفیں کرتا ہے، ہمارے کام کو سراہتا ہے۔ دوست پیدا کرنے کا ایک آسان ذریعہ یہ ہے کہ دوسروں کے کام آؤ۔ لوگ تمہارے کام آئیں گے۔ اگر تم دوسروں کا مشکل کے وقت ہاتھ بٹاؤ گے تو دوسرے تمہارے اڑے وقت میں کام آئیں گے۔

جب کسی سے ملو گرمجوشی سے ملو تاکہ اُس کو معلوم ہو کہ واقعی تم کو اُس سے مل کر حقیقی مسرت ہو رہی ہے اور وہ سمجھے کہ اس کا تم سے زیادہ مخلص دوست دوسرا نہیں ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ پہلی ہی ملاقات میں دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ کیوں؟ بات یہ ہے کہ وہ اِس راز سے واقف ہیں کہ انسانیت، تہذیب، خندہ پیشانی اور دوسروں سے دلچسپی لینے سے انسان ہردلعزیز ہو سکتا ہے۔ عورتیں عموماً اچھے اچھے کپڑے پہن کر اور قیمتی زیورات سے مرصع ہو کر اِس امر کی سعی کیا کرتی ہیں کہ لوگ اُن کی طرف متوجہ ہوں، اور اُن کا چرچا کریں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ عورت کے چہرے کی بشاشتی

اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور اُس کا ہر خاص وعام سے خندہ پیشانی سے برتاؤ سونے اور جواہرات سے کہیں زیادہ قیمتی ہے ۔

عمل الفاظ سے کہیں زیادہ اثر پذیر چیز ہے۔ مسکراہٹ ایک عمل ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مجھے تم سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ میں تمہارا دوست ہوں اور تمہاری مدد کرنی چاہتا ہوں۔ اچھا بتاؤ تو سہی تم کیا چاہتے ہو؟ بناوٹی مسکراہٹ نہیں بلکہ حقیقی مسکراہٹ جس کی وجہ سے دوسرے میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے ، ناامید امیدوں کی پژمردہ کلیاں کھل جاتی ہیں۔ ہمت اور ڈھارس بندھتی ہے اور دل شکستہ اور زخم خوردہ انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ دنیا خلیق ، با مروت اور رواداری انسانوں سے خالی نہیں ۔

اگر تم دوسروں سے خوش مزاجی سے ملو گے تو دوسرے بھی تم سے خوش ہو کر ملیں گے۔ طبیعت کی تلخی خواہ مخواہ دشمن پیدا کرتی ہے ۔ ایک تاجر جو مسکراتے ہوئے اپنے گاہکوں سے بات چیت کرتا ہے اور بغیر پیشانی پر شکن ڈالے اُن کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے یقیناً آج نہیں تو کل کامیاب ہوگا۔ یہ کہنا کہ مسکراتا وہی ہے جس کا دل خوش ہو صحیح نہیں ہے ۔ بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ عمل نتیجہ ہے احساسات کا لیکن اصل یہ ہے کہ عمل اور احساسات دونوں ایک دوسرے سے علیٰحدہ نہیں کئے جاسکتے۔ عمل اصل میں ارادہ کے تابع ہے۔ اگر ہم ارادہ کرلیں اور عمل کریں تو احساسات خود پیدا ہو جاتے ہیں ۔ لہٰذا اگر کسی کو پریشانیوں نے گھیر لیا ہو یا اگر کوئی عادتاً خوش مزاج نہ ہو تو اُس کو چاہئے کہ مصمم ارادہ کرلے کہ وہ خوش رہے گا اور اُس پر عمل کرنا شروع کردے تو اُس میں یقیناً تبدیلی پیدا ہوگی اور خوشی کے جذبات پیدا ہونے لگیں گے ۔

ہر شخص خوشی اور مسرت کا متلاشی ہے ۔ خوشی خارجی چیز نہیں بلکہ داخلی چیز ہے ۔ ارادہ کے تحت اپنے خیالات کو قابو میں رکھو اور اُن کو اس طرح تربیت کرو کہ تمہاری اور دوسروں کی مسرت کا باعث ہوں۔ مسرت انسان کے خیال کا عکس ہے ۔ مفلسی اور غربت میں بھی بہت سے آدمی مگن رہتے ہیں کیونکہ عادتاً رنج و فکر کو وہ پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ شیکسپیر کہتا ہے کہ ” دنیا میں کوئی چیز قطعی اچھی اور قطعی بری نہیں۔ انسان کا خیال اُس کو اچھا یا بُرا بناتا ہے ، اور یہ صحیح بھی ہے کیونکہ بہت سی رسمیں جو ہمارے یہاں بہت اچھی سمجھی جاتی ہیں دوسرے ممالک میں بہت بری سمجھی جاتی ہیں ۔ مغرب کی تہذیب اور اُن کی طرز معاشرت کو ہندوستان میں اکثر حضرات آج بھی نہایت بُری نظر سے دیکھتے ہیں اور حقیقتاً سمجھتے ہیں کہ بنی نوع انسان کی تباہی کی باعث یہی مذموم رسومات ہیں ۔

بہرصورت جب ہم خیال لوگ نہیں ملتے تو ہم خیال قومیں کیسے ہو سکتی ہیں۔ اسی لئے ایک قوم میں جو حرام ہے دوسری قوم میں وہ حلال ہے۔ ہم افریقہ کے وحشیوں کی حرکتوں پر ہنستے ہیں اور وہ ہم کو دیوانہ سمجھتے ہیں۔ غرض یہ اچھے اور برے کا کوئی قطعی معیار نہیں۔ تم خود فیصلہ کرو کہ تم کو کیا کرنا ہے اور کیا بننا ہے اور دن و رات اسی دھن میں لگے رہو۔ زندہ دل رہو اور دوسروں کو زندہ دل بناؤ۔ خود ہنسو اور دوسروں کو ہنساؤ۔ اپنے ذہن میں یا خود اپنی تصویر قایم کرو۔ مخیر۔ ہمدرد۔ وطن دوست، دوست پرست، شجاع، راست گو، غریب نواز۔ علم پرور، روادار، خلیق اور ہنس مکھ۔ اسی دماغی تصویر کی نقالی کرو۔ کوشش کئے جاؤ ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ خیال ایک زبردست طاقت ہے۔

خواہش کا نتیجہ ایجاد ہے بشرطیکہ اس خواہش کے حصول کی انتھک اور مسلسل کوشش کی گئی ہو۔ ہم آخر وہی بن جاتے ہیں جیسا کہ بننا چاہتے ہیں ۃ

غزل

عظیمؔ۔ حیدرآبادی

میں کہ الجھا ہوا ہوں مشکل میں — جلوہ فرما ہیں وہ میرے دل میں
رہروانِ جنوں کے نقشِ قدم — چھپ گئے گردِ راہِ منزل میں
مسکرا کر جو تیر پھینکا تھا — اب بھی پیوست ہے رگِ دل میں
عشق کے فلسفہ کو کیا کہیئے! — ہر فنا ہے بقا کی منزل میں
میں یہ سمجھا کہ آرزو نکلی — تیغ چمکی جو دستِ قاتل میں
کشتیٔ عمر ڈگمگاتی ہے — عشق کے تنگنائے ساحل میں

پا کے سب کچھ بھی، کچھ نہ پایا عظیمؔ
اک تمنائے خام ہے دل میں

علامہ اقبال کا خط

شہاب کے اسی پرچہ میں آپ سردار کریم نواز خان صاحب کا ایک مضمون پڑھیں گے جو غلام قادر گرامی مرحوم کے حالات پر مشتمل ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت یہ مضمون ملا جولائی کی کتابت ختم ہو چکی تھی اسلئے ہم نے اگست کیلئے اس کو اٹھا رکھا۔ اتفاق نہیں بلکہ اس کو گرامی اور اقبال کا روحانی تصرف کہئے کہ بازار سے کسی چیز کے منگوانے کی ضرورت ہوئی جب ملازم آتا ہے تو جس کاغذ میں سودا لپٹا ہوا تھا وہ ذیل کا مکتوب ہے۔ اگر کسی ناواقف کے ہاتھ لگتا تو وہ آج یوں ہی گمنامی میں پڑا رہتا۔ غالباً یہ عالمگیر گرانی کے اثرات ہیں کہ ہمارا ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ردی جو آج کل سونے کے مول بک رہی ہے کسی ضرورت مند نے اس الماس کو خذف کے عوض بیچ دیا۔ کوشش کی گئی کہ اسی خس و خاشاک سے اور بھی جواہر ہاتھ آجائیں لیکن آرزو کب تکمیل ہوتی ہے؟ اس تیس سالہ دور میں یہ خط نہ جانے کہاں کہاں پھرتا پھرتا ایک بسکٹ فروش کی دوکان سے دفتر شہاب میں پہنچ گیا۔ قیاس تو یہ ہے کہ گرامی کا زیادہ تر زمانہ حیدرآباد میں بسر ہوا تھا کسی دوست یا عزیز کے کاغذات میں یہ محفوظ رہا اور اس کی اشاعت کی مسرت شہاب کیلئے مقدر ہو چکی تھی اور آج ہم نہایت فخر کے ساتھ آپ کی نظروں تک پہنچا رہے ہیں۔ ب

لاہور ۱۱ر مارچ سنہ ۱۸ع

بابا گرامی — سلام

خط لکھے ہوئے کئی دن گذر گئے۔ حیدری صاحب کے متعلق استفسار کیا تھا جواب ندارد۔ اشعار کے متعلق مشورہ طلب کیا تھا جواب ندارد۔ دو خطوں کے جواب آپ کے ذمہ ہیں آپ کس عالم غفلت میں قیام پذیر یا تشریف فرما ہیں۔ جواب لکھئے اور جلد اشعار کے متعلق جو کچھ میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دیجئے۔

آپ نے ایک غزل لکھی تھی فرسنگ است تنگ است۔ اس زمین میں ایک استاد کا شعر نہایت پسند آیا۔

"ہلاک شیشہ در خون نشستۂ خویشم — کہ آخریں نفسش عذر خواہی سنگ است"

جواب جلد آئے مجھے کئی دن سے انتظار ہے۔ آپ رخصت پر کب آتے ہیں؟ پنجاب میں کئی لوگ چشم براہ ہیں اور بالخصوص اقبال۔ محمد اقبال لاہور۔

"تمدن"

(ڈراما)

(جناب ناکارہ)

بسلسلۂ گذشتہ

علیم - غزل ؛ اچھی بات ہے - سنائیے - مگر ذرا زور سے پڑھیئے -

استاد - ہم ترنم سے پڑھنے کے عادی ہیں - مگر ہم زور سے گا نہیں سکتے - مجبوراً آپ کے کان میں تحت اللفظ پڑھنا پڑے گا - اچھا تو سنئے - مطلع عرض کیا ہے :- تیرے ارمان ہیں دل میں ہزاروں (رک کر انتظار کے بعد) مصرعہ اٹھائیے - مصرعہ اٹھائیے -

علیم - تیرے ارمان ہیں بل میں ہزاروں -

استاد - ارے صاحب دل کو آپ نے عزیز کمپنی کا بل بنا دیا - ارے بل نہیں صاحب - دل - دل - تیرے ارمان ہیں دل میں ہزاروں ہیں مہمان تیرے منزل میں ہزاروں

علیم - خوب ! خوب ! سبحان اللہ !

استاد :- (چلاکر) تسلیمات ! آداب عرض ! عرض کیا ہے - مزے ملتے ہیں میرے دشمنوں کو -

علیم - مزا ملتا ہے تیرے دشمنوں کو

استاد :- ہائے ہائے ! اب ہم آپ سے کیا کہیں ؟ آپ نے مصرعہ غلط پڑھ دیا - پھر سنئے - کان لگا کر سنئے - عرض کیا ہے :-

مزے ملتے ہیں میرے دشمنوں کو شکایت ہائے باطل میں ہزاروں -

علیم :- جزاک اللہ ! سبحان اللہ ! کیا لاجواب کلام ہے - کیوں نہ ہو - آخر استاد ہی تو ہیں -

استاد :- (چلاکر) تسلیمات ! آداب عرض ! عرض کیا ہے - حرارت سے تپ سوز و الم کی -

علیم :- حرارت سے تپ دق اور سل کی (جمعراتی آتا ہے)

استاد :- لاحول ولا قوۃ ! آپ تو ہمارا کلام غارت کئے دے رہے ہیں - (جمعراتی کو دیکھکر علیم کو حیرت زدہ چھوڑ کر اس کی طرف لپکتے ہیں) اماں جمعراتی ان بہرے صاحب سے تو ناک میں دم آگیا - چلاتے چلاتے گلا بیٹھ گیا - کم از کم تو ہی ہماری تازہ مرصع غزل سنتا جا -

جمعراتی :- جی نہیں صاحب - میں ایک غریب آدمی - شعر وعر کہاں سنتا رہوں ؟ ---- اور صاحب کام بھی بہت ہے -

استاد :- ارے اس میں کیا دیر ہوتی ہے ؟ بس دو منٹ - اچھا یہ لے - یہ چونی - یہ تیرا انعام ہے - ! ! اب تو خوش ہوگیا - ہاں اب سن - فرمایا ہے :-

حرارت سے تپ سوز الم کی — پڑے ہیں آبلے دل میں ہزاروں

جمعراتی :- ارے باپ رے : دل میں آبلے !
صاحب ! آپ ڈاکٹر سے علاج کیوں نہیں کراتے ؟

استاد :- ارے تو شعر کیا سمجھے ؟ سمجھنے کی کوشش کر ۔
بس سنتا جا اور داد دیتا جا ۔ ہاں تو فرمایا ہے :-

ہوا کیا قتل عام ایسا کہ لاشیں — پڑی ہیں کوئے قاتل میں ہزاروں

جمعراتی :- نہیں نہیں ۔ صاحب ۔ قتل اور لاشوں
کی باتیں میرے سامنے نہ کیجئے ۔ ہول ہونے لگتا ہے کسی
اور کو سنائیے ۔ میں نہیں سنتا ۔ واہ ! یہ بھی کوئی بات ہے !

استاد :- مگر ہم نے تجھے انعام جو دیا ہے ۔

جمعراتی :- واہ صاحب واہ ! چار آنے پیسے دیکر
آبلے، قتل، لاشے اور کیا اور کیا ۔ نہیں صاحب ۔ یہ
باتیں اچھی نہیں (چل دیتا ہے)

استاد :- ارے سنتا جا ۔ او جمعراتی ! ہمت تیری
نالائق کی ! ــــ آہ ! اے بسا آرزو کہ خاک شدہ !
چلے جاتے ہیں ۔ سلمیٰ اور اشتیاق آتے ہیں ۔

اشتیاق :- سلمیٰ ۔ آخر یوں کب تک میرا جی
جلاتی رہوگی ؟

سلمیٰ :- مگر مسٹر اشتیاق ۔ آپ کا دل تو غائب ہو چکا ہے ۔

اشتیاق :- نہیں سلمیٰ ۔ مذاق نہیں ۔ میں آج اپنی
قسمت کا آخری فیصلہ سننے آیا ہوں ۔

سلمیٰ :- مگر آخری فیصلہ تو میں آپ کو کئی
ہوئے سنا چکی ۔

اشتیاق :- سلمیٰ ۔ فیصلے غور کرکے بعد بدل سکتے
ہیں ۔ اور تم عورت بھی ہو ۔ اسی لئے میں نے تم کو غور
کرنے کی مہلت دی تھی ۔

سلمیٰ :- مسٹر اشتیاق ۔ آپ اپنی نسبت غلط فہمی
میں مبتلا ہیں ۔ آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے غور کرنے کی مہلت
دینے کا آپ اختیار رکھتے ہیں ۔ یہ خیال آپ دل سے
نکال ڈالیں ۔ سلمیٰ کو آپ نے ابھی تک پورے طور پر
سمجھا نہیں ہے ۔

اشتیاق :- پورے طور پر سمجھ گیا ہوتا ۔ مگر اچانک
احتشام سنگ راہ بن گیا ۔

سلمیٰ :- (کسی قدر گرم ہوکر) آپ دوسروں کا
ذکر بیچ میں کیوں لاتے ہیں ؟

اشتیاق :- کیوں نہ لاؤں ؟ کیا وہ قصہ کا ایک اہم
کردار نہیں ہے ؟ کیا اُس سے مجھے نفرت نہ ہونی چاہیئے ؟
کیا یہ بات میرے لئے اذیت دینے والی نہیں ۔ ایک
ادنیٰ کلرک نے مجھے ہرانے کی ٹھان لی ہے ؟ میں پوچھتا
ہوں، میری ساری دولت اور عزت کس کام کی اگر ــــ

سلمیٰ :- (بات کاٹ کر) تو اس میں میرا کیا
قصور ہے ؟

اشتیاق :- جی ہاں ! قصور نہ آپ کا نہ اُس کا ۔
قصور تو میرا ہی ہے کہ میں سمجھتا ــــ چاہتا تھا کہ
ایک لڑکی ایک دوسرے مرد کی خاطر اپنی پوزیشن والے
کو ٹھکرا دے ۔

سلمیٰ :- خیر پہلے سمجھنا نہ چاہتے تھے تو اب سمجھ لیجئے۔ بیجا امیدیں باندھنے کا یہی انجام ہے۔

اشتیاق :- سلمیٰ! خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لو کہ کیا کر رہی ہو، میں تمہاری بھلائی ہی کے لئے کہہ رہا ہوں۔

سلمیٰ :- اس خیر خواہی کا شکریہ! میں اپنا بھلا برا سب سمجھتی ہوں۔ کسی استاد کی ضرورت نہیں۔

اشتیاق :- دل کو استاد بنانے والی عورت جلد ہی ٹھوکر کھا جاتی ہے۔

سلمیٰ :- اور عقل کو غلام سمجھ رکھنے والے مرد منہ کی کھاتے ہیں، مگر ذرا دیر میں۔

اشتیاق :- تم سمجھتی نہیں ہو کہ کیا کہہ رہی ہو۔ دیکھو سلمیٰ پچھتاؤ گی۔

سلمیٰ :- (غصہ سے پاؤں پٹک کر) یہاں سے نکل جائیے۔ میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ دھمکیاں دیتے ہیں! جانتے نہیں کہ کمزور آدمی فقط دھمکیاں دیتا ہے۔

اشتیاق :- (لال پیلا ہو کر اسے گھورتا ہے) اچھا! (تیزی سے نکل جاتا ہے۔ سلمیٰ کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑی رہتی ہے۔ پھر علیم کو دیکھ کر اس کے پاس جاتی ہے)

سلمیٰ :- (زور سے) کہئے کوئی دلچسپ خبر ہے؟

علیم :- جی؟ جی آج کوئی دلچسپ خبر نہیں ہے۔ اخبارات پھیکے ہیں۔

سلمیٰ :- پھر بھی آپ ان کو پڑھے جاتے ہیں۔ تعجب ہے ــــ اچھا یہ آپ اپنے کانوں کا علاج کیوں نہیں کراتے؟

علیم :- علاج سے کیا فائدہ؟ اس زمانہ میں مس سلمیٰ بہرا ہی رہنا اچھا ہے۔ کہ دنیا والوں کی یاوہ گوئی سنائی نہ دے۔

سلمیٰ :- آپ کے خیالات کتنے پاکیزہ ہیں (اتنے میں احتشام داخل ہوتا ہے)

احتشام :- کیا کانا پھوسی ہو رہی ہے؟

سلمیٰ :- نہیں کچھ نہیں۔ (علیم سے) مسٹر علیم احتشام صاحب ایک بار کہہ رہے تھے، سوسائٹی کی نجات اسی میں ہے کہ وہ بہری ہو جائے۔

علیم :- (سر ہلا کر) ہاں ہاں۔ مجھے اتفاق ہے۔ احتشام صاحب ہیں تو نوجوان مگر نظر بڑے بوڑھوں کی رکھتے ہیں۔ اس کلب میں دو ہی افراد ہیں جنہیں میں پسند کرتا ہوں، ایک مسٹر احتشام اور ایک آپ مس سلمیٰ ــــ اچھا۔ اب آپ جائیں۔ لیکچرار صاحب آپ سے بات چیت کرنے آئے ہیں۔ نوجوان دلوں کو بوڑھے سے بات کرنے میں کیا خاک لطف آئے گا؟ (ہنستا ہے۔ دونوں ہٹ آتے ہیں)

احتشام :- سچ کہتے ہیں، بہرے آدمی کی نظر تیز ہوتی ہے۔ دیکھو۔ وہ تاڑ گئے ہیں کہ ہم میں سے ایک شمع ہے اور ایک پروانہ۔ (رک کر) کچھ کہتی نہیں ہو؟ ارے کیا بات ہے؟ یک بیک روٹھ کیوں گئیں؟ بتاؤ تو سہی۔

کیا بات ہے؟ سلمیٰ۔ سلمیٰ!

سلمیٰ:۔ (ہنس کر) میں ذرا بہری بن گئی تھی۔
آپ نے ایک ذکر چھیڑ دیا۔ اس سے نجات پانا چاہتی تھی۔

احتشام:۔ بھئی وا! میں تو سچ مچ ڈر گیا۔۔۔
سلمیٰ۔ میں آج تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

سلمیٰ:۔ براہ کرم اس "بہت کچھ" کو ذرا مختصر بیان
کیجئے۔ لکچر نہ بنا ڈالئے۔

احتشام:۔ سلمیٰ۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ تم میرے
دل کی رانی ہو۔ تمہارے بغیر میں جی نہیں سکتا۔ یہ اور اس
قسم کے فقرے میں فرفر سنا سکتا ہوں کہ تم سنو اور یقین کرلو۔
مگر نہیں۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔ بلکہ یہ کہوں گا۔ سلمیٰ
مجھے تم سے پیشنٹ عشق نہیں ہے۔ تمہیں دیکھے بغیر مجھ پر
اضطراب اور بیقراری کے دورے نہیں پڑتے۔ راتیں
تارے گننے میں گذرتیں۔ تم میری نہ ہوئیں تو اس پہاڑ
پر میں فرہاد کی طرح سر پھوڑ کر مر نہ جاؤں گا یا قیس کی طرح
راجپوتانہ کے صحرا کی خاک چھاننے نہ لگوں گا۔۔۔ میں
ان میں سے کوئی چیز نہیں۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا،
کہ سلمیٰ۔ ان ملاقاتیوں میں میں نے تمہارا گہرا مطالعہ
کیا۔ تمہارے خیالات، تمہاری طبیعت، تمہارے رجحانات
ان سب پر میں نے نظر رکھی۔ اور پایا کہ تم ایک کامیاب
ایک آئیڈیل بیوی بن سکتی ہو۔ اور کئی دن کے غور و فکر
کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ درخواست کروں کہ اگر تم محسوس
کرتی ہو کہ مجھ جیسا مرد جس کی آمدنی موجودہ اعلیٰ معیار سے بہت
کم ہے جس کے خیالات بھی مروجہ معیار سے گرے ہوئے نظر
آتے ہوں تمہارا شوہر بن سکتا ہے اور تمہاری زندگی کو
پرمسرت بنا سکتا ہے۔۔۔ اگر تم یہ سب محسوس کرتی ہو،
تو مجھے اجازت دو کہ میں تمہارے والد صاحب سے گفتگو
کروں۔۔۔ سلمیٰ۔ معاملہ بہت اہم ہے۔ اس پر خوب
اچھی طرح غور کرلو۔ مجھے جلدی نہیں ہے۔ تمہاری زندگی کا
سوال ہے۔ ہر پہلو پر غور کرکے مجھے جواب دو۔ اگر تم نے
میری استدعا قبول کرلی تو قدرتاً مجھے خوشی ہوگی۔ میری
زندگی میں جو خلا سا محسوس ہو رہا ہے وہ پُر ہو جائیگا۔

سلمیٰ:۔ اور اگر میرا جواب نفی میں ہو تب۔۔۔؟

احتشام:۔ اگر تمہارا جواب نفی میں ہو تو۔۔۔ تو
یہ میری بدقسمتی ضرور ہوگی۔ لیکن میں یہ محسوس کرنے بھی
لگوں گا کہ میرے اندر کوئی کمی ضرور ہے کہ تمہارے معیار
پر پورا نہ اتر سکا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ میرا دل
بجھ نہیں جائے گا۔ میں زندگی سے تنگ نہیں آ جاؤں گا۔
بنی نوع انسان اور خصوصاً عورت سے نفرت نہیں ہو جائیگی۔
سماج سے بغاوت کا مادہ پیدا نہ ہو جائے گا۔۔۔
نہیں۔ ایسی مجنونانہ حرکتیں مجھ سے سرزد نہ ہوں گی۔
بلکہ میں پہلے کی طرح زندگی کی شاہراہ پر قدم بڑھاتے
جاؤں گا، کہ میری زندگی کا ایک مقصد ہے، اور اس مقصد سے
بیوفائی ممکن نہیں۔ ہاں۔ یہ خلش دل میں رہے گی کہ
تم سی شریک حیات کے دست تعاون سے محروم ہوں۔

سلمیٰ:۔ سچ کہئے۔ مجھ سے آپ کو نفرت تو نہ ہو جائیگی۔

احتشام :- نہیں سلمیٰ جس گھڑی تم سے نفرت ہو گئی، سمجھ لو مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ۔

سلمیٰ :- آپ فرشتہ خصلت ہیں، مجھے معلوم تھا۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ آپ مسٹر اشتیاق سے نفرت کرتے ہیں ۔

احتشام :- ہاں مجھے اشتیاق سے نفرت ہے۔ اس لئے نہیں کہ خود غرض ہوں۔ اس لئے نہیں کہ وہ ملّا ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں اس کو رقیب سمجھتا ہوں بلکہ اس لئے کہ وہ اپنے مالدار ہونے سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ تعلیم یافتہ اور مہذب کہلانے کے باوجود اس کا وجود سوسائٹی کے لئے نقصان رساں بن گیا ہے —

(جبار داخل ہوتا ہے)

جبار :- مسٹر احتشام! یہ غالباً آپ اپنی ہی نسبت کہہ رہے ہیں ۔

سلمیٰ } ابا!
احتشام } آداب عرض!

جبار :- آپ کو تعلیم یافتہ ہونے کا دعویٰ ہے۔ قوم کے نونہالوں کو تعلیم دینے کا فخر حاصل ہے۔ لیکن آپ کے قول و فعل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شرم کی بات ہے!

سلمیٰ :- ابا آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

جبار :- وہی کہہ رہا ہوں جو میرے دل میں ہے۔ جو حقیقت ہے ۔

احتشام :- میں جناب کا مطلب نہیں سمجھا ۔

جبار :- آپ کیوں سمجھنے لگے! آپ تو بس اتنا سمجھتے ہیں کہ دوسرے کی رسوائی ہوا کرے۔ دنیا چاہے کچھ ہی کہے۔ بلا سے، مگر آپ کو ——

سلمیٰ :- ابا! ابا! آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟

جبار :- سلمیٰ! تم چپ رہو، مجھے تم سے بھی بہت کچھ کہنا ہے۔ مگر اس وقت نہیں۔ اس وقت تو میں ہمارے لکچرار صاحب کو سبق دینے آیا ہوں ۔

احتشام :- میں اب بھی نہیں سمجھا بیرسٹر صاحب کہ الزام مجھ پر کیا ہے؟ (ذاکرہ، اشتیاق، مختار وغیرہ یکے بعد دیگرے نمودار ہوتے ہیں۔)

جبار :- آپ کے تجاہل عارفانہ کی داد دینی پڑتی ہے۔ آخر مجھے کھول کر بیان کرنا پڑا۔ لکچرار صاحب۔ کلب ایک ایسا مقام ہے! جہاں لوگ چند گھنٹے مل کر بیٹھیں۔ ہنسیں بولیں اور چلے جائیں۔ مگر کلب ایسا مقام تو نہیں ہے جہاں مرد عورت کی ہستی کا احترام کرنا نہ جانتے ہوں اور آئے دن کوئی نہ کوئی رسوا کن واقعہ پیش آتا رہتا ہے۔

احتشام :- میں اب سمجھا —— بیرسٹر صاحب۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ آپ عجیب باتیں کر رہے ہیں اور مجھ پر ایسا سنگین الزام لگا رہے ہیں جس کا ثبوت آپ کے پاس نہیں ہے ۔

جبار :- اوہو! جناب تو قانونی بحث پر اتر آئے۔ ڈھٹائی تو ملاحظہ ہو کہ ثبوت مانگتے ہیں! اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا چاہیئے کہ خود کلب کا سکرٹری چہ میگوئیاں

پریشان ہوکر میرے پاس آتا ہے اور مدد کا طالب ہوتا ہے ــــ کیوں سکرٹری صاحب ؟ کیا ایسا نہیں ہے ؟

مختار :- (جلدی سے) جی ہاں۔جی ہاں۔دیکھئے میری پوزیشن بہت بے ڈھب ہے۔معاملہ کلب کا ہے۔ کلب کی نیکنامی کی خاطر مرضی کے خلاف ناگوار کام کرنے پڑتے ہیں۔

سلمیٰ :- (جوش سے۔رونے کے آثار) یہ جھوٹ ہے! سراسر جھوٹ ہے!

مختار :- خدا کرے کہ ایسا ہی ہو! مگر ان سرگوشیوں ان چہ میگوئیوں کا کیا علاج ؟ دوسرے معزز اراکین کلب میرے علم میں یہ بات لائے ہیں۔اور مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔میں کسی کا دشمن نہیں۔سب اراکین میری نظر میں قابل عزت ہیں۔مگر خراب اخلاقی اثرات ــــ

سلمیٰ :- (رو کر) یا اللہ! یا اللہ! ــــ ابّا! ابّا! یہ جھوٹ ہے ــــ خداوندا! ــــ میں آپکو کس طرح سمجھاؤں ؟ یہ سراسر بہتان ہے! ــــ

احتشام :- بیرسٹر صاحب! یہ صحیح ہے کہ مس سلمیٰ کی میری دوستی ہے۔یہ صحیح ہے کہ ہم دونوں اکثر ایک دوسرے کے ساتھ نظر آئے ہیں۔لیکن اسکے معنی ہرگز وہ نہیں ہیں جو آپ کو سمجھائے گئے ہیں۔واقعات بظاہر میرے خلاف ہیں۔اور آپ مجھے کمینہ سمجھئے۔رذیل سمجھئے۔بدمعاش سمجھے۔مگر آپ مس سلمیٰ کے والد ہیں کم ازکم مس سلمیٰ پر تو اعتماد کیجئے۔خدارا یہ خیال تو پیدا نہ ہونے دیجئے کہ ایک باپ نے غیروں کی قیاس آرائیوں کو اہمیت دی۔اور بیٹی پر ظلم کیا۔

جبار :- خاموش رہو! بدتمیز کہیں کے! ایک سانس میں خدا جانے کیا کیا بک گئے! شرم نہیں آتی!

احتشام :- آپ کی خفگی سر آنکھوں پر۔مگر میں اس طرح مس سلمیٰ کی مدافعت سے باز آنیوالا نہیں ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ ــــ

اشتیاق :- جھوٹی قسمیں نہ کھاؤ۔

احتشام :- آپ خاموش رہیں تو بہتر ہے۔آپکا اس معاملہ سے کوئی تعلق صحیح نہیں ہے۔

اشتیاق :- تعلق براہ راست تو نہیں۔مگر معاملہ کلب کا ہے۔اور بولنے کا حق مجھے بھی اسی طرح ہے جس طرح مسز ذاکرہ کو یا مسٹر کلیمی کو ــــ بہرحال مسٹر جبار۔اس معاملہ کو آگے نہ بڑھایا جائے۔رسوائی کا اندیشہ ہے۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ سکرٹری صاحب فوراً جنرل میٹنگ طلب کریں اور مسٹر احتشام کو کلب سے خارج کردیا جائے۔

مختار :- یہ تدبیر مناسب ہے۔مجھے دلی افسوس ہے کہ اس کی نوبت آرہی ہے۔مگر کیا کریں، مجبوری ہے۔ یہ حادثہ پہلا اور آخری ہو میری یہی تمنا ہے۔

ذاکرہ :- اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔مس سلمیٰ کا انصاف سے دیکھئے تو کوئی قصور نہیں ہے۔اور سچ پوچھئے تو ایسے واقعات میں قصوروار عورت نہیں ہوتی۔وہ مجبور ہوتی ہے۔مگر غضب ہے کہ اب تک

مردوں کے ظلم و زبردستی سے سزا بیچاری عورت ہی کو ملتی رہی۔ یہ زمانہ ترقی کا ہے۔ تہذیب کا ہے۔ روشن خیالی کا ہے۔ خدا کی قسم اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ اب خمیازہ اصلی مجرم کو بھگتنا پڑے گا۔ انصاف کا پھندا مرد کے گلے میں ڈالنا چاہئیے۔ ایمان کی بات تو یہی ہے۔

اشتیاق :۔ حامی نسوان ہونے کی حیثیت سے مجھے اس سے اتفاق ہے۔ اور مسٹر کلیمی۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

کلیمی :۔ ہیں ہیں ہیں ..... مجھے اتفاق ہے۔ ...... ہیں ہیں ہیں !

علیم :۔ (اٹھ کر سامنے آتے ہوئے) مگر مجھے اختلاف ہے۔ (سب حیران ہوکر اس کی طرف دیکھتے ہیں)

اشتیاق :۔ یہ بہرا کیا بک رہا ہے؟ (زور سے) کیا فرمایا جناب نے؟

علیم :۔ اتنے زور سے نہ بولئے۔ میں بہرا نہیں ہوں (سب کی زبان سے ایک ساتھ نکلتا ہے "بہرے نہیں ہیں؟") جی نہیں۔ میں واقعی بہرا نہیں ہوں۔

اشتیاق :۔ بہرے نہیں ہیں؟ تو پھر ابتک ہم کو دھوکا دیتے رہے؟

ذاکرہ :۔ بہرے بن کر ہماری باتیں سنا کرتے رہے؟ شرم نہ آئی!

مختار :۔ کلب کے دستور کی رو سے دھوکا دینا بھاری جرم ہے دفعہ (۳۵) ہے، کہ اگر کوئی رکن کسی دوسرے رکن یا اراکین کو کلب کی چار دیواری کے اندر بالواسطہ یا بلاواسطہ دھوکا یا فریب یا دغا دے یا دینے کی کوشش کرے یا دینے پر مائل ہو یا پایا جائے تو اس رکن کو دوسرے رکن کا یا اراکین کے مطالبہ پر یا اس کے بغیر دھوکے یا فریب یا دغا کی نوعیت کے اعتبار سے سزا یا سزائیں دی جائیں گی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

علیم :۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے کلب والوں کو دھوکے میں رکھا۔ یعنی اپنے کو وہ ظاہر کیا جو در اصل نہ تھا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا آج کل اکثر آدمی اپنے کو وہ ظاہر نہیں کرتے جو وہ نہیں ہوتے؟ مسٹر اشتیاق اپنے آپ کو تہذیب اور کلچر کا پتلا ظاہر کرتے ہیں مگر ہیں کچھ اور۔ مسز ذاکرہ اپنے کو ترقی نسوان کا علمبردار ظاہر کرتی ہیں۔ مگر ہیں کچھ اور۔ مسٹر مختار کلب کے سکرٹری کی حیثیت سے اپنے کو قاعدہ قانون کا پابند ظاہر کرتے ہیں۔ مگر در اصل ہیں کچھ اور۔ حال جب یہ ہے تو میری خطا اس میں کیا ہے اگر میں نے اپنے کو بہرا ظاہر کیا اور ہوں کچھ اور۔ چڑ چڑ ہونے کے بجائے آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے کہ میں نے آپ کی سوسائٹی کے مسلمہ اصول پر عمل کیا۔

اشتیاق :۔ یہ سراسر ریاکاری ہے۔ جلسہ اظہار مذمت کے لئے فوراً طلب کرنا چاہیئے۔

ذاکرہ :۔ ہاں ہاں۔ ہم ملامت کا ووٹ باتفاق آراء ان کے خلاف ضرور پاس کریں گے۔

مختار :- کلب کی رکنیت سے انھیں خارج کردینا چاہیئے۔ ایسے آدمی سوسائٹی کے لئے خطرۂ عظیم ہیں۔

علیم :- شوق سے مجھے اور احتشام صاحب کو خارج کر دیجئے۔ ہمیں پروا نہیں۔ مگر پہلے یہاں مسٹر احتشام کے معاملہ کا تصفیہ ہونا ہے ــــ مسٹر جبار۔ میں اس معاملہ کی ساری تفصیلات سے واقف ہوں۔ آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ آپ ایک سازش کا شکار بن گئے۔

جبار
احتشام } :- سازش!

علیم :- جی ہاں۔ سازش۔ ایک گہری سازش جال بڑی چالاکی سے بچھایا گیا تھا۔ اور آپ اس میں پھنس گئے۔

جبار :- مگر اس سازش سے کیا فائدہ تھا؟

علیم :- مسٹر جبار۔ آپ کلب بہت کم آیا کرتے ہیں۔ اس لئے واقعات سے بے خبر ہیں۔ ہمارے دوست اشتیاق صاحب آپ کی صاحبزادی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ مس سلمیٰ نیک و بد کی تمیز رکھتی ہیں۔ انھوں نے ٹکا سا جواب دیدیا۔ مسٹر اشتیاق کو بہت برا لگا۔ یہ دیکھ کر کہ مس سلمیٰ مسٹر احتشام کی خوبیوں کی گرویدہ ہوگئی ہیں انھوں نے حسد کے مارے احتشام کو بدنام کرنے کی کوشش کی، اور کامیاب ہوگئے ہوتے اگر میرا بہرا پن کام نہ آتا۔

اشتیاق :- یہ سب جھوٹ ہے۔ تہمت تراشتا ہے۔

جبار :- اشتیاق صاحب۔ آپ سچی بات کہہ دیں۔ ورنہ آپ کے لئے برا ہوگا۔

اشتیاق :- میں نے کہہ دیا۔ اس شخص نے دل سے گھڑا ہے۔ اسے مجھ سے کد ہے۔

جبار :- اچھی بات ہے۔ تو گویا آپ چاہتے ہیں کہ میں قانونی چارہ جوئی اختیار کروں ــــ سکرٹری صاحب۔ آپ سچ سچ کہہ دیں۔

مختار :- (پریشان ہوکر) جی۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ جی وہ۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔ مسٹر اشتیاق نے۔۔۔۔ جی۔ جی ہاں۔ یہ صحیح ہے۔۔۔۔

مختار :- جی۔۔۔ جی ہاں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ نیکنامی بہت عزیز ہے ــــ مجھے معاف کر دیجئے۔

جبار :- مسٹر اشتیاق۔ آپ اس خیال میں نہ رہیں۔ کہ آپ کے پاس پیسہ بہت ہے۔ آپ کا اثر و رسوخ زیادہ ہے۔ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو میں دکھا کے چھوڑوں گا۔ کہ کسی کی شہرت کو خاک میں ملانے کی کوشش سے بعض وقت اپنی ہی شہرت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

احتشام :- اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔

جبار :- (اس کا ہاتھ پکڑ کر) احتشام۔ مجھے معاف کر دو۔ میں واقعی حد درجہ نادم ہوں۔ میں نے تمھارے ساتھ ظلم کیا۔ میں بیوقوف بن گیا تھا۔ سلمیٰ اپنی ماں کی نشانی ہے۔ مجھے وہ کتنی عزیز ہے۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میں اندھا بن گیا تھا۔ عقل و خرد کھو بیٹھا تھا ــــ احتشام مجھے معاف کر دو۔

احتشام :- آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ بات ہی کیا تھی؟ آپ میرے بزرگ ہیں ــــ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ ہمارے ان کرمفرما دوستوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنے والے ہیں۔ میری خاطر سے اس کا خیال چھوڑ دیجئے۔ ہماری سوسائٹی کے ان عناصر کو اپنے مقابل میں لانا اپنی ہی تذلیل ہے۔

جبار :- مگر احتشام۔ انھیں سبق تو ضرور دینا چاہئے کہ آئندہ وہ ایسی حرکتوں سے باز رہیں۔

احتشام :- طبیعت کو بدلنے کی توقع ایک بہت بڑی توقع ہے۔

علیم :- احتشام کا خیال درست ہے۔ ان اشخاص کو قانونی کارروائی کے بھی قابل نہ سمجھنا، یہی ان معززین کی سب سے بڑی ذلت ہے

جبار :- اچھی بات ہے۔ آپ کی یہی رائے ہے تو یوں ہی سہی۔ آپ میرے محسن ہیں۔ ایک نازک وقت میں میری مدد کی ہے۔ میرے پاس شکریہ کے الفاظ نہیں ہیں۔ آج آپ نہ ہوتے تو میں جوش جنون میں خدا معلوم کیا کچھ کر گزرتا۔ سوسائٹی کے ان روح رواں افراد کا ظاہر اور آپ کا ظاہر یعنی بہروپ، دونوں ریاکاری پر مبنی تھے۔ مگر ایک مہلک تھا اور ایک جان بخش۔

احتشام :- جی ہاں۔ مسٹر علیم کا ممنون ہونے کا حق سب سے زیادہ مجھے ہے۔

سلمیٰ :- نہیں۔ مجھے ہے۔ میرے دل میں مسٹر علیم کی عزت و وقعت پہلے سے تھی۔ مگر اب وہ دگنی ہو گئی ہے۔

جبار :- مگر بیٹی سلمیٰ۔ میری عزت و وقعت کہیں آدھی نہ رہ گئی ہو اس کا مجھے اندیشہ ہے۔

سلمیٰ :- (بھرائی ہوئی آواز) یہ آپ کیا کہتے ہیں ابا؟

جبار :- سلمیٰ۔ میں معاملہ فہم مشہور ہوں۔ مگر محبت کے جوش میں ہوش و حواس کس طرح گم ہو جاتے ہیں۔ یہ مجھے آج معلوم ہوا۔ اگر تم اپنے بوڑھے باپ کی غلطی کو معاف کرنے کی ضرورت سمجھتی ہو تو ایسا کرنا۔ ورنہ یہ سمجھ لینا کہ اپنے اندھے پن کا پچھتاوا اسے مرتے دم تک رہیگا۔

سلمیٰ :- (اس کے گلے سے لگ کر) ابا! ابا!

جبار :- میری بیٹی! میری سلمیٰ!

احتشام :- مسٹر اشتیاق۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ جیسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ آپ نے میرے خلاف سازش کی۔ میں ایک ایسے طبقہ کا نمائندہ ہوں جو کام کرتے ہیں زندہ رہنے کے لئے۔ اور آپ اس گروہ کے فرد ہیں جو زندہ رہتے ہیں۔ دوسروں کو اپنے لئے کام کرتے دیکھنے کے لئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ آپ جیسی ہستی نے مجھ جیسے ہیچ پوچ قسم کے آدمی کے خلاف سازش کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ یہ آپ کے شایان شان تو نہ تھا۔

اشتیاق :- میں معافی چاہتا ہوں۔

احتشام :- میں معاف کرتا ہوں اگر یہ معافی آپ سچے دل سے چاہ رہے ہیں۔ لیکن اگر آپ اب معافی

چاہیں اور میرے پیٹھ پھیرتے ہی کہنے کا ارادہ رکھیں کہ کمبخت بچ کے نکل گیا، تو ——— تو ایسی صورت میں آپ مجھے معاف ہی رکھیں۔

اشتیاق :- کیا میری ذلت کافی نہیں ہوئی ہے کہ آپ مجھے اور ذلیل کر رہے ہیں؟ میں آپ کا ناکام دشمن ثابت ہوا۔ اب کامیاب دوست بننے کا موقع دیجئے۔

مختار :- مجھ سے بھی غلطی ہوئی۔ میں کلب کی سکریٹری شپ سے بلا جبر و اکراہ و بہ ثبات ہوش و حواس مستعفی ہوتا ہوں، کہ مسٹر احتشام یہ عہدہ لیں تاکہ کلب کی نیک نامی میں فرق نہ آئے۔

کلیمی :- ہیں ہیں ہیں!.... مجھے بھی معاف کر دیجئے ..... ہیں ہیں ہیں!

سلمیٰ :- مسز ذاکرہ۔ آپ اپنی ہی صنف کی ایک فرد کی رسوائی میں مدد کریں گی، آپ سے یہ امید نہ تھی۔

ذاکرہ :- سلمیٰ۔ میں.... میں.... مجھے معاف کر دو۔ بڑی خطا ہوئی۔ تمہیں میری قسم۔ معاف کر دو۔

سلمیٰ :- میں نے معاف کیا۔ میرے خدا نے معاف کیا۔ (استاد داخل ہوتے ہیں)

علیم :- اور اب مسٹر جبار۔ مجھے ایک اور معاملہ پیش کرنا ہے۔ آپ جس وقت یہاں آئے ہیں، تو سلمیٰ اور مسٹر احتشام ایک اہم مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ میں بیٹھا سن رہا تھا۔ احتشام کہہ رہے تھے کہ تم میرے ساتھ شادی پر راضی ہو تو میں تمہارے والد صاحب سے اجازت لینے جاؤں گا۔

جبار :- احتشام۔ کیا علیم صاحب نے ٹھیک سنا؟

احتشام :- جی ہاں۔ ان کے کان ضرورت سے زیادہ تیز ہیں۔ (کلیمی کی ہنسی)

علیم :- اور مسٹر جبار۔ میں اس نوجوان کی پرزور سفارش کرتا ہوں۔ زبانی کافی نہیں، تو تحریر بھی لکھ دینے پر آمادہ ہوں۔

جبار :- احتشام۔ تمہاری سفارش ایک ایسے بزرگ کر رہے ہیں کہ رد کرنا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔

احتشام :- تو میں اس کو آپ کا قطعی جواب سمجھوں؟

جبار :- میں انکار کر کے سلمیٰ کے دل کو دکھ پہنچانا بھی نہیں چاہتا۔

احتشام :- شکریہ۔ شکریہ۔

جبار :- شکریہ میرا نہیں بلکہ اپنے وکیل کا ادا کرو۔ انہوں نے مقدمہ بڑی قابلیت کے ساتھ پیش کیا

احتشام :- جی ہاں۔ میں عمر بھر ان کا شکر گزار رہوں گا۔

علیم :- نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ شادی کے بعد بچہ ہو تو اس کا نام علیم رکھنا۔ بس اتنا کافی ہے۔

جبار :- بشرطیکہ بچہ بہرا نہ ہو (کلیمی کی ہنسی) استاد کہتے ہیں "مبارک ہو؟! واللہ۔ مبارک ہو اہم ایک بانکا سہرا لکھیں گے"

احتشام :- ہاں قبلہ۔ بہرا بننے کی تو آپ کو خوب

سوجھی تھی۔ مگر آخر اس کا مقصد کیا تھا؟

علیم :- مقصد اس کا ضرور تھا۔ میں ایک افسانہ نگار ہوں۔ افسانہ نگار کو مواد کی تلاش رہتی ہے یہاں پر آنے کے بعد میں نے ترکیب سوچی، کہ بہرا بن جاؤں۔ سب کی سنوں۔ اپنی نہ کہوں۔ تھوڑی دیر پہلے مسز ذاکرہ "راوی" کے فرضی نام سے لکھنے والے افسانہ نگار کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ میں وہی "راوی" ہوں۔ (سب حیرت سے کہتے ہیں) "آپ راوی ہیں!" جی ہاں بندہ ہی "راوی" ہے۔ مسز ذاکرہ میرے افسانوں کو خراب سمجھتی ہیں، مجھے خوشی ہوئی یہ معلوم کرکے کہ میرے افسانے زندگی کے آئینہ دار ہیں، جب ہی تو انھیں پسند نہ آئے۔ اور دوستو۔ زندگی کا گہرا مطالعہ کرنا ہو تو بہرے بن جاؤ۔ یہ ایک مجرب نسخہ ہے۔ اس کی بدولت مجھے اس کلب میں اتنا مواد ملا۔ کہ کئی افسانے ہوجائیں گے۔ اور جب وہ افسانے چھپ کر آئیں تو بہتوں کو ان میں اپنے چہرے ناموں کی تبدیلی کے ساتھ نظر آئیں گے ---- اچھا دوستو۔ خدا حافظ! خدا حافظ (جاتا ہے)

استاد :- اجی صاحب۔ واللہ! تازہ مرصع غزل ہوئی ہے۔ پانچ منٹ میں لکھی ہے۔ واللہ آپ بہرے نہیں ہیں۔ افسانہ نگار بھی ہیں۔ آپ کے سر عزیز کی قسم۔ سنتے جائیے۔ مطلع عرض کیا ہے ----

پردہ گرتا ہے۔

نظام کالج میں اسٹیج ہوا تھا۔

گاہے گاہے باز خواں

۱۔ ایک روز شیخ احمد جامی رحمۃ اللہ علیہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور کلاہ نمدی سر پر تھی۔ فرمان رب العزت ہوا۔ "اے احمد کلاہ نمدی بیچتا ہے؟" شیخ نے جواب دیا کہ "خدایا تیرے پاس اس کی قیمت ہے کہ خریدیگا" فرمان باری ہوا کہ "اے احمد جو کچھ تو مانگیگا دوں گا۔ شیخ نے جواب دیا کہ خدایا اگر تو دنیا اور عاقبت مجھے دے تو اس کے عوض نہیں لوں گا۔ اور تو خود پہلے ہی سے میرا ہے اور تیرے پاس کیا ہے کہ دیگا۔ حکم ہوا کہ اے احمد، اتنی بے ادبی نہ کر، ایسا نہ ہو کہ میں اپنے بندوں کو کہدوں۔ اور پھر تیرا کوئی اعتبار ہی نہ کرے۔ شیخ نے کہا کہ تو بھی بس کر ایسا نہ ہو کہ تیرے کرم کا بیان میں تیرے بندوں کے سامنے کردوں اور پھر کوئی آدمی تیری بندگی میں سر تک نہ جھکائے۔

۲۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ خواجہ جنید بغدادیؒ عید کی رات کو اپنی خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ چار شخص مردان غیب سے آپ کی خدمت میں آئے آپ نے ایک ایک کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ تم عید کی نماز کہاں پڑھوگے۔ اس نے کہا مکہ معظمہ میں پھر دوسرے سے پوچھا اس نے کہا مدینہ منورہ میں، تیسرے نے جواب دیا بیت المقدس میں،

پھر جوتھے سے پوچھنے پر جواب دیا۔ بغداد خواجہ ہی
میں حاضر ہوکر نماز پڑھوں گا۔ آپ بہت خوش ہوئے
اور فرمایا تو ان میں سے بہت اچھا زاہد بہت جاننے
والا اور بہت بزرگ ہے۔

۳۔ ایک دفعہ حضرت شیخ احمد معشوق جاڑہ کے
چلہ میں رات کے وقت اپنے گھر سے نکل کر بیچ دریا
میں جا کھڑے ہوئے جو نہایت خطرناک جگہ تھی اور بارگاہ
الٰہی میں عرض کرنے لگے۔ خداوندا میں یہاں سے نہ
جاؤں گا جبتک کہ مجھ کو معلوم نہ ہو جائے کہ میں کون
ہوں، آواز آئی تم وہ شخص ہو کہ فردائے قیامت تمہاری
شفاعت سے اس قدر لوگ بخشے جائیں گے۔ انھوں نے
عرض کیا میں اس بات کو پسند نہیں کرتا۔ مجھ کو یہ معلوم
ہونا چاہیئے کہ میں کون ہوں۔ آواز آئی کہ تم وہ شخص ہو
کہ تمہارے عنایت سے اس قدر لوگ جنت میں جائیں گے۔
شیخ احمد نے کہا مجھ کو یہ بھی پسند نہیں ہے۔ مجھ کو یہ معلوم
ہو کہ میں کون ہوں اس وقت حکم ہوا کہ درویش اور عارف
تو ہمارے عاشق ہیں اور تم ہمارے معشوق ہو پھر جو
شیخ احمد وہاں سے شہر میں واپس آئے تو جو ان کے
سامنے آتا وہ یہی کہتا " السلام علیک یا احمد معشوق "

۴۔ خواجہ مرتعش نور اللہ مرقدہٗ اپنے زمانہ کے
بزرگان سے تھے ایک دفعہ پیاسے جا رہے تھے کسی
دروازہ پر پہنچ کر پانی مانگا۔ ایک نوجوان حسین لڑکی
پانی دینے آئی یہ اس پر عاشق ہوگئے اور ایسے از خود
رفتہ ہوئے کہ پانی بھی نہ پیا متحیر کھڑے تھے کہ صاحب خانہ
آگیا اور ان سے پوچھا کہ تم کون ہو، اور اس طرح
پریشان کیوں کھڑے ہو، خواجہ نے جواب دیا کہ ایک
دل میرے پاس تھا وہ بھی یہاں اس لڑکی کے نذر
کر دیا۔ صاحب خانہ نے کہا آپ غم نہ کھائیگا وہ لڑکی
میری ہے میں اس کی شادی کر دوں گا۔ اور نکاح کی تاریخ
مقرر کر دی۔ خواجہ بہت خوش ہوئے جب نکاح کا دن
آیا تو صاحب خانہ نے کہا کہ آپ یہ جامہ درویشی اتار کر
شاہانہ لباس زیب بدن کیجئے جو میں نے بڑے تکلف
کے ساتھ تیار کیا ہے۔ خواجہ نے کہا بہت اچھا اور اپنا
جامہ اتار دیا۔ فوراً ندا آئی کہ تم نے میرے سوا غیر کی
طرف نگاہ ڈالی تھی اس کے سزا میں جامہ درویشی تم سے
اتروا لیا اب جو دوسری نگاہ کرو گے تو تمہارے باطن سے
معرفت کا خلعت اتار لوں گا۔ خواجہ نے فوراً توبہ کی
اور واپس چلے آئے۔

۵۔ شاہ شجاع کرمانیؒ نے چالیس برس شب بیداری
کی پھر ایک رات جو سوئے تو خواب میں حضرت رب العزت کے دیدار
سے مشرف ہوئے۔ پھر جہاں جاتے جامۂ خواب ساتھ
رکھتے اور لیٹ کر منتظر ہوتے، پھر دیدار ہو، آخر
آواز آئی کہ وہ دیدار چالیس برس کی بیداری کا
نتیجہ تھا۔

ناہید

جلد ۶ مہر ۱۳۵۲ف اگست ۱۹۴۳ء عیسوی نمبر ۱۱

۱- "ماتہران" پڑھیے کہ آپ کو بھی جانے کا اتفاق ہو۔

۲- "فطرت" ایک مختصر سا فسانہ ہے۔

۳- حقیقت یا خواب کی طرح نام بھی فلک ناز عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن آپ کو کام دیکھنا ہے نام کو کیا کیجئے گا۔

۴- مکتوبات جمیل، کا کافی ذخیرہ موجود ہے لیکن ہر مکتوب جمیل نہیں ہوتا ہم وہ مکتوب دیتے ہیں جو بلحاظ انشاء جمیل ہوتا ہے اور جس میں کچھ باتیں کام کی ہوتی ہیں اسلئے اگر کبھی آپ کا مکتوب شائع نہ ہو تو اثر لینے کی ضرورت نہیں۔ پرچہ تو آپکا ہے جو کچھ چاہیں لکھیں لیکن یہ خیال پیش نظر رہے کہ اپنی بہنوں کیلئے مفید ہو۔

۵- مضامین نویسی کے وقت مختصر اور مفید ہونے کا خیال رکھئے کہ کاغذ نہایت گراں ہے۔

۶- ہر مضمون لائق اشاعت نہیں ہوتا اگر کبھی آپ کا مضمون شائع نہ ہو تو اس خطا پر ناہید کو نہ ماریئے کرو گنہگار نہ تھا جیسا کہ بعض مضامین نویس نے محض اس جرم پر کہ ان کا مضمون شائع نہ ہوا خریداری موقوف کردی اور یہ شکایت کی کہ پرچہ کام کا نہیں۔ مگر یہ کس طرح یقین دلائیں کہ باوجود اس کے ناہید کے اب بھی سیکڑوں پرستار ہیں پھر جب کہ اس کا مقصد نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ ہے۔

۷- ایک عرصہ سے آصف جہاں بلگرامی کے خاموشی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی ورنہ وہ پابندی سے لکھا کرتی تھیں۔

ماتھران

جہاں بانو نقوی ایم۔اے

سفر — اور پھر آج کل کا سفر — جبکہ زندگی خود ایک معمہ سی بنی ہوئی ہے۔کسی کو خوبصورت شاندار مکان بنانے کا شوق ہوتا ہے۔کوئی صرف پیسہ جمع کرتا ہے۔اس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہے کہ ہمارا بھی بینک اکاؤنٹ ہے۔کسی کو زیورات، باغات، مکانات اور قطعے وغیرہ خریدنے کا خبط ہوتا ہے۔تو کسی کو صرف مشاہدہ کا جنون۔ جو کمایا بس پھونک دیا۔ایسے لوگ آتش زیرپا ہوتے ہیں۔انھیں زندگی میں جب موقع ملجائے وہ سفر کے لئے اُوٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔اس میں کسی اور کا کیا نقصان ہوتا ہے یا اس طرح کسی کے کہیں آنے جانے سے دوسر کا کیا بگڑتا ہے۔یہ غیر معمولی ذہنیت سمجھ میں نہیں آتی ———!

ان دنوں جا بجا لکھا نظر آتا تھا "ضرورت پر سفر کرو" گویا کسی کی شامت آئی ہے کہ بغیر کسی ضرورت کے بھی سفر کرے۔اور ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی ضرورت کو خود ہی محسوس کرتا ہے۔کسی اور کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بلا وجہ اعتراض کرکے اپنی رہی سہی عزت و وقعت بھی دوسرے کی نظر میں گھٹالے۔اچھے بُرے کی عقل سب کو ہے۔کوئی افلاطون زماں کیوں دخل دیتے ہیں اوروں کے معاملات میں یہ نکتہ سمجھ میں نہیں آتا۔اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اعتراض اور طنز انسان کو ذلیل و حقیر بنا دیتے ہیں۔بالکل وہی مثل ہوئی کہ بیل کے سینگ پر بیٹھ کر مکھی نے یہ کہا کہ کہیں تم دب تو نہیں رہے؟ بعض لوگ مذاق مذاق میں بہت دل دکھا کر بولتے ہیں۔ ان کا اپنا دل کبھی ٹوٹتا نہیں۔پھر کسی دوسرے کے دل کا احساس ہی انھیں کیوں ہونے چلا۔غالب انتہی سمجھ جاوید بیجا اعتراض کرنے والے کا منھ اس طرح بند کر دیتے ہیں ؎

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشہ ہو　　کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

اور کسی دوسرے شاعر نے تو یہاں تک ان کے منھ میں خاک ڈالی ہے ؎

میرے چاک گریباں پر تو تم پھر بعد میں ہنسنا　　ہنسے گی تم پہ دنیا تم خبر لو اپنے داماں کی

اس طرح چند معترض "خیرخواہ" و خیراندیش بہن بھائیوں کو معقول و نامعقول، اُلٹے سیدھے جواب دیتے ہوئے ہم ماتھران چلے آئے۔اس لفظ "ماتھران" کے لفظی معنی ہیں "جس کے ماتھے یا پیشانی پر جنگل ہو"۔ٹرین کا صرف ایک رات کا سفر ہوتا ہے۔حیدرآباد سے شام کے چھ بجے نکلے اور صبح آٹھ بجے ریل پونہ پہنچ گئی۔پونہ سے ۱۰ بجے

بجلی کی ٹرین نکلتی ہے۔ جو مغربی گھاٹیوں، تاریک غاروں اور منظر بدوش فضاؤں سے گذرتی ہوئی ٹھیک شام کے ۴ بجے نیرال پہنچاتی ہے۔ جو ایک گرم میدانی مقام ہے۔ جہاں سے ماتھران اگر چل کر جائیں یا رکشا میں تو ۷ میل کا سفر ہے اور چھوٹی ٹرین سے ۱۳ میل کی مسافت پر۔ نیرال سے ماتھران جو ٹرین جاتی ہے یہ بالکل دور سے کھلونا کی ٹرین معلوم ہوتی ہے۔ یہ ریل پہاڑ کے دامنوں کو تراشتی ہوئی۔ دامان کوہ سے اپنی مسافت دھیرے دھیرے طے کرتی ہے۔ یہ دو گھنٹہ کا سفر بڑا ہی دلچسپ اور ساتھ ہی ساتھ خطرناک و مہیب بھی ہوتا ہے۔ موت آنکھوں میں گھومتی معلوم ہوتی ہے۔ زندگی ایک بے حقیقت سی چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس سفر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسانی زندگی سے اگر "خطرہ" کا عنصر نکال دیا جائے تو زندگی کا آدھا لطف بھی باقی نہ رہے۔ ہیبت و وحشت مہیب ہوتے ہوئے بھی دلچسپ ہوتے ہیں۔ اور بلندی پر پہنچ کر ہی پستی کا احساس ہوتا ہے۔ بلا آسمانی بلندیوں پر پہنچ کر نشیبی پستیوں کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔ جوں جوں ہم ماتھران سے قریب ہوتے جاتے ہیں لق و دق سبز سبز جنگل، اونچے اونچے پہاڑی درخت اپنا سایہ راستوں پر ڈالے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ مقام سطح آب سے ۲ ہزار ۶ سو فٹ بلند ہے۔ کچھ ایسی زیادہ بلندی نہیں، مہابلیشور سے بہت سی چیزیں ملتی جلتی ہیں لیکن نسبتاً مہابلیشور سے گرم جگہ ہے۔ راستوں کا نشیب و فراز، اونچی نیچی پہاڑیاں، درختوں کا گنجان زمردین سلسلہ۔ غرض ع طاقت کہاں کہ دید احسان اٹھائیے"

کاغذ بے انتہا گراں ہوگیا ہے۔ یورپ کے رسائل نے مختصر نویسی سے اپنے آپ کو زندہ رکھا ہے اسلئے آپ بھی جو مضمون لکھیں چاہے وہ فسانہ ہو یا کوئی اور مختصر نویسی کا کمال دکھایئے گویا سمندر کو کوزہ میں بند کیجئے۔

یہاں کی صبح بڑی دلکش و دلنواز ہوتی ہے۔ دن بڑے سلونے اور شام بڑی سہانی ہوتی ہے۔ راتیں بالعموم ٹھنڈی اور خوشگوار۔ اس میں شک نہیں اپریل کے مہینہ میں دن کے ایک بجے سے آگ تو نہیں کہہ سکتے، ہاں دھیمی دھیمی آنچ کی ہلکی ہلکی سی جھلکیاں ضرور محسوس ہونے لگتی ہیں۔ لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ جیسے کوئی ہوا کی پھرکی گھما دیتا ہے۔ بڑی سبک خرامی سے ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ شام ہونے ہونے تک یہ سر سبز چٹیل یہ درختوں کی گنجان حسین وادی تھوڑی بہت ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ اور موسم خوشگوار ہو جاتا ہے۔ جان میں جان آجاتی ہے۔ بس گرمی یہاں ایسی کہ یہ تھی اور یہ گئی۔

اواخر مئی میں ۳-۴ راتیں ساون کا احساس دلاتی ہیں۔ غضب کی بجلیاں، قیامت کی گرج اور کڑک۔ ۱½ گھنٹہ برس کر تھم گیا۔ اور بقیہ دن ٹھنڈے اور خوشگوار ہوگئے۔ جنگل و وحشت کی راتیں یوں ہی کیا کم بھیانک

ہوتی ہیں۔ اس پر مستزاد ایسی خوفناک بجلیوں کے ساتھ اس کی آمد۔ جیسے بجلی ہمارے ہی چھت پر گری۔ گویا آسمان ہم سے بہت قریب ہے۔ ہوا اس زور سے چلتی تھی کہ معلوم ہوتا بیسیوں اژدھے پھنکاریں مار رہے ہوں۔ عناصر کی یہ دہلا دینے والی ہلچل بھی آخر تھم گئی۔ صبح دیکھا تو جنگل کے بعض پیڑ بجلی سے جل گئے تھے۔ ہمارا گسٹ ہاؤس ایک بلند چٹیان پر واقع ہے۔ جس کے تین طرف گھنا جنگل اور سہانے سے دشت ہیں۔ اور ایک طرف کچھ مکانوں کا سلسلہ۔ یہ غالب کے گھر کی طرح بے در و دیوار سا ایک مختصر مکان ہے۔ جس پر تمام دن درختوں کا سایہ رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مکان دوسرے مکانوں سے نسبتاً ٹھنڈا ہے۔ پتوں کی سرسراہٹ میں ایک سُریلا شور۔ شب کے مہیب سناٹے میں ۔۔۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی رقص کر رہی ہو ۔۔۔ یا ہوا پتوں سے ہولے ہولے، چپکے چپکے، سرگوشیوں میں، زندگی کے راز عیاں کر رہی ہو ؎

جو وطن میں ہیں مبارک ہو وطن کی صبح ان کو　　　میری شام دہشتِ غربت بھی ہے کس قدر نی سہانی

غروب آفتاب کا سماں جنگل و دشت میں قابل دید ہوتا ہے۔ جس کا نقشہ یا تو مصور کے قلم کی طاقت رہین منت ہے۔ یا پھر بغیر شاعر کے سہارے قلم نہیں چل سکتا۔ جوش کے الفاظ نے کچھ ایسی مصوری کی ہے ؎

پارہ پارہ ابر، سرخی، سرخیوں میں کچھ دھواں　　　بھولی بھٹکی سی زمیں کھویا ہوا سا آسماں

تو یوں موسم غیر شاعرانہ ہرگز نہیں ہے۔ اس میں لطافت و کیف ضرور ہے۔

راستوں پر قریب قریب ہر سمت، درخت سایہ دار ملتے ہیں۔ انشاؔ کی پیشین گوئی ع "ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں" نا تہران کے صرف ایک گوشہ میں بستی ہے۔ کچھ آبادی اور چہل پہل۔ ورنہ جس طرف رخ پلٹا۔ نظر اٹھی، دُور دُور تک جنگل۔ میلوں تک بعض وقت انسان نہیں ملتے۔ دکھائی دیتے ہیں تو بندر اور لنگور۔ ان کی ٹولی کی ٹولی ہوتی ہے۔ بندر تو صرف ڈراتا ہے۔ بندر بھبکی جو مشہور ہے۔ اور لنگور انسان سے ذرا جھجکتا ہے۔ تاہم ۔۔۔ پُر تصنع، فریبی، وضعدار، مکّار انسانوں سے یہ بے زبان، بد قطع، بد وضع بے ڈھنگی مخلوق کتنی سندر ہے۔ جن کے ظاہر سے جن کا باطن الگ نہ ہو۔

قلّتِ آب کی اس مقام پر پہلے بڑی شکایت تھی۔ جس کی تلافی کے اسباب کچھ تو جھرے ہیں۔ کچھ چشمے۔ ایک مالٹ کا چشمہ کہلاتا ہے۔ سُنتے ہیں یہاں کا پانی آبحیات کی تاثیر رکھتا ہے۔ اس میں فولاد کی آمیزش ہے۔ اور بھی کئی چشمے ہیں۔ مگر مالٹ کے چشمہ کا پانی اتنا صاف ستھرا اور میٹھا جیسے مور کے آنسو ۔۔۔ سرسبز وادیوں کے نشیب میں ایک خوبصورت سا تالاب ہے جس کی ایک سمت سبزی کا کھیت۔ چونکہ بندروں کی یہاں کثرت ہے کھیت پنپنے نہیں پاتے۔

سبزی اور پھل کی نشو و نما کو ان کے وجود سے بڑا نقصان پہنچتا ہے۔

ذرائع آمد و رفت پہلے مَن چلی ایک پالکی نما سواری تھی۔ جواب کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ لیکن فی الوقت رکشا اور گھوڑے ہیں۔ اول الذکر بڑی مہنگی پڑتی ہے۔ رکشا کو ایک آدمی کھینچتا ہے اور دو پیچھے سے ٹھیلتے ہیں۔ رکشا میں صرف ایک آدمی کے بیٹھنے کی یہاں کا قانون اجازت دیتا ہے۔ جہاں قانون کی پابندیاں اور سختیاں ہیں وہاں یہ عالم ہے۔ اور شاید جہاں قانون نہیں ہوتا وہاں اخلاق بھی ایک بے معنی سی چیز ہو جاتے ہیں۔ ایک رکشا میں پردے لگا کر ہم بھی بیٹھتے ہیں۔ کھینچنے والا شامت کا مارا صرف ایک ہوتا ہے۔ کیا ہے تو چار پیسے زیادہ دیدئے۔ لاکھوں کی جان تو نہیں جس کے جانے کا افسوس ہو۔ یہاں پر رکشا والے غیر معمولی تندرست و تنومند ہوتے ہیں حیدر آباد میں جو بدنصیب رکشا کھینچتا ہے اس کو تو چھ ماہ بعد دِق ہو جاتی ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ غریب کا جینا ہی کتنا کونسی اصولی خوشگوار زندگی ہے اس کی۔ وہ دیکھتا ہے کہ چھ ماہ جی کر پیٹ بھر کھانے کو ملجائے تو کیا برا ہے۔ برعکس اس کے سو برس تک جئے جا رہے ہیں اور سوکھی باسی بھی نہیں ملتی۔ مرتا یوں بھی کیا نہیں کرتا۔ گرانی کی وجہ سے ان کی تنخواہ بیس فی کس ہوگئی ہے۔ جو اس شدید گرانی کا لحاظ کرتے کچھ بھی نہیں۔ ما تہران بڑی مہنگی بستی ہے۔ یہاں ہر چیز کی قیمت حیدر آباد کا لحاظ کرتے دگنی ہے۔ آئے دن اشیا کے نرخ میں اضافہ ہی اضافہ ہے۔

غریب مفلس و کنگال سے ہندوستان کب خالی ہو سکتا ہے۔ یہاں بھی ان کی کثرت ہے۔ جن کے جسم ڈھکنے چیتھڑا تک نصیب نہیں۔ جو نشیبی میدانوں سے آتے ہیں۔ اور یہاں پر کچھ جنگلی پھل، کپاس اور لکڑی وغیرہ چن کر اس کو فروخت کرتے ہیں۔ ان کے چہروں پر بیکسی، یاس، حسرت و افلاس کے ملے جلے جذبات ملتے ہیں۔ دنیا کی صعوبتوں سے مسخ شدہ چہرے۔ مسکراہٹ جن سے کوسوں دور ہو۔ ہنسی ان حرماں نصیبوں کے پاس نہیں پھٹکتی۔ الم و جور و ستم کے امتیاز کی بھی ان میں صلاحیت نہیں۔ کثرتِ غم سے اندازۂ غم بھی سلب۔ مشکلیں اتنی پڑیں کہ ساری کی ساری آساں ہو گئیں۔ نہ شادی داد سامانی، نہ غم آورد نقصانی کی چلتی پھرتی، جیتی جاگتی، چلتی پھرتی لاشیں —— انسان نما حیوان۔ —— کبھی امید سے کچھ زیادہ ملجائے تو ایک غیر یقینی سی مہیب مسکراہٹ —— اس بے کیف غیر متوقع ہنسی کو غور سے دیکھئے تو محسوس ہو کہ یہ ہماری آپ کی مہتم بالشان زندگی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ دنیا کی نامنصفانہ تقسیم دولت کا مضحکہ خیز احساس انھیں ہو رہا ہو۔ کسی غیر قیاسی داد و دہش کا ان پر عجیب و غریب اثر ہوتا ہے۔ اس منظر کو دیکھنے سے کوئی چیز آپ کے سینہ میں ٹوٹتی ہوئی سی محسوس ہو گی۔

ہمارے محلہ میں چند روز کیلئے کچھ لوگ آکر ٹھیرے تھے جن کی فیملی سے زیادہ تعداد ان کے کتوں کی تھی۔ جو بہت ہی

اچھی نسل کے تھے۔ اس گرانی میں بھی ان کے لئے روزآنہ چار پانچ روپیہ کا گوشت اور دودھ لیا جاتا تھا۔ مقابلہ کیجئے اکبر کے اس شعر کا ؎

یہ سچ ہے بے خبر ہے نصف دنیا، نصف دنیا سے کہ یہ ماتم میں ہے مصروف اور وہ چین کرتی ہے

آدم سمتھ کے اس مقولہ سے "مفلسی ایک راز ہے جو نصف دنیا نصف دنیا سے چھپاتی ہے"

یہاں سناٹا ہے۔ فی الوقت۔ ہم شہر کی پرتصنع، بناوٹی، نمائشی، عارضی دل لبھانیوالی، ہنگامہ پرور دنیا سے بہت دور ہیں۔ دیہات کی سی پرسکون فضا کا سا لطف آتا ہے۔ قدرت کی آزادی۔ عناصر کی رنگین چھیڑ چھاڑ، جدھر نگاہ اٹھتی ہے سرسبز و شاداب منظر، اور شعریت نواز ماحول اس کو اپنی پناہ میں لے لیتے ہیں۔ حیرت ہے۔ اتنا سبزہ دیکھنے کے بعد بھی آنکھیں سبز کیوں نہیں ہو جاتیں۔

کسی سے جان پہچان نہیں ہوئی۔ اور نہ ہونے کی ایسی کوئی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے۔ جن سے ہوئی ہے وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ تنہائی و یکسر تنہائی سے ایک قسم کا سکون، ایک طرح کی طمانیت سی ہے۔ کاش یہ ابدی ہو جائے! یہاں وہ تحقیر و تمسخر آمیز ہنسی، وہ بے معنی و مہمل مذاحیہ فقرے، وہ دل آزار طرز گفتگو، وہ دلدوز نشتر جیسے الفاظ، کم از کم ان سے تو نجات ہے ـــــ وہ انگلیاں یہاں نہیں ہیں جو مجھ پر جا و بیجا اٹھائی جاتی تھیں۔ وہ آپس کی سرگوشیاں نہیں ہیں جو میری پیٹھ پیچھے شروع ہو جاتی تھیں ـــــ وہ نکمے بہتان، وہ بے پناہ تہمتیں، ـــــ ان زہریلے ناگوں کا احساس ضرور ہے۔ ان کا ڈسنا یاد ہے۔ لیکن اس نوعیت کے رنج و الم سے کچھ عرصہ کی دوری ہے ـــــ غم کا ایک تخیل ہے۔ عملی الم سے کچھ دنوں کے لئے فارغ البالی ہے۔ شاید اس گوشہ نشینی سے وہ زخم مندمل ہو جائیں جن میں مسلسل کچاپن رہتا تھا جن کے اندمال کی کوئی اور سبیل نہ تھی۔ روح کے دکھی ہونے کا احساس ہے۔ لیکن دکھ دینے والوں سے کچھ دنوں کی دوری افتادگی ـــــ یہ جدائی کتنی روح پرور ہے۔ کاش ؎

یہ زندگی کا حسین خواب دائمی ہو جائے۔

راستوں پر گذر جاؤ۔ کوئی تم کو دیکھتا ہے کہ اس طرح کہ اس کی آنکھوں میں کسی قسم کا فریب نہیں ہے۔ اس کے سینہ میں دل ہے لیکن اس میں مکر نہیں ہے۔ وہ تمھیں اس طرح نہیں دیکھتا کہ تم بھی دنیا کا ایک عجوبہ ہو۔ ـــــ اور وہ خود ـــــ قدرت کا ایک زبردست شہکار۔ جس میں خامیوں اور کمزوریوں کا کہیں پتہ نہیں ایسے سمجھے ـــــ ایسی خاموش تنہائیوں میں کچھ اس نوعیت کے خیالات آتے ہیں۔

چارسو گھومتی، لپکتی ہوئی کیسی مبہم سی سنسناہٹ ہے

میری تنہائی سے الجھتا ہوا   کون آیا ہے کس کی آہٹ ہے

ڈاکیہ کا انتظار —— اور پھر عالم غربت میں۔ اف کیا بتاؤں کیسی ناقابل بیان حد تک چشم و گوش اس کے منتظر رہتے ہیں —— ابر کے ان دھندلکوں میں، ڈاکیہ کا خاکستری سایہ دور سے امیدوں و تمناؤں کی دنیا ساتھ لاتا ہے۔ آتے آتے اگر وہ کسی اور طرف کو چل دیتا ہے — تو پھر اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ روحانی کوفت ہونے لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے اس کو ان بلندیوں پر سے ڈھکیل دوں۔ لیکن جب وہ آجاتا ہے تو کتنی آرزوؤں کی تکمیل ہوجاتی ہے۔ وطن کے سندیسوں سے ہنگامہ بدوش کارنامے۔ رسالے، اخبار —— اور من کے سپنوں کی تعبیر دینے والے خطوط کا انبار ——

جوں جوں یہاں سے روانگی کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ شہری دکھاوے کی زندگی میں پھر سے شریک ہونے کے احساس سے ایک ہول سی ہوتی ہے۔ پھر وہی سماج کے ڈھکوسلے، ملمع کاری کی محفلیں، بے قرینہ کی تہذیب —— کتنی مختلف ہے اس سیدھی سادی بے لوث، بے لاگ چھوٹی سی سنسان نگری سے۔ یہ دور نگینیوں سے مستثنیٰ سی چیز۔ قدرت کی گودیوں میں کھیلنے والی حسین دنیا —— جس کے قدرتی پس منظر ایک اچھے بھلے انسان کو وارفتہ کردیں —— اور وارفتگی میں جو حسن ہے اس کو ہوش و حواس والے کیا جانیں۔

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے   حوران خلد میں تیری صورت اگر ملے

"فطرت"

"نگار"

اندرا کی آنکھیں جب اس دنیا میں کھلیں ہیں اس کی ماں مالتی نے اپنی آنکھیں اسی وقت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کرلیں۔ دادی نے اس معصوم بچی کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ باپ جگدیش نے تھوڑے دن تو اپنا رفیقۂ حیات کے رنج میں بسر کئے۔ لیکن مالتی کی موت کو برس بھی نہ ہوا تھا کہ ایک نئی دلہن کرلائے۔ اب انہیں اندرا کی زندگی سے ذرا بھی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔

اندرا ایک جاذب نظر لڑکی تھی۔ اگر وہ اپنے دادا دادی کیلئے آنکھوں کا تارہ تھی۔ پھوپی شانتی بھی اسے کچھ کم عزیز نہ رکھتی تھی اس نے کئی بار چاہا کہ اندرا کو اپنے گھر لیجائے لیکن دادی جی کے لئے اندرا

دلچسپی کا کھلونا تھی اُسے اپنے سے جُدا رکھنے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ اندرا کو بھی شانتی سے محبت اور اس کے گھر سے کافی الفت تھی۔ وہ خود اس کے گھر رہنا چاہتی تھی کیونکہ یہاں اس کے ہم سن لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ جن سے وہ کھیل سکتی تھی لیکن وہ اپنی دادی کو ناراض کرنا بھی نہیں چاہتی تھی اس لئے اکثر اجازت لے کر شانتی کے گھر آیا کرتی۔

کئی برس یوں ہی بیت گئے۔ اندرا اب وہ چھوٹی سی معصوم بچی نہ رہی تھی بلکہ وہ اب ایک نہایت خوبصورت سمجھدار اور خوش مذاق لڑکی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

شانتی کا لڑکا نرمل تعطیلات میں دیہات آیا ہوا تھا۔ جاذب نظر اندرا کی طبیعت اس کی سادگی اور مذاق نے اندرا کو قابل توجہ بنا دیا اور رفتہ رفتہ دونوں میں بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ لوگوں میں سرگوشیاں ہونی شروع ہوئیں۔ بوڑھی دادی کو جب ان حالات سے آگاہی ہوئی تو اس نے دو ایکبار اندرا کو اس صنف کی فطرت سے آگاہ کیا اور انجام کار سے جتایا۔ لیکن اندرا کی نظر میں نرمل مستثنیات میں سے تھا۔ اس نے دادی کو کچھ جواب تو نہیں دیا۔ لیکن دل میں خیال کیا ممکن ہے یہ مرد یوں ہی ہوتے ہوں لیکن نرمل کی فطرت سے یہ بعید ہے۔ اندرا کی دادی نے خیال کیا کہ اگر ان دونوں کا سنجوگ ہو جائے تو کچھ برا تو نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر اندرا ایک خوبصورت خوش سلیقہ لڑکی تھی تو نرمل بھی ایک مرد کی حیثیت سے معقول لڑکا تھا۔ غرض اس خیال کے تحت اندرا پر زیادہ سختی اور روک تھام نہ کی گئی۔ دن یوں ہی گذرے اور ایک دوسرے کے ساتھ دلچسپیاں بھی بڑھتی گئیں۔

نرمل آخر مرد تھا۔ جو ہر وقت اپنے ارادہ اور عہد کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اس کی فطرت نے پلٹا کھایا اور اب بھلا سا نرمل نہ رہا تھا کچھ انجان سا رہنے لگا تھا۔ اندرا کے ساتھ ازدواجی زندگی گذارنے کے لئے نہ اسے صاف انکار تھا اور نہ اقرار۔ اندرا بھی نرمل کی بے نیازی کی وجہ نہ سمجھ سکتی تھی اور نہ بوڑھی دادی کی پیشین گوئی کا اسے کچھ خیال آتا تھا۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ اندرا چونکہ ایک بہت اچھی لڑکی تھی اسلئے کئی لوگ اس کے خواہشمند تھے اور ہر طرف سے اس کے پیغام آنے لگے۔ اندرا کی دادی نے تمام حجت کے لئے نرمل سے جو اس کا نواسہ بھی ہوتا تھا اندرا کے متعلق ایک دن گفتگو کر ہی لی۔ کہ اگر وہ جواب دیدے تو اندرا کی دوسری جگہ بات چیت کر لیجائے۔ جس کا جواب نرمل نے یہ دیا کہ وہ اپنے آپ کو ابھی اس قید میں جکڑنا نہیں چاہتا ہے اور اگر انہیں جلدی ہے تو اندرا کے متعلق انہیں اختیار ہے۔ اندرا نے بھی کسی طرح

یہ انکاری جواب سُن لیا یہ جواب اس کے بالکل خلاف امید تھا وہ نہیں سمجھتی تھی کہ مرد کتنا انقلاب پسند ہوتا ہے گو اندرا کو اس سے دلی تکلیف پہنچی لیکن اس نے بھی خیال کر لیا کہ اپنے نسوانی وقار کو ہاتھ سے جانے نہ دیگی۔ اس لئے جو کچھ بھی اس کے دل پر بیت گئی اس نے اس کا اظہار نرمل پر نہ ہونے دیا۔ اس کو باوجود نرمل کی بے پروائی کے پھر بھی ایک قسم کی آس تھی جس کے سہارے وہ نراس نہ ہوتی تھی اور خیال کرتی تھی بہت ممکن ہے کبھی نرمل بیاہ پر راضی ہو جائے۔ لیکن نرمل ذرا بھی نہ پسیجا۔ کیونکہ اس نے اندرا کے ساتھ جو دن گزارے تھے وہ محض وقتیہ دلچسپی کے تحت "ہے جستجو کہ خوب سے بھی خوبتر ملے" اور بس اس وجہ سے وہ اپنے مستقبل اور ازدواجی زندگی کے متعلق کوئی تصفیہ نہ کرتا تھا اور نہ ادھر صاف انکار تھا۔

اندرا کی دادی نے نرمل سے جواب پا کر دوسری جگہ بات چیت کر لی۔ اندرا بیاہ دیگئی اس کا شوہر سریندر بھی نرمل سے قابلیت میں کچھ کم نہ تھا۔ اگر نرمل بی۔ اے تھا تو وہ بھی بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری اپنے پاس رکھتا تھا۔ صورت شکل کے لحاظ سے بھی وہ نرمل سے کچھ کم نہ تھا۔ خاندان بھی اندرا کو اچھا ملا۔ غرض اب بظاہر وہ اپنی زندگی خوشی سے گذار رہی تھی لیکن دل کی حالت کا تو خدا ہی کو بہتر علم ہوگا۔ کبھی بے وفا نرمل کی باوفا یاد بھی اگر اُسے آجاتی تو وہ بُھلا دینے کی کوشش کرتی۔

شادی کے تھوڑے دنوں بعد اندرا پھر شانتی کے گھر مہمان ہو کر آئی۔ پھوپھی کے گھر آتے ہی زمانہ ماضی کے دلکش ایام ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں میں پھر گئے۔ نرمل نے چاہا کہ پھر اب پہلے کی طرح بات چیت شروع ہو جائے لیکن اندرا کی طرف سے خاموشی ہی میں اس نے جواب پا یا کہ د۔

نہ کرو اب نباہ کی باتیں تم کو اے مہربان دیکھ لیا

چونکہ اندرا ایک عورت تھی اسے گوارا نہ ہوا کہ اس کے نسوانی وقار کو ٹھیس لگے وہ بظاہر اسی طرح رہی جیسے اُسے نرمل کا کبھی خیال بھی نہ ہوا تھا سمجھنے والے ہی سمجھتے تھے کہ وہ بازبان بے زبانی کہہ رہی تھی۔

ہم نے ہنس ہنس کے تیری بزم میں اے پیکر ناز کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

نہ معلوم اندرا کی طرح کتنے دلوں میں محبت کی چنگاریاں سلگتی رہتی ہیں ان مسکراتے ہوئے چہروں کے پیچھے کیا جانے کتنے دلگداز نالے پوشیدہ ہیں ؛

دیکھئے چلتی ہے مشرق کی تجارت کبتک شیشۂ دین کے عوض جام و سبو لیتا ہے
ہے مداوائے جنوں نشتر تعلیم جدید میرا سرجن رگ ملت سے لہو لیتا ہے علامہ اقبال

غزل

مخفی بیگم نواب غوث یار جنگ بہادر

بیگم نواب غوث یار جنگ بہادر صوبہ دار میدک کی اچانک موت لائق صد ماتم ہے۔ مرحومہ اچھے اخلاق اور عادات کی مالک تھیں غریب لڑکیوں سے انہیں انتہا ہمدردی تھی جن بن اضلاع میں رہیں وہ تربیت گاہ نسوان قائم کیا اور اپنے وقت کا بڑا حصہ لڑکیوں کے کھانا پکوان اور دستکاری کی تعلیم میں وقف کیا کرتی تھیں شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی افسوس ہے کہ ذیل کی غزل جو انتقال سے کچھ عرصہ پہلے لکھی تھی حال ہی میں موصول ہوئی ہے جو بطور یادگار شائع کی جاتی ہے۔ مرحومہ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے دفتر دو نادار لڑکیوں کے نام پرچہ جاری کرنا چاہتا ہے خدا مرحومہ کو جنت نصیب فرمائے۔

رحمت کو تیری جوش میں لا ہی نہیں سکی ہوں
عذر گناہ کر کے عفو چاہ رہی ہوں میں

مجھ سے گنہگار پہ جو فضل ہے تیرا
بخشش کو تیری دیکھ کے شرما رہی ہوں میں

پیری کی وجہ سے فقط کمر ہی نہیں ہے خم
عصیاں کا بوجھ ہے جو جھکی جا رہی ہوں میں

یہ انقلاب ہے اور یہ جنگ الاماں
یارب تیرے غضب سے تو تھرا رہی ہوں میں

دنیا کی بے ثباتی سے دل ہو گیا ہے سیر
پھر ابھی زندگی سے بیری جا رہی ہوں میں

مخفی کا بے رنجی وہ کہنا دم آخر
اب کیا غرض جینے سے ٹلی جا رہی ہوں میں

مکتوبات جمیل

عظیم النساء بیگم

فہمی ——— !

تمہاری دنیا نے رنگین کی شوخیاں مجھے "مسحور" نہ کر سکیں جشن و عشرت کی تکمیل کے سامان ——— ان میں میرے لئے کوئی کشش نہیں۔ دنیا نے نظارہ تمہاری نئی روشنی کی تاریکیوں پر آپ ہی آپ حیران ہے۔ گو میری غیر دلچسپ تحریر کے دلخراش جملے تمہاری خود بینی کی تحریروں سے مقابلہ نہیں کر سکتے مگر غور کرو تو حقیقت کی یہ خاموش راگنیاں شاید تمہاری سسکتی انسانیت کے لئے تسلی بخش نگارستان ثابت ہوں۔

تمہاری لغزشوں کے بھیانک انداز میں ماحول کی چمکدار لو ضو فشاں ہے۔ تمہیں ماحول میں رنگے جانے کے بعد اس کے نشاط و کیف کے دلفریب نظاروں سے روح کو سامان شادمانی حقیقی مسرت و سکون ہرگز نہیں مل سکتا۔

اب جہاں عملی دنیا میں گامزن ہونا ہے وہاں تم شراب و شعر کی رنگینیوں میں حیران نظر آتی ہو۔ تمہیں آرٹ پسند ہے بلکہ کبھی تم خود بھی اپنے آپ کو تصویروں میں مدغم کر کے ہمہ تن "آرٹ" بن جاتی ہو۔ ——— نیک ارادوں کے زبردست شاہکار کی تکمیل میں مصروف ہو جاؤ۔ "زندگی" میں ہر نقطہ اور ہر شاہرہ

تمھارے لئے دلفریب ماڈل ہے۔ سچے نصب العین پر ثابت قدم رہ کر خود عملی تصویر بن جاؤ۔ فطرت کے اندرونی مشاہدات اور "عورت" کی تخلیق کے مقصد سے زندگی کا صحیح ماخذ مل جائیگا۔ کشتیٔ حیات کو زمانہ کے طوفان و حوادث سے مقابلہ کرکے کامیابی کے ساحل تک پہنچانے کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔ ہاں نیک ارادوں کے مدنظر اپنی کشتیٔ حیات کی پتوار اپنے مضبوط اور مستقل ہاتھوں میں لو۔

"نہ زندگی ہے اور نہ ارادہ"۔ فہمی — !
اپنے اس برجستہ جملہ پر خود ہی غور کرو۔ ان الفاظ کو پڑھ کر میرے احساسات میں تعجب خیز روشنی چمکی روح کی بیتابی اور تیز آواز دے رہی تھی۔ انسان کی زندگی اور کوئی بے معنی چیز ؟ ؟ شاید تم کوئی "مہمل خواب" دیکھ رہی ہو۔ قدرت کی دی ہوئی تمام قوتیں اس نظریہ غلط پر کن انداز میں قربان کرنے تیار ہو۔ ایسے خوش عنوان طریقوں پر اپنی قوتیں ضائع کرنے کا تمھیں کس نے سبق دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نفسانیت کی فریب کاریوں کے بیل بوٹے تمھیں اپنی دلکشیوں میں جکڑے لئے ہیں۔ اس لئے خیال کے عیار اور فکر کے جاسوس پستی کی جستجو میں چکرا رہے ہیں۔

فہمی — ! کبھی تمھارے ادب کے رنگین ساغر میں شمس و قمر نظر آتے تھے۔ تمھاری چند دن پہلے کی تحریر مستقبل میں شاندار عروج کا تصور دلا رہی تھی میں تعجب کی شان سے اس کے ایک ایک نقطہ میں گم ہوتی گئی۔ میری آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں — شاید — خط لکھتے وقت تمہاری نازک خودی پر سنجیدگی چھا رہی تھی۔ فہمی — ! تمہارا شائستہ ادب لوگوں کے دماغوں کی اصلاح کرنا چاہئے میری تمنا جو تم اپنی قوتوں اور قابو سے بالاتر سمجھتی ہو اور جس کا تمہارے لئے کوئی وجود اور "اثر" نہیں تمہارے اس مفہوم کے احساس میں میرا وسیع دماغی انتشار کلی تکان محسوس کرنے لگا۔

وقت کے بیش قیمتی لمحات کارزار حیات کی دلفریب گھاٹیوں میں دوبارہ جھلک نہیں دکھائیں گے۔ تم ان عارضی تمناؤں میں الجھ کر زندگی اور مستقبل کی بازی لگا چکی ہو۔ بغیر کسی نیک مقصد و سنجیدہ جمعیت صرف کے زندگی عجب ہے۔ فہمی — ! تمہاری ماضی کو فراموش نہ کرنے والی نظریں کبھی حال اور مستقبل کا جائزہ لیا کریں۔ حال کی ذمہ داریوں سے گھبراتی ہو۔ دائرہ نسائیت کی پستی اور قوم کی زبوں حالی تمہارے فلسفیانہ سکوت سے نہیں بدل سکتی۔ تمہاری یہ شاندار ماندگی کہ ہر گام پر ایک منزل بنانا چاہتی ہے۔ میری آنکھیں خاص مقصد کو ڈھونڈتی ہیں۔ خاص چیز کی متلاشی ہیں۔ وہ دل ہی نہیں جس میں "درد" نہ ہو۔ وہ عمل ہی کیا جس میں سچے خلوص اور ہمدردی کا شائبہ تک نہ ہو۔ دوسروں کو بنانا، سنوارنا [illegible] اور بے غرض مقصد ہے جس کو ہم بھولے جا رہے ہیں۔

یہی تمہارا نصب العین ہونا چاہیئے جس میں روح تمام
قوتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر دوسروں کی فلاح و
بہبودی میں منہمک ہوجائے اور دل کے سچے جذبات
اور نیک ارادے عمل کی صورت میں ظاہر ہوکر قوم کی
زندگیاں ایسے گلزار بنادیں جن میں کبھی خزاں کی ہوا
بھی نہ چلے۔

"تم" بناوٹی ماحول کے وارفتہ احساس میں مقصد
زندگی کو بھول چکی ہو فہمی ——! اس وقت تمہیں
پایان زندگی ملے گا۔جب مشفقانہ سکون سے دماغوں کو
مسخر کرکے تمہارے دل کے ولولے قوم کے گلشنوں کو
سنگھار کے ضابطے بتائیں گے اور تم پوری دانائی و حسن
تدبیر کے ساتھ نسوانی دنیا کی اصلاح کروگی۔جب
تمہارے قلم سے نکلے ہوئے نغمے دل و دماغ بلکہ وجود اور
زندگیوں کو مسحور کرلیں گے۔اور دردمند دل کی پُر
خلوص صدائیں اس مسلسل سکوت کو جھنجھوڑ کر ان کو تمام
قوتوں کے ساتھ بیدار کردیں گے —— وقت کی بے سُر
سامانیاں تمہاری کوششوں میں سدراہ کیوں ہوں۔
جب حقیقت کا آبحیات مل سکتا ہے تو حاصل کرو۔تم
"طوفان" کو ساحل سمجھ رہی ہو تو اس میں ساحل کا
کوئی قصور نہیں۔بے عملی کے گمراہ کن تصور سے پرے
ہو جاؤ جو کہ تنزل کی طرف رہبری کرتا ہے۔

فہمی ——! کیا صرف تمہارے خواب خیال ہی میں
وضعداری ہے۔ہمارے نظریہ کو خودغرضی اور نفسانیت سے
بلند ہوکر خودداری اور خوداعتمادی کے ارفع و اعلیٰ
زینہ پر قایم ہونا چاہیئے۔تمہارے تجربے اور مشاہدے
حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد عوام کے دماغی
معیار پر صحیح اتر سکتے ہیں۔آؤ —— فہمی! بربطِ دہر
کے ساز میں مضراب بن جائیں۔اپنے نصب العین کی
راہ میں گوہر نایاب اور مصیبتوں کے سمندر میں "موج
گرداب" بن جائیں۔دوسروں کے پست احساس کو
جھنجھوڑ کر کبھی تم نے تبادلۂ خیال کیا ہے۔اس ماحول
میں تم اپنی فطرت ڈھالنا چاہتی ہو۔جہاں اخلاقی دنیا
کی وقوع پذیر پست صورتیں کردار کے تنزل کی زبردست
حقیقت پیش کرتی ہیں۔

—— اب سستانے کا موقع نہیں "صبر اور نیک
عمل کی خوگر بنو!" تمہیں جگانیوالی یہ آواز غیر مانوس
نہیں ہے۔انسانوں سے بھری ہوئی دنیا میں ہمدردی
نہ ڈھونڈو اپنے لئے فہمی ——! خود دوسروں کی
سچی "غمخوار" بن جاؤ۔وقت ہماری ذمہ داریوں کا
پیغام دے چکا ہے۔قوم کے سپوت! سوسائٹی اور اخلاق کے
کمزور بندھن ہمارے ہی ہاتھوں کھلنا چاہیئے۔آؤ
—— اپنے احساس سرمدی سے گنبد خضری کو ہلادیں۔
"آدمیت" پستی میں فنا کی طویل ہچکی لے رہی ہے۔
ہر ایک کی ذاتی مسرت ہوتی ہے۔باغبان پھولوں کو
آراستہ و شائستہ کرنے میں حظ اٹھاتا ہے۔اسی طرح
وہ ہستی جس کے ہاتھ انسانوں کو ترتیب دیں جو اپنے

عمل و خلوص سے دنیا کو " نسائیت " کا درس دے۔
اس کی مسرت لازوال ہے جو دوسروں کی بہتری کیلئے
اپنی قوتیں بلکہ زندگی قربان کرے۔ بے معنی ہے وہ
زندگی جو ذاتی اغراض کی تحصیل میں فنا ہو جائے۔
" بیدار روح "! اہل وطن کی بیداری کا نغمہ گائے
جاؤ۔ آؤ —— جہالت اور قعر پستی میں جہاں قوم کی
لاتعداد سسکیاں دفن ہیں ارتقائی روح دوڑا دیں۔
یہ دل میں " نہیں " اور زبان پر " ہاں " کہنا چھوڑ دو۔
طبیعت کی اس دورنگی اور ان مافوق الفطرت بھول
بھلیوں سے باز آؤ۔
—— یہ تمہیں اپنی ہستی پر بیکار ناز ہے جن کے
دل میں " درد " ہے۔ جو شرافت کی راہ چلتے ہیں جو
باطنی حسن " کے پیکر ہیں وہ مکمل " انسان " ہیں۔ ان کی
راہ میں آنکھیں بچھا دو۔ ایسی مقدس ہستیاں خیالات
کی پاکیزہ دنیا میں ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتیں۔
—— میری نظریں ہمیشہ تمہارا تعاقب کرتی رہیں
فہمی! کبھی تم نے پیچھے پلٹ کر بھی دیکھا ہے بے فائدہ
اپنی قیمتی جان ہلکان نہ کرو۔ میں تم سے دور نہیں ہوں
ہاں اپنے " مقصد زندگی " کو سمجھو نصیحت آمیز باتیں
سن کر ان پر عمل کرنے سے قلب اور روح کو اطمینان ——
—— ناقابل فراموش اطمینان حاصل ہوتا ہے۔
فہمی —— ! میرے خط کی چند ہی سطریں پڑھ کر تم
بھڑک گئی ہوں گی اور تمام تحریر کو قلم کی " لغزشیں "
تصور کر رہی ہوں گی۔ ہاں فہمی! شاید میری تحریر میں
وہ آواز نہیں ہے۔ البتہ تمہارے جوابی فقرے برجستہ
اور مضحکہ خیز ظرافت میں ڈوبے ہوئے اپنا مفہوم علیحدہ
رکھتے ہیں۔ تمہاری " عصمت "۔

آہِ نارسا

دل سے تو دعا کرکے
پنچھی بنا کے لے جا
مجھ کو اڑا کے لیجا

صبح و مسا ہوں جس کے — شمس و قمر ہوں جس کے
قسمت سے ایسے جیسے
تاریک بادلوں میں — مہر منیر نہیاں

دل سے تو دعا کرکے
پنچھی بنا کے لیجا
مجھ کو اڑا کے لیجا

ایسی جو زندگی ہو — رگ رگ پہ جب الم ہو
روشن نہ جب مقدر — دل ہو تو کیوں مکدر
داتا ہے جس کا اللہ — بینا ہے جس کا اللہ

دل سے تو دعا کرکے
پنچھی بنا کے لیجا
مجھ کو اڑا کے لیجا

اقبال

خواب یا حقیقت؟

فلک ناز

زندگی یا قسمت ؟ میں نے امی جان سے سراپا سوال بن کر کہا اور اس یقین کیسا تھ کہ وہ آج سینما دیکھنے کی اجازت دے ہی دیں گی لیکن امی جان نے فیصلہ کن انداز میں فرمایا زندگی نہ قسمت ! حسین تمہارا امتحان قریب ہے ایسی باتیں تو بس فرصت ہی میں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ امی جان کے انکار نے میرے دل میں شدید قسم کے باغیانہ خیالات پیدا کر دے۔ امتحان میں نے دل میں کہا " زندگی خود ایک امتحان ہے جس کے نتیجے کو دنیا قسمت کہتی ہے۔ میں نے غصہ کو چھپاتے ہوئے ایک سعادت مند بیٹی کی طرح کہا۔" جی ہاں امتحان کی تیاری بھی بہر حال ضروری ہے " کمرے میں پہنچ کر اپنے بستر پر لیٹی نہیں بلکہ گر گئی۔ آج میری سنہری جہاں میری آنکھوں کے سنہرے سپنے پرورش پاتے ہیں مجھے کانٹوں کا سیج معلوم ہو رہی تھی ——— زندگی یا قسمت ! امتحان - اونہہ - کیوں نہ خاندان ہی کے گیت گنگناؤں ——— میں بے دلی سے گنگنانے لگی لیکن جی نہ لگا ——— جیسے اندھیری رات میں کوئی جگنو چمک اٹھے کچھ ایسے ہی نعیمہ کا خیال میرے دل میں آیا نعیمہ ہوتیں تو آج زندگی یا قسمت دونوں میں سے کسی ایک کا ملنا ضروری تھا نعیمہ کی بات امی جان نہیں ٹالتیں۔ لیکن خیر بعض وقت تمنا میں جو لذت ہوتی ہے وہ تکمیل تمنا میں نہیں ہوتی۔

میں نے محسوس کیا جیسے کوئی میرے شانے ہلا رہا ہے " کون ہو " میری آواز جماہی میں غائب ہو گئی لیکن میں آنکھیں بند نہ رکھ سکی۔ میں نے دیکھا نعیمہ کا خوبصورت چہرہ مجھ پر جھکا ہوا ہے اور وہ بہار کی الہڑ کلی کی طرح مسکرا رہی ہے۔ میں نے ناممکن انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔" کیسے چلی آئیں "

زندگی دیکھنے نہیں چلو گی ؟ میں نے قد آدم آئینہ کی طرف ہٹتے ہوئے کہا۔ وہ سفید لباس میں جنت کی حور معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے الجھے ہوئے بالوں کو انگلیوں سے درست کرتے ہوتے ہوئے کہا " زندگی " ——— مجھے پھر جماہی آگئی ——— نعیمہ جھنجھلا کر بولی زندگی تو جماہی میں غرق ہو گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا " زندگی جماہی سہی لیکن امتحان تو ایک طوفان ہے "

" امی جان ؟ . . . . میں نے نعیمہ کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جملے کو ادھورا چھوڑ دیا نعیمہ نے اداشناس اور فاتحانہ انداز میں کہا تم ؟ اور اندیشہ ہائے دور و دراز " میں سب کچھ ٹھیک کر چکی

ہوں۔ سکنڈ شو کا وقت قریب ہے۔ وہاں کھو گئی۔ ہیرو نے ہیروئن کو پہلے دیکھا تھا۔ یا ہیروئن نے ہیرو کے دل پر پہلے تیر چلایا تھا ـــــ اس کا جواب میرے پاس صرف ایک قہقہہ تھا۔

میں نے کنگھی کرتے ہوئے دریچہ میں سے دیکھا۔ بادلوں نے تاروں کو اپنے دامن میں چھپا لیا تھا۔ جو اجلے سفینے تیر رہے تھے جیسے کئی زندہ دل ملاح سمندر میں اپنی کشتیاں کھے رہے ہوں۔ ہوا طوفان کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ کواڑ ٹکرانے لگے۔ نعیمہ نے کہا۔ تم بال سلجھاتے جاؤ اور بال الجھتے جائیں۔ کواڑ بند کیوں نہیں کر دیتیں یہ کواڑ بند کرنے کے لئے میں آگے بڑھی۔ یوں معلوم ہوا جیسے ہوا کے تیز و تند جھونکوں نے مجھے پیچھے دھکیل دیا ہے۔

اب جو دیکھتی ہوں تو میں پلنگ سے نیچے گری ہوئی عجیب بے بسی کے عالم میں ہوں۔ کمرہ برقی قمقمے کی سبز و مہک روشنی میں ایک خوابیدہ رومان پیش کر رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا دیکھا تو نعیمہ ہے اور نہ ہوائیں ہیں اور نہ طوفان!

میں نے سوچنا شروع کیا۔ میرے تخیلات! تم کس قدر حسین ہو۔ تمہاری رنگینیوں میں میری زندگی کی تلخیاں گم ہو جاتی ہیں۔ جب میں نے دنیا میں پہلی دفعہ آنکھیں کھولیں تم جنت کا خواب بن کر آئے اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر کھیلنے لگے۔ میری زندگی کا ہر لمحہ تمہارے گہوارے میں جھولتا ہے۔ شاید موت ہی مجھے تم سے جدا کر سکے۔ میرا تبسم اور میرے آنسو! تمہارے ہی ہاتھوں بنے ہیں۔ تم ہی میری زندگی ہو ـــــ ـــــ تمہاری دنیا کس قدر حسین ہے۔ میں اسی دنیا میں پہروں بے خبر رہتی ہوں۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم

تصورِ دوست ۔ دوست کیا میں واقعی تجھے دیکھ رہی ہوں؟ یا میرا تصور ہے۔ نہیں، یہ تصور نہیں۔ تو مجھ سے باتیں بھی کر رہا ہے؟ اور چل پھر رہا ہے۔ ایں؟ باتوں کی آواز بھی تو آ رہی ہے، نہیں، یہ ہرگز تصور نہیں ہو سکتا۔ افسوس؟ میری نظروں نے غلطی کی ـــــ!

مجھے اب یاد آیا کہ میں نے کئی دفعہ اسی طرح تجھ سے تصور میں باتیں کیں ہیں۔ جب میں عالم خیال میں بالکل محو ہو جاتی ہوں تو تجھ سے باتیں کرنے لگتی ہوں۔ لیکن زبان سے نہیں!!! ـــــ

جلیس

3238
REGD.M.NO,

نمبر رجسٹر آصفیہ ۱۲۲

محمودیہ پریس چارمینار میں چھپ کر دفتر شہاب دبیرپورہ سے شائع ہوا

جلد ۱۶ عـ ۳ بہمن ۱۳۳۵ ف



شہاب



شہاب

وام سے سالانہ (للعہ) — مرتبہ محمد عبدالرزاق بسمل — گورنمنٹ سے (عـ)

جلد (۱۲) | بہمن ۱۳۵۳ف م ڈسمبر ۱۹۴۳ء | نمبر (۳)

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

۷-۸-۹- دی ۱۳۵۳ف

کے تیس سالہ دور میں نظام آباد کے اجلاس بصدارت جناب غلام احمد خاں صاحب کئی خوبیوں کے حامل رہے۔ جوان سال جناب غلام حیدر صاحب اول تعلقدار اور آپ کے نوجوان رفقاء کار مرزا عبدالباسط بیگ صاحب اسپشل افسر اراضیات۔ محمد فاروق صاحب دوم تعلقدار بودھن۔ عبدالقادر صاحب طاہر سول سرجن۔ مسٹر بشیر صدیقی مددگار انجمن اتحادی۔ محمد یوسف صاحب۔ وادر حسین صاحب۔ مسٹر کاشی ناتھ وکلاء۔ کاظم حسین صاحب۔ و مسٹر نکھ پال کرتے کانفرنس کو کامیاب بنانے میں بڑی سعی و کوشش کی۔ نمایش کے انعقاد میں ہر سررشتہ نے تعاون عمل کرکے یہ دکھا دیا کہ اتحاد سے بڑی بڑی مشکلیں حل ہوسکتی ہیں۔ ہر اسٹال سلیقہ سے آراستہ کیا گیا تھا۔ رضاکاروں نے اپنی خدمت سے ظاہر کردیا تھا کہ وہ درحقیقت رضاکار ہیں اور ممکنہ خدمت کے لئے آمادہ۔ پھر مسٹر لائق علی کی گراں قدر رقمی امداد اور آپ کی کمپنی کے کارفرما مسٹر تاراپور نے اجلاسوں کی تیاریوں میں کمپنی کی جانب سے ممکنہ اعانت میں کوتاہی نہ کی۔ حیدرآباد سے جن معزز ہستیوں نے شرکت کی۔ اُن میں جناب سید محمد اعظم صاحب ناظم تعلیمات۔ جناب سید عارف الدین صاحب چیف انجینیر۔ جناب دلدار حسین صاحب انجنیر۔ جناب محمد بیگ صاحب سابق اول تعلقدار نظام آباد۔ جناب ذوالفقار علی صاحب حقانی پرنسپل گلبرگہ کالج۔ جناب سید محمود عالم صاحب انجنیر۔ جناب عبدالرحمن خاں صاحب سابق صدر جامعہ عثمانیہ۔ جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ۔ جناب ڈاکٹر عبداللطیف صاحب۔ جناب ملا عبدالباسط صاحب کے علاوہ اور بھی حضرات تشریف لائے تھے۔ ہر اجلاس میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔

خواتین حیدرآباد سے مسز صوفی۔ مسز محمد بیگ۔ مسز رحمت اللہ شریف۔ مسز باقر علی نے شرکت کی زحمت گوارا کی تھی اجلاس اپنے وقت پر ہوتے رہے۔ علم و عمل کی گتھیاں سلجھائی گئیں۔ ملک اور ابنائے ملک کیلئے

مفید تجاویز پیش ہوئیں۔ دینے والوں نے دیا۔ لینے والوں نے لیا۔ وظائف تعلیمی کے اعلان ہوئے جس کو حاصل کرنے کے لئے شوق اور تشویق دلائی گئی۔ گویا نظام آباد کے قالب میں تعلیمی روح پھونکی گئی۔

یوں تو ہر اجلاس کامیابی پر ختم ہوا لیکن کانفرنس کے تیس سالہ دور میں عموماً خواتین اپنے رزولیوشن کی تحریک اور تائید میں پس پردہ تقریریں کیا کرتی تھیں۔ لیکن نظام آباد کانفرنس کی یہ سعی کس قدر محمود تھی کہ ایک پورا اجلاس خواتین کے لئے وقف کر دیا تھا۔ جس کی صدارت کے فرائض مسز صوفی نے نہایت خوبی سے انجام دیے اور بتادیا کہ مردوں کے دوش بدوش تعلیمی امور میں خواتین کسی سے بھی پیچھے نہیں رہ سکتیں۔ بشرطیکہ انہیں موقع دیا جائے۔ یہ اجلاس اتنا کامیاب رہا کہ اس کی نظیر کانفرنس کی تاریخ میں مشکل مل سکیگی یقین ہے کہ آئندہ ہونے والے اجلاسوں میں یہ سنت جاری رہیگی۔ اس اجلاس کے کامیاب بنانے میں خواتین نظام آباد نے اپنی بیداریوں کا کافی ثبوت دیا تھا۔ خصوصاً مسز طاہر۔ مسز صدیقی کا جذبۂ عمل قابل ستائش ہے جنہوں نے خواتین میں جوش عمل پیدا کر دیا۔

ناسپاسی ہوگی اگر شوگر فیکٹری کے وست راست مسٹر تارا پور اور ان کے رفقاء کار کا یہاں ذکر نہ کیا جائے جنہوں نے فیاکٹری کی ٹرین میں شرکاء کانفرنس کو اپنے مزروعہ رقبہ کی سات میل تک تفریح کرائی اور مفید معلومات بہم پہنچائے اور شکر سازی کے جملہ رموز کا انکشاف کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بلا دیکھے شکر سازی کی نسبت کچھ کہنا اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا ہے۔ حیدرآباد سے اس قدر قریب رہ کر فیاکٹری کا نہ دیکھنا بڑی غلطی ہے ایک مرتبہ اس دنیائے "شکریت" کو دیکھئے پھر حیدرآبادیوں کی کارکردگی کی داد دیجئے کہ ان میں "صلاحیت کار" کس قدر موجود ہے۔

مسٹر لائق علی بھی حیدرآباد کے وہ بلند ہمت عزم راسخ انسان ہیں جنہوں نے سرکاری اعلیٰ ملازمت سے دست بردار ہوکر ایک لمیٹڈ کمپنی کی بنیاد رکھی جس کی بدولت کئی تعلیم یافتہ اور بیسیوں بے روزگار آج مصروف کار ہیں۔ غالباً ایسے ہی عزم بلند کی نسبت اقبال کا فرمودہ ہے۔

در دشت جنون من جبریل زبون صیدے

یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

عملی زندگی

جناب سید نورالحسن صاحب بی۔اے

انسان اپنی غلطی کو کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ اس میں وہ اپنی سُبکی سمجھتا ہے۔ مگر واقعہ تو یہ ہے کہ اپنی غلطی مان لینا ہتک نہیں بلکہ شرافت کی دلیل ہے۔ فرض کرو کہ اگر تم نے قانون کے خلاف کوئی کام کیا ہو اور تم جانتے ہو کہ وہ قانون کے خلاف ہے تو پھر اُس پر کج بحثی کرنا حماقت نہیں تو پھر کیا ہے۔

ایک صاحب موٹر چلا رہے تھے سپاہی نے اُن کو روکنے کے لئے ہاتھ بتایا لیکن یا تو وہ جلدی میں تھے یا انہوں نے دیکھا نہیں۔ اور بھی تیزی سے گذرنے لگے۔ ابھی مشکل سے چار قدم گئے تھے کہ سیٹی بجی اور سپاہی نے آکر کہا کہ باوجود آپ کو روکے جانے کے آپ کیوں بڑھے۔ اگر ٹکر ہو جاتی تو کون ذمہ دار ہوتا۔ فرض کیجئے کہ اس موقع پر اگر آپ ہٹ دھرمی کریں تو آپ کا نہایت آسانی سے چالان ہو سکتا ہے عدالت جانا پڑے گا اور مجسٹریٹ آپ پر یا تو خفیف جرمانہ کر دیگا یا اگر بہت رعایت کی تو فہمائش دیدی جائے گی کہ آئندہ احتیاط سے موٹر چلائی جائے اور بے احتیاطی سے موٹر چلانے والوں میں آپ کا نام بھی درج رجسٹر ہو جائے گا۔ سپاہی تاک میں رہے گا کہ دوبارہ پھر آپ کو پکڑے اور مجسٹریٹ و نیز اپنے افسران بالادست پر ثابت کرکے کہ بلاوجہ اُس نے آپ پر الزام نہیں لگایا تھا۔ کج بحثی سے آپ کو سوائے پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ بہتر یہ ہے کہ ایسے موقع پر فوراً اپنی غلطی مان لے اور لجاجت سے کہئے کہ ہاں بھائی قصور ضرور ہوا ہم نے دیکھا نہیں کہ آپ نے ہاتھ بتایا تھا اور جب وہ اپنی شان جتانے کو کچھ سخت و سُست کہے تو خاموشی سے سُن لے۔ چلو قصہ ختم ہو گیا۔ وہ خود کہہ دے گا کہ اچھا تشریف لے جائیے۔ آئندہ سے آنکھیں کھول کر موٹر چلائیے۔

ایک دن میں خود شام کے وقت سیر کرتے کرتے ایک ممنوعہ علاقے میں پہنچ گیا۔ پاسبان کی نظر پڑتے ہی بُرا بھلا کہتے ہوئے وہ میرے سر پر سوار ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں تم کو عدالت کے سپرد کروں گا کہ

رات گئے یہاں گھوم رہے تھے میں نے کہا کہ بھائی غلطی ضرور ہوئی۔ میں اپنے خیالات میں مہنک تھا باہر لگا ہوا بورڈ نہیں پڑھا اندر چلا آیا۔ اب تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔ وہ خوب چیخا۔ خوب خفا ہوا میں خاموش رہا۔ آخرش خود اس نے کہا کہ اچھا جائیے آئندہ سے احتیاط رکھئے۔ چلو بات آئی گئی ہوگئی۔

خود اپنی تنقید میں جو لطف آتا ہے اُس کا مزا وہی جانتے ہیں جو اس فن میں استاد ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کو تنقید کا موقع نہیں ملتا۔ بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سخت سے سخت تنقید کرنے والا ایسے موقع پر ملائم پڑ جاتا ہے۔ اگر اس کی تنقید خواہ مخواہ ہے تو وہ دل میں شرمندہ سا ہو جاتا ہے اور اگر اُس کی تنقید بجا ہے تو اُس میں وہ تلخی اور شدت باقی نہیں رہتی۔

اگر تم صحیح راستہ پر ہو اور تمہارا خیال درست ہے تو دوسروں کو نہایت تدبر، لجاجت اور شرافت سے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرو۔ اور اگر غلطی پر ہو تو فوراً اپنی غلطی تسلیم کرو۔

پُرانا مقولہ ہے کہ "جنگ سے تم اتنا حاصل نہیں کر سکتے لیکن صلح اور امن سے تمہیں اُس سے کہیں زیادہ منافعہ ہوتا ہے جس کی تم کو توقع ہے۔

اگر تم کسی پر بھرے بیٹھے ہو۔ اور اُس کو دیکھتے ہی برس پڑو تو تمہارا دل تو ٹھنڈا ہو جائے گا دماغ کا بوجھ اُتر جائے گا لیکن دوسرے کے جذبات میں ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ وہ تمہاری سخت کلامی کو کبھی نہیں بھولے گا۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر ایک شخص تم سے متنفر ہے اور اُس کا دل تم سے پھٹا ہوا ہے تو تم اُس کو اپنا دوست بحث و مباحثہ سے ہرگز نہیں بنا سکتے۔ نفرت اور بغض اُسکو کبھی اجازت نہ دیں گے کہ وہ تمہاری کسی منطق کو تسلیم کرے تمہاری منطقی گفتگو سُن کر وہ اور بھی تم سے نفرت کرنے لگے گا۔ انسان اپنے خیالات بدلنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اگر ہم نرمی، تدبر اور شرافت اختیار کریں تو بہت ممکن ہے کچھ عرصہ میں ہمارا مخالف ہمارا دوست بن جائے۔

لنکن کا مقولہ ہے کہ "شہد کا ایک قطرہ بہت سی مکھیاں جمع کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اگر تم کسی کو دوست بنانا چاہتے ہو تو پہلے اُس کو ثابت کردو۔ کہ تم اُس کے حقیقی ہی خواہ ہو پھر جو کچھ تم اُس سے کہو وہ اُس کی سمجھ میں آجائے گا اور ویسا ہی کرے گا جیسا کہ تم کہو گے۔

محبت سے محبت اور نفرت سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا جب بھی تم کسی سے ملو محبت سے ملو۔ خلوص اور محبت میں ایک قسم کی جاذبیت اور کشش ہوتی ہے۔

دوران گفتگو میں اُن باتوں پر زور دو جن پر تم متفق ہو اور جہاں تک ممکن ہو یہ ظاہر کرو کہ تم دونوں ایک ہی بات کہہ رہے ہو صرف کہنے کہنے کا فرق ہے۔ تم دونوں ایک ہی نتیجہ کے حصول کے لئے کوشاں ہو صرف عمل کا فرق ہے۔ شروع سے اپنے مخاطب کو کہنے کا موقع نہ دو۔ اس لئے کہ جب انسان ایک مرتبہ نہیں کہہ دیتا ہے تو اپنی زبان پر اڑا رہنا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اگر نہیں کہنے کے بعد ہاں کہا جائے تو اس کا شخصی وقار خطرہ میں پڑ جائے گا۔ ہاں اور نہیں کی نفسیات دلچسپ ہے۔ ہاں کہنے والا شخص تمھاری طرف جھکتا ہے، تمھاری بات غور سے سنتا ہے، تمھاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نہیں کہنے والا تم سے دوری اختیار کرنا چاہتا ہے، بات پوری سنتا نہیں۔ آواز اور طرز گفتگو میں شگفتگی نہیں ہوتی۔ اُس کے برتاؤ سے اجنبیت ٹپکتی ہے۔

شروع سے دوسرے سے اس طرح گفتگو کی جائے کہ اُس کو یہ محسوس ہو کہ اسی کی بہبودگی کے لئے جو کچھ کہا جا رہا ہے۔ سقراط اپنے مخاطب پر ایسے سوالات کی بوچھاڑ کرتا تھا کہ جواب سوائے ہاں کے نہیں نہیں ہو سکتا تھا اور آخر میں وہ سب کچھ خاموشی سے مان لیتا تھا جو شروع میں اگر وہ نہیں کہہ دیتا تو کبھی نہ مانتا۔

چین والوں کا مقولہ ہے "جو آہستہ چلتا ہے زیادہ مسافت طے کرتا ہے۔"

تعلیم نسواں

مسز رحمت اللہ شریف

ذیل کی تقریر ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ نظام آباد کے زنانہ اجلاس میں کی گئی تھی جو ارباب کانفرنس کے لئے لائحہ فکر ثابت ہوگی۔

دور حاضر ایک تعلیمی معاشرتی دور کہا جا سکتا ہے۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ دور موجودہ کی تعلیم مکمل کہلانے کی مستحق ہے یا نہیں خصوصاً تعلیم نسواں۔ میرے ناقص خیال میں ابھی تعلیم نسواں مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ جس شاہراہ ترقی کی طرف ہم جا رہے ہیں یقیناً وہ ہمارے نصب العین سے کسی قدر ہٹا ہوا ہے۔ مردانہ اصول تعلیم لڑکیوں کے لئے اس قدر صحت بخش ثابت نہیں ہو سکتے کیونکہ عورتوں کی زندگی کا معیار جداگانہ ہے۔ دوسرے جو اصول تعلیم مقرر ہیں۔ اس میں شک نہیں اچھے ہیں مگر ان میں دوسری قوموں کی معاشرت و تمدن کا لحاظ ہے ہندوستان کے رہنے والوں کے لئے وہی اصول کارآمد نہیں ہو سکتے۔ اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے مسلمان لڑکیوں کے لئے اصول تعلیم میں اسلامی تمدن کا لحاظ ضروری بلکہ ناگزیر ہوگا۔

بہنو۔ اسلامی تعلیم نے اتنے مکمل اور جامع اصول ہمارے لئے مقرر فرمائے ہیں کہ اگر اس کو مشعل راہ بنایا جائے تو اس میں ہمارے لئے نہایت مفید راستے ترقی کے نکلیں گے جو ہماری ضروریات زندگی اور معاشرت کے موافق ہوں گے۔ آپ سب جانتی ہیں کہ وہ مکمل تعلیم ہم کو قرآن مجید کے ذریعہ دی گئی اور ظاہر ہے کہ ہم اس کو چھوڑ کر دوسری ادھوری تعلیم کی طرف مائل ہیں۔ آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ یہ تہذیب تو جس کے آج کل ہر طرف چرچے ہیں وہی ہماری پرانی تہذیب سے سیکھی گئی جو اندلس کے جامعہ قرطبہ نے سکھلائی تھی مگر کچھ تغیر کے بعد اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم نے اپنی جو چیز دوسروں کو سکھائی تھی خود اس کو بھول گئے اب دوسرے کی چیز سب عمدہ سمجھ کر لے رہے ہیں۔ میں اپنی بہنوں سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ قرآن مجید کو بامعنی سمجھ کر پڑھ لیں۔

پھر غور کریں کہ وہ کون سا اصول چھوٹ گیا ہے جو اچھا کہلانے کا مستحق ہے۔ کیا ہمیں قرآن نے یہ نہیں سکھایا کہ تعلیم حاصل کریں۔ آپ نے یہ حدیث سنی ہوگی کہ الطلب العلم ولو کان بالسین کیا ہمارے لئے ہر ایک کے حقوق جداگانہ مقرر نہیں ہیں۔ ماں باپ کے حقوق اولاد پر اولاد کے ماں باپ پر۔ اور دوسرے اقربا کے حق ان کے حسب مراتب، شوہر کا حق بیوی پر اور بیوی کا حق شوہر پر، یہاں تک کہ ہمسایہ کے حقوق ملنے جلنے والوں سے اچھا برتاؤ، نوکروں کے ساتھ نرمی سے پیش آنا۔ مسافروں کی مسافر نوازی کرنا بیع وشرا کے قاعدے تجارت کے بہترین اصول کہ جب بیچو تو اچھی چیز اور اگر کسی چیز میں کچھ نقص ہو تو اس کو خریدنے والے پر ظاہر کردو۔ دوسروں کی خیرخواہی کہ جو چیز تم اپنے لئے ناپسند کرتے ہو اس کو دوسرے کے لئے بھی پسند نہ کرو کیونکہ اگر کسی نے تم کو بُرا کہا تو تمہیں ضرور برا معلوم ہوگا۔ اس طرح دوسرے کو بُرا کہہ کر اس کا دل نہ دکھاؤ اور ہر مسلمان کی جان مال اور آبرو دوسرے پر حرام کی گئی جس کا یہ مطلب کہ اگر تمہارا مسلمان بھائی یا بہن موجود نہ ہو اور دوسرے اس کی جان لینے کی فکر کرتے ہوں یا اس کو کسی قسم کا مالی نقصان پہنچانا چاہتے ہوں یا اس کا کوئی حق غصب کیا جارہا ہے یا اس کے متعلق کوئی تہمت تراشی جارہی ہو تاکہ ہم چشموں میں اس کو مطعون کریں تو اس وقت جو بھی اس کو سُن رہا ہو دیکھ رہا ہو اس کا فرض ہے کہ غائبانہ اس کی حمایت کرے اور حتی الامکان اس کو بچائے۔

میری عزیز بہنو! کیا آپ بتا سکتی ہیں ان بہترین اصول کے علاوہ اور اصول آپ کو کہیں اور مل سکتے ہیں۔ ایک سلام ہی کو دیکھ لیجئے یہ کہا گیا کہ جب دو مسلمان ایک دوسرے کو دیکھیں تو آپس میں سلام کریں۔ اور اس میں جو پہل کریگا اس کے لئے دس نیکیاں زیادہ ہونگی۔ میری ناقص فہم میں اس کا مطلب ہے کہ اجنبیت کی وجہ جو دونوں طرف سکوت کی مہر لگی ہوتی ہے اس کو اس طریقہ پر توڑا جائے اور ایک مسلمان کو دوسرے سے جو اس کا بھائی ہے یا بہن ہے متعارف کردے دوسرے کے درمیان آنے کی ضرورت نہیں جب سلام کے لئے زبان کو جنبش دی تو دل کی جھجک نکل گئی اور گفتگو کرنے کا راستہ کھل گیا۔ تہذیب حاضرہ کے مطابق ہم اس کو گڈ مارننگ یا گڈ آفٹرنون کی صورت میں استعمال کر رہے ہیں اور یہ جان کر کہ یہ مہذب قوم کی بات ہے۔

دوسرا شکریہ ادا کرنا ہمیں یہ تعلیم دی گئی کہ جب کوئی تمہارے ساتھ احسان کرے تو اس کا شکریہ ادا کرو اور ہمیشہ اس کا احسان مانو اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو شخص انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ خدا کی نعمتوں کا شکر بھی

نہیں کرسکتا۔ غور تو فرمائیے کہ یہ بات آج سے تیرہ صدی پہلے ہم کو بتا دی گئی۔ جس وقت کہ مہذب اقوام کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آئی تھی۔

ہر زمانے میں اچھے اور برے دونوں قسم کے کردار ہوئے ہیں۔ برے کردار نے قرآن مجید کے اصولوں کو اپنی خود غرضی اور بے موقع استعمال کے لئے آڑ بنایا۔ ان پر عمل ترک ہو گیا۔ حتیٰ کہ میں دیکھ رہی ہوں کہ آج کل بچوں کو قرآن مجید کا پڑھانا ترک کر دیا گیا ہے اور اس کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی بلکہ تضیع اوقات خیال کیا جاتا ہے۔ مدارس میں بھی اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ چھوٹی جماعت کے بچوں کو قرآنی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد دوسری تعلیم دی جائے بلکہ کبھی قرآن پورا نہیں کرایا جاتا ایک یا دو پارے بھی نہ ہونے پاتے اور وہ بھی ناظرہ۔ با معنی سمجھ کر پڑھنے کا تو تذکرہ ہی نہیں کہ بچے ایسی جماعت میں چلے جاتے ہیں جس میں عربی یا قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ میری یہ استدعا ہے کہ آپ کی کانفرنس میں یہ مسئلہ طے ہو جائے کہ لڑکیوں کے لئے قرآن کی با معنی تعلیم اور ابتدائی اصول مذہبی لازمی قرار دیا جائے۔ اگر اس کا موقع عام مدارس میں نہ مل سکتا ہو تو ہر جگہ ایک قرآنی مدرسہ مقامی مسلمانوں کی طرف سے قائم کیا جائے جس میں پہلے پہل لڑکیوں کی شرکت ضروری ہے اور تا وقتیکہ وہ اس کی تکمیل نہ کر لیں اور سند حاصل نہ کر لیں۔ دوسرے مدارس ان کو داخلہ کی اجازت نہ دیں اس طرح سے قرآنی تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکتا ہے اور وہ زرین اصول جن کی طرف سے ہم غفلت کر رہے ہیں اور دوسروں سے لینے کی کوشش کر رہے ہیں خود بخود مل جائیں گے۔

بہنو! آپ جانتی ہیں کہ جس قرآنی تعلیم نے عرب کے وحشیوں کی قلب ماہیت کر دی کیا ہمارے لئے مفید نہ ہوگی بلکہ قرآنی تعلیمات ہمارے لئے سونے پر سہاگہ ہوگی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم قرآن نہ پڑھیں اور نہ پڑھائیں اور اس کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ہم کو دوا کی ضرورت تو ہے اور وہ خود ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم اس کو استعمال نہ کر کے دوسری دوا کی طلب میں کوشاں ہیں۔ کانفرنس کی طرف سے طلبہ و طالبات کو اسکالرشپ ملا کرتے ہیں۔ اگر قرآنی تعلیم پر بھی دیے جانے لگیں تو کچھ بے محل نہ ہوں گے۔ یوں تو مدارس بہت ہیں سرکاری بھی اور غیر سرکاری بھی امدادی بھی مگر کوئی مدرسہ خالص دینی تعلیم کے لئے نہ تو سرکار کی طرف سے ہے اور نہ خانگی ہے۔ اگر کسی نے اس کی کوشش کی بھی ہے تو اس کی طرف سے اس قدر بے اعتنائی

برتی جاتی ہے کہ اس کا عدم و وجود یکساں ہوجاتا ہے کیونکہ اس کو قابل حصول علم تصور نہیں کیا جاتا ہے آپ جس تعلیم کو تلاش کررہی ہیں وہ خود آپ کے پاس موجود ہے مگر اس کا کیا علاج کہ آپ اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

محترم بہنو! اب بھی ممکن ہے بشرطیکہ ہم کچھ کام کرنا چاہیں ورنہ یوں نشستند و گفتند و برخاستند ہی اس جلسہ کی غرض ہے تو سمجھئے کہ آپ نے یہ ناحق کی دردسری مول لی ہے۔ آپ کو چاہئے کہ آج کے جلسہ میں متفقانہ طور پر اس کا قطعی ارادہ کریں کہ ہم خود قرآن پڑھیں گی اور اس پر عمل کریں گی اور اپنی بہنوں کو پڑھائیں گی اس کے ساتھ ساتھ اس پر عمل کرنے کی ترغیب دیں گی کیونکہ اس سے بہتر کوئی راہ عمل ہم کو تمام دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اس موقع پر سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر کہنے کی اجازت دیجئے کہ :-

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

اب اس نیک کام کے لئے مستقل طور پر آمادہ ہوجائیے تو قدرت کی طرف سے آپ کی مدد خود بخود ہوگی۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۶) یا فاقہ کرتے ہوئے دس سال گذار دیے۔ اس عرصہ میں انشورنس کی مدت ختم ہوچکی تھی اور دو چار روز قبل ہی یہ خطیر رقم اس کو وصول ہوئی تھی۔ وہ پاگل خانے سے میری رہائی کا انتظار کررہی تھی۔ بعد ازاں میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ اور اب یہاں آن کر نئے سرے سے کاروبار شروع کردیا ہے۔ اس کاروبار کی ساری رقم اسی شریک حیات کی ہے یہ مکان اسی کے پیسوں کا ہے میری زندگی اسی کے وسیلہ سے بنی۔ میرے اطوار اسی کی وجہ سے درست ہوئے۔ دس سال تک مسلسل میں نے اس پر ظلم کیا۔ لیکن اللہ کی بندی نے اُف نہ کیا اور صبر ایوبی کے ساتھ اُس نے یہ سخت آزمائش برداشت کی اب اگر میں اُس کے کاروبار کو اس کا نام نہ دوں اس کے مکان کو اس کے نام سے منسوب نہ کروں اس کی رقم سے حاصل کئے ہوئے منافعہ کو اس کے حوالہ نہ کروں اس کی رقم سے خریدی ہوئی غذا اس کے ساتھ نہ کھاؤں تو کل خدا کو کیا منہ دکھاؤنگا میری شریک حیات سوائے نجمہ کے کوئی اور نہ تھی۔ یہ کہکر اُس نے نجمہ کو آواز دی۔ شوہر کی آواز پر نجمہ ادب سے داخل ہوئی اور شریف ہندوستانی بیویوں کی طرح اس نے اپنے شوہر کے چرن چومے۔ ساتھ ہی ہم سب بھی غیر ارادتاً اور عقیدتاً کھڑے ہوگئے۔ اور اس عصمت و عفت، شرم و حیا اور ایثار و وفا کی مجسم دیوی کے قدموں پر ہمارے سر خود بخود جھک گئے اور ہم نے اس دیوی کے قدم چومے۔

وہ دن ہے اور آج کا دن کہ ہم نے پھر کسی شاہد پر "زن مرید" کی پھبتی نہیں کسی

بیچارگی

جناب بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر

سیلابِ زندگی میں بہے جا رہے ہیں ہم
بے دست و پا ہیں، اور بڑھے جا رہے ہیں ہم

اس میں جو کیفیت ہے، ہمیں جانتے ہیں کچھ
منزل سے بےخبر ہیں، چلے جا رہے ہیں ہم

یہ جانتے ہیں لطفِ فسانہ نہیں رہا
پھر بھی فسانہ اپنا کہے جا رہے ہیں ہم

ہے واسطہ خوشی سے نہ غم سے کوئی گلہ
ایسا ہے سہتے جاؤ، سہے جا رہے ہیں ہم

درسِ خودی ہے، یا کہ ہیں یہ بیخودی کے راز؟
کوئی پڑھا رہا ہے، پڑھے جا رہے ہیں ہم

اپنی نظر پہ آپ اگرچہ ہے اعتماد!
پھر بھی قدم قدم پہ رُکے جا رہے ہیں ہم

گو تلخئ حیات ہے ہر گھونٹ زہر ہے
ہے زندگی کا پاس، پیئے جا رہے ہیں ہم

تہذیبِ نو کے کھیل، عجب کھیل ہیں بشیر
راہِ عمل سے دور ہوئے جا رہے ہیں ہم

زن مُرید

جناب محمد حبیب اللہ صاحب اوج بی ایس سی (عثمانیہ)

یہ ایک حقیقت تھی کہ شاہد زنِ مرید تھا۔

زن مریدی کا اگر کوئی فیصد مقرر کیا جائے تو یقیناً شاہد کا شمار ان نیاز مند شوہروں میں تھا جو سو فیصدی زن مرید ہوتے ہیں جب دیکھئے شاہد کی زبان پر "نجمہ" ہی کا تذکرہ' مکان پر جائیے تو نجمہ منزل جلی حروف میں دکھائی دے گا۔ دوکان کے سائن بورڈ پر نجمہ اسٹور۔ حد یہ تھی کہ دوکان کے بعض پٹینٹ اور رجسٹرڈ اشیاء میں بھی نجمہ کا نام شریک رہتا۔ نجمہ سوپ۔ نجمہ ہیر آئیل۔ نجمہ کریم۔ نجمہ اسنو وغیرہ وغیرہ۔ جب کبھی ہم اس کو بحیثیت دوست رات کے کھانے پر کبھی روکنے کی کوشش کرتے تو وہ "بھئی نجمہ بیٹھی انتظار کررہی ہوگی" کہہ کر اٹھ جاتا۔ سینما کے لئے جب اُسے مجبور کیا جاتا تو وہ ایک شرط پیش کرتا اور وہ شرط نجمہ کی اجازت ہوتی۔ دوکان سے اس کو دن بھر جو آمدنی ہوتی وہ اُسے نجمہ کے حوالے کردیتا۔ بنک میں جس قدر روپیہ تھا وہ سب نجمہ ہی کے نام سے جمع تھا۔ اس کے علاوہ اس کی میز پر غلہ کے صندوق پر۔ اس کے بٹوے میں اس کی گھڑی کے لاکٹ میں۔ غرض ہر جگہ نجمہ کی تصویر نظر آتی۔ اگر ایسے شخص کو زن مرید اور سو فیصدی زن مرید کہا نہ جائے تو پھر کیا کہا جائے۔

وہ اپنی کمزوری سے ناواقف نہ تھا لیکن کسی وقت بھی ہم نے اُسے اپنی اس کمزوری پر شرمسار ہوتے یا اس پر قابو حاصل کرتے نہ دیکھا۔ ہم اس کی ہنسی اڑاتے اس پر جملے کستے۔ زن مریدی کی پھبتی کستے اُسے شرم دلاتے کی کوشش کرتے' دوسروں کی مثالیں پیش کراتے اور یہ سمجھانے کی کوشش کرتے کہ عورت گھر کی لونڈی ہے اُس کو اس کی حیثیت سے بڑھانا شان مردانگی کے خلاف ہے۔ اور اس کو سر آنکھوں پر بٹھانا اور اس کا غلام بن جانا آدم کی اولاد نرینہ کی صریح توہین ہے۔ مگر وہ مسکراتا اور خاموش ہو جاتا۔ یہ

یہ نہ تھا کہ وہ طبیعت کا ڈرپوک تھا۔ یا فطرت ہی اس کی سادہ لوح تھی۔ ہم نے اُسے ملازمین پر کڑکتے اور گرجتے دیکھا تھا۔ بعض اعلیٰ عہدہ داروں کے منہ پر صاف صاف باتیں کہتے سنا تھا۔ دوست احباب میں وہ صاف بیانی کیلئے مشہور تھا۔ ایسے شخص سے قطعی امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ "پٹی کوٹ گورنمنٹ" کا اتنا وفادار خادم ثابت ہوگا۔ اگر یہ خیال ہو کہ اس کی بیوی نجمہ شاید بہت حسین ہو جس کی بنا پر شاہد زن مرید ہوگیا ہو تو آپ غلطی پر ہوں گے اس لئے کہ تصویر دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ نجمہ میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی جس کی بنا پر اس کے حُسن کو غیر معمولی کہا جائے۔ وہ حسین تھی لیکن اتنی نہیں کہ کوئی مرد اس پر اس بُری طرح لٹو ہوجائے۔ جیسے شاہد۔

ایک دن ہمیں شاہد کی جانب سے دعوتی رقعہ وصول ہوا۔ اس نے اپنے مخصوص دوست احباب کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ کھانا کھاتے وقت بھی وہ سب معمول "اس کو لیجئے اسے نجمہ نے خود تیار کیا ہے" "یہ میٹھا خاص نجمہ کے ہاتھ کا بنا ہے" کہتا اور ہماری تواضع خلوصِ دل سے کرتا۔ ہمیں اس کے اس خلوص پر بیساختہ ہنسی آتی جب اُس نے کھانے کے بعد نجمہ کے ہاتھوں سے بنی ہوئی نازک گلوریاں پیش کیں تو ہم میں سے ایک دوست ضبط نہ کرسکے اور انھوں نے تنگ آکر کہا۔ بھاڑ میں جائے تمہاری نجمہ جب دیکھو اسی کا تذکرہ۔ تمہارے جیسا بے شرم زن مرید ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ ابھی ہمارے دوست جملہ ختم کرنے ہی نہ پائے تھے کہ ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر شاہد نے ان کی زبان بند کردی۔ ہم سب نے دیکھا کہ شاہد کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ بظاہر اس نے اس جملہ کا بڑا گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اُس کی آواز بھرّا گئی اور فرطِ غم سے الفاظ اس کی زبان سے ادا نہ ہوسکے۔ وہ کہہ رہا تھا دوست خدا کے لئے میری نجمہ سے متعلق ایسے الفاظ تو استعمال نہ کرو۔ رحم کرو۔ تمھیں صحیفۂ پاک کی قسم، پہلے میری داستان سُن لو اور پھر جو جی چاہے رائے قائم کرلینا۔

ہم سب شاہد کی طرف متوجہ ہوگئے۔ شاہد نے اپنی داستان یوں شروع کی۔ آج سے کوئی بارہ سال قبل میری شادی ایک امیر شریف گھرانے میں کردی گئی۔ دین لین خاصہ تھا۔ اور لڑکی کے والدین نے لڑکی کو زیورات دینے میں قطعاً بخل سے کام نہ لیا تھا۔ دلہن گھر آئی اور ابتدائی دن نہایت مسرت و

اطمینان میں بسر ہوئے۔ دن عید اور رات شب برات سے کم نہ تھے۔ لیکن جوانی دیوانی مشہور ہے کچھ خود غرض وعیش پسند دوست احباب کی صحبت اور کچھ جوانی کے نشے نے ہمیں شاہران بازاری کے کوچہ کی سیر کرائی۔ بس پھر کیا تھا ابتداءً تو ایک دن آڑ گھر سے غائب رہنے لگے۔ اس کے بعد کئی کئی دن سے گھر کی صورت نہ دیکھی۔ اگر آتے تو گھر سے صرف رقم لینے کی خاطر۔ جب کبھی آئے اپنی رفیقۂ حیات کو اپنا منتظر پاتے۔ لیکن افسوس اپنی بیوی میں وہ دلکشی نہ پاتے جو نسیمہ طوائف میں پائی جاتی تھی نہ وہ ادائیں تھیں نہ شوخی نہ وہ قیامت کی چال تھی نہ مسکرا کر بات کرنا۔ اور نہ بات بات پر ایک موزوں شعر کہنا یہی وجہ تھی کہ گھر سے نفرت ہو چلی تھی اور نسیمہ سے محبت۔ لیکن کسی وقت بھی اللہ کی بندی نے ہم سے شکایت نہیں کی بلکہ ہمیشہ اُسے صابرو شاکر پایا۔ اِدھر ہماری بے احتیاطیوں نے گھر کا سرمایہ ختم کر دیا۔ اُدھر نسیمہ کے مطالبات دن بدن بڑھتے گئے نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے اپنی رفیقہ حیات کے زیوروں پر نسیمہ کی خاطر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ ہر بار جب زیور کا سختی سے مطالبہ کیا جاتا تو وہ زیور نہایت ہی نرمی سے مجھے پیش کیا جاتا۔ میں نے کسی وقت بھی یہ پوچھنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ میری شریک حیات کی زندگی آخر کیسے بسر ہوتی ہے۔ میرے لئے دنیا میں اگر کوئی دلچسپی تھی تو صرف نسیمہ سے اور نسیمہ بھی بظاہر سب سے زیادہ محبت مجھ ہی سے کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنی بیوی کے سارے زیورات نسیمہ کو پہنا دیے۔ اب میری شریک حیات کے پاس سوائے سہاگ کے لچھے کے کوئی اور چیز نہ تھی۔ میرے جی میں آئی کہ لاؤ اسے بھی نسیمہ کو پہنا دوں۔ شاید پہلی دفعہ میری شریک حیات نے میرے مطالبہ کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن میں "نہیں" سننے کا روادار نہ تھا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے زبردستی اس کے گلے سے یہ لچھا چھیننا پڑا جس کے سلسلے میں وہ وفا کی بندی گر پڑی۔ اور بیہوش ہو گئی۔ لیکن مجھے اس کی کیا پروا تھی میں نے اسے بھی ایک ڈھونگ سمجھا اور لیجا کر نسیمہ کے گلے میں پہناتے ہوئے میں نے کہا آج میں نے اپنی محبت کا کامل ثبوت دیدیا ہے اور اپنا آخری سرمایہ بھی تمھارے نذر کر رہا ہوں۔ اب میرے پاس تمھارے نذر کے لئے سوائے دل اور محبت کے کوئی اور شئے نہیں۔ یہ سننا تھا کہ نسیمہ کے برتاؤ میں یک لخت تبدیلی آگئی۔ اس نے روکھائی برتنی شروع کی۔ نہ وہ باتیں رہیں نہ ادائیں۔ اب اسے میرا آنا بھی بار معلوم ہونے لگا۔ میں اُس کے گھر جاتا اور اس کا ملازم میری صورت

دیکھ کر کواڑ بند کر لیتا۔ میں انتظار میں سیڑھیوں پر بیٹھا رہتا۔ کئی لوگ اوپر چڑھتے اترتے اور میں بدنصیب اختر شماری کیا کرتا۔ نتیجۃً نسیمہ نے شہر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر میں نے بھی اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ میں مفلس و قلاش ہو گیا۔ بال بڑھ گئے۔ گریبان چاک ہو گئے۔ اس حالت کے باوجود فراق کے صدمے اٹھانا میری طاقت سے باہر تھا۔ جہاں نسیمہ جاتی میں بھی وہیں پہنچتا۔ آخر کار نسیمہ نے پولیس میں درخواست دیکر کہا اس شخص سے مجھے جان کا خطرہ ہے آوارہ گردی کے الزام میں گرفتار کرا دیا۔ عدالت میں نامعلوم طریقہ سے میری ضمانت ادا کر دی گئی۔ اور میں رہا ہو گیا۔ دوران مقدمہ میں شہر کا ایک معزز وکیل میری جانب سے پیروی کیا کرتا لیکن مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کی فیس کون ادا کیا کرتا تھا۔ جب جرح ہوئی تو بھری عدالت میں نسیمہ نے میری شناخت سے انکار کر دیا۔ اس صدمہ سے میں بالکل پاگل ہو گیا۔ مجھے سرکاری پاگل خانے میں شریک کرا دیا گیا۔ کسی نے اس کے اخراجات بھی برداشت کئے۔ ایک دن جب میں اپنے ہوش میں تھا مجھے رہائی مل گئی۔ رہا ہونے کے بعد میرے پیش نظر سوائے خودکشی کے اور کوئی راہ نہ تھی میں آہستہ آہستہ شہر سے دور دریا کی جانب روانہ ہوا تاکہ ڈوب جاؤں۔ عین موقع پر کسی نے میرے قدم پکڑ لئے۔ یہ میری بیوی تھی۔ جو روتے ہوئے مجھ سے اپنا سہاگ بطور بھیک مانگ رہی تھی۔ میں نے ہزار منتیں کیں آنسو بہائے اور اُس سے کہا کہ میں اُسے منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ لیکن اس نے میرے پیر نہ چھوڑے روتے روتے اس کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس نے بھی میرے قدم اس وقت تک نہ چھوڑے جب تک میں نے یہ قسم نہ کھائی کہ اس کی خاطر زندہ رہوں گا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ مفلسی کی بھی کوئی زندگی ہے آؤ ہم تم دونوں اس جہان سے گذر جائیں۔ مگر وہ سمجھا بجھا کر مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ قدیم گھر کو دیکھکر میرے آنسو نکل آئے۔ اس نے مجھے راستہ بھر یہ سمجھانا شروع کیا کہ خدا کی ذات سے ناامید نہ ہونا چاہیئے گھر جا کر اس نے میرے قدموں پہ دس ہزار کی خطیر رقم ڈال دی۔ میں حیرت سے اس کا منہ تک رہا تھا بعد ازاں اُس نے مجھے بتایا کہ اس کے والد نے اس کی زندگی کا دس سال کے لئے بیمہ کرایا تھا۔ اس درمیان میں اُسے اس پالیسی کا منافع بھی ملتا رہا جس کی بنا پر اس نے وکیل کی فیس۔ میری ضمانت ڈاکٹر کی فیس، اور پاگل خانہ کے اخراجات برداشت کئے اور خود محلے والوں کے کپڑے سی سی کر یا فاقہ

(بقیہ سلسلہ بر صـ۱۱)

اقبال پر ایک نظر

جناب منظور احمد صاحب

شاعر کا اولین فرض! اگر ہم اردو شاعری میں اس کے ابتدائی دور سے لیکر موجودہ زمانے تک جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مختلف ادوار میں شاعری نے مختلف صورتیں اختیار کیں۔ یعنی ایک خاص دور میں ایک خاص قسم کی شاعری کو عروج ہوا۔ کیونکہ شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوا کرتا ہے۔ اور لوگوں کے مذاق کی تکمیل کرتا ہے۔ لیکن اگر شاعر بجائے عوام کے مذاق کی تکمیل کے ذرا بلند معیار اور مفید شاعری کی طرف توجہ کرکے عوام کے خیالات کی اصلاح کرے تو یہ اسکا لائق تحسین کام ہوگا۔ اور دراصل یہی اوسکا اولین فرض بھی ہے۔

گذشتہ شاعروں نے کیا کیا! یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچکر میرے دل میں کبھی کبھی یہ خیال کھٹکنے لگتا ہے کہ ہمارے گذشتہ شاعروں نے ہماری تباہی کے اسباب مہیا کئے۔ انہوں نے زمانے کے غلط تقاضے کو پورا کرنا ضروری خیال کیا۔ گل و بلبل کی حکایتوں نے عاشقانہ مضامین کے باعث اچھے خاصے تندرست اور نوجوان دلوں کو معشوق کے "عارض گلگوں و چشم نرگس" کا بیمار بنادیا۔ اور عشق کے تنگ و تاریک راستوں پر ڈالدیا۔ یہ وہ صحرا تھا۔ جسمیں انہوں نے مجنوں بن کر آوارہ گردی کرتے ہوئے اپنی قیمتی جانیں تباہ کردیں۔ ہمارا شاعر بجائے یہ سوچنے کے کہ ہماری زندگی کا مقصد اور صحیح زندگی کے کیا معنیٰ ہیں؟ یہی سوالات کرنے لگا ہے۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار ٭ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ ٭ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے!
شکن زلف عنبریں کیوں ہے؟ ٭ نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟

"عاشقوں" کی اس بڑھتی ہوئی تعداد نے ملک کے ہر گلی کوچہ کو کوئے جاناں اور کوئے قاتل بنادیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کوچہ ہائے جاناں اور کوئے قاتل سے "عاشقوں" کیساتھ ساتھ بالآخر ہندوستان کی آزادی و معاشی خوشحالی کا جنازہ بھی نکل گیا!

جب تباہی و غلطی اتنی زیادہ پھیلی سے کہ یاران فراموش کردند عشق

اور آزادی کے بجائے غلامی کی آہنی زنجیریں پاؤں میں محسوس ہونے لگیں تو اس نوجوان عاشق کو جو کبھی مرضِ عشق میں مبتلا ہو کر کہتا تھا کہ سے [illegible] زنجیر سے دیوانہ کسی کا۔

اپنے حقیقی مرض کا احساس ہوا۔ اس کے بعد چند شاعروں کی زبان سے قوم کے تنزل و تباہی پر مرثیہ اور نوحہ خوانی کی صدا بلند ہوئی۔ اب ہمارا شاعر جاگتا ہے۔ اب وہ محسوس کرتا ہے کہ اسکا اصلی فرض کیا تھا؛ مولانا الطاف حسین حالی اور اکبر الہ آبادی کی شاعری کا رنگ دوسرے شعرا سے مختلف تھا۔ مولانا حالی نے سرسید احمد خاں کی خواہش پر "مسدس مد و جزر اسلام" لکھی اور دوسرے شعرا بھی ملک و قوم کی اصلاح کیطرف متوجہ ہوئے۔ اسطرح وہ اردو شاعری جس نے بزم نشاط میں غزل خوانی کر کے ہندستان جنت نشان کو جہنم سے بدتر بنا یا تھا۔ اب پھر ایکبار اسکو گلستان بنانے کی طرف متوجہ ہوئی۔ جس کے لئے محفل عیش و نشاط کو درہم برہم کرنے کی ضرورت ہوئی۔ اور اس محفل کے "ساقی" کو مع اس کی "مینا و سبو" کے ملک بدر کرنا پڑا۔ کیوں کہ اب ہندوستان کو "میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں"۔ کہنے والے شاعروں کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ اب تو اینٹ کا جواب پتھر سے دئے جانے کی ضرورت تھی۔ اور چنگ و رباب کی بجائے شمشیر و سناں سنبھالنا پڑ رہا ہے۔ اب ہمیں اُن نازک خیالوں کی ضرورت نہیں۔ جن کا اظہار "دورِ جام" کے وقت ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ اب ہماری زندگی اور موت کا سوال سامنے آنے لگا۔ اس مردہ قوم کیلئے "شاعرِ حیات" کی ضرورت تھی۔ جو پنجاب کے ایک گوشے سیالکوٹ سے اُٹھا۔ اور اُسی نے دراصل سوتی قوم کو جھنجوڑا۔ اسی لئے آج اسکا مرتبہ گذشتہ شاعروں سے بلند ہے۔ "اقبال مسلمانوں کے "اقبال" کو زندہ کرنے کے لئے۔ پیدا ہوا تھا۔ اور یقیناً اس نے مسلمانوں کی "زندگی" کے اسباب مہیا کئے۔ اگرچہ وہ خود زمین مردہ میں پیدا ہوا جیسا کہ اس نے "پیام مشرق" میں اپنا اور المانوی شاعر گوئٹے کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

او چمن زادے چمن پروردۂ ٭ من دمیدم از زمینِ مردۂ

اِس عظیم المرتبت شاعر کے کلام کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے وقت اور گنجائش کی ضرورت ہے حتیٰ کہ ہر پہلو پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اور دراصل اقبال کے متعلق کئی کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں مختلف لوگوں نے اقبال کو مختلف حیثیتوں سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

ذہنی بے چینی

اقبال نے گل وبلبل کا پرانا نغمہ چھیڑنے کے بجائے اپنی زبون حال قوم کی طرف توجہ کی۔ اس نے ملک کی سیاسی حالت پر ایک نظر ڈالی۔ اس کی وہ نظمیں جو ملک کی سیاسی حالت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ہندی ترانہ، نیا شوالہ، ہمالیہ، میرا وطن یہی ہے۔ اور تصویر درد ہیں۔ ان کے علاوہ اقبال کی شاعری کے اس دور کی چند اور نظمیں بھی ہیں۔ جو اقبال کی افتاد طبیعت ذہنی بے چینی تجسس اور تلاش کا پتہ دیتی ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے ابھی اپنی زندگی کا مقصد پا یا نہیں۔ خودی کا احساس ابھی تیز نہیں ہوا۔ اور وہ اسرار اس پر منکشف نہیں ہوئے۔ جن سے خودی کی تعمیر ہوتی ہے۔ وہ وطنیت اور دیس کی چاہت کے سہانے گیت گا کر دلوں کو گرماتا ضرور ہے۔ لیکن خود اس کے دل میں تذبذب اور شکوک کا ایک طوفان برپا ہے۔ اس کا دل سراپا تجسس اور استفسار بنا ہوا ہے۔ زندگی اور حقائق زندگی کا وہ بھید پانا چاہتا ہے۔ چاروں طرف اس کی نگاہیں پڑتی ہیں۔ مگر کسی طرف سے اس کی دلجمعی نہیں ہوتی۔ کہیں گل کی رنگینی کو دیکھ کر وہ حسن کی کشش کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے۔ کہیں شمع و پروانے کی دلسوز حکایت میں وہ حسن وعشق کی حقیقت پانے کی دھن میں رہتا ہے۔ کبھی فراز آسمان پر مہر و ماہ کی جانب اس کی نظریں دوڑتی ہیں۔ لیکن کہیں سے خاطر خواہ جواب نہیں پاتا۔ گو بظاہر تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے دل کو سمجھانے کے حیلے بہانے تراش لیتا ہے۔ گل رنگیں، شمع و پروانہ۔ بچہ اور شمع۔ آفتاب، ماہ نو، جگنو، چاند، ستارے، کنار راوی، موج دریا یہ تمام نظمیں غور سے پڑھئے۔ آپ کو اقبال کی اس تلاش اور بے چینی کا اندازہ ہو جائے گا۔ یہ سب جستجو محض اس لئے تھی کہ اقبال اپنے لئے ایک طرح نصب العین اور مقصد حیات متعین کرنا چاہتے تھے۔ ایک نئے راستہ کی لگن ان کے دل میں تھی۔ وہ معمۂ حیات بنا اور زندگی اور موت کے پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھانا چاہتے ہیں۔ لیکن ابھی انہیں اپنے پر کامل بھروسہ نہیں ہوا ہے۔ اور نہ ابھی پورے طور پر انہوں نے خود کو پہچانا ہے۔ ابھی ابھی جن نظموں کے عنوانوں کا حوالہ میں نے دیا ہے۔ اُن کے کچھ اشعار سنئے۔ آپ کو صحیح اندازہ ہوگا کہ میں کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ سے

محفل قدرت ہے اک دریائے بے پایاں حسن ؛ آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفاں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شئے کی ہے ہوس ؛ ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس

(بچہ اور شمع)

متاع اقبال از جناب ابوظفر عبدالواحد صاحب۔

تو شناسائے خراشِ عقدہ مشکل نہیں
اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
اس چمن میں، میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو
مطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں
(گلِ رنگیں)

حُسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے ؛ انسان میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دئے ہیں، ورنہ ؛ نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی ؛ جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟ ؛ ہر شئے میں جبکہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو
(جگنو)

شکوہ اقبال کی اس تلاش و جستجو کو معلوم کرنے کے بعد ایک اور چیز کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ اس نے جس طرح گل رنگین، ماہِ نو۔ وغیرہ سے سوالات کئے ہیں۔ اسی طرح ایک قدم آگے بڑھا کر خداوند تعالیٰ سے بھی چند سوالات کئے۔ لیکن ان سوالات کو اس نے "شکوہ" کی صورت میں بیان کیا۔ آئیے اب ہم اُس کے "شکوہ" کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش کریں۔
"شکوہ" کو پڑھکر بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ اقبال نے خدا سے "گستاخی" کی اور اُس کی اِس برہمی کو بعض حضرات مشکوک نظروں سے بھی دیکھتے ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس شکوہ کی حقیقت معلوم کریں۔ اقبال "کا شکوہ" کچھ پس منظر بھی رکھتا ہے۔ اور بغیر اس سے واقف ہوئے۔ اقبال کو "گستاخ" قرار دینا اپنی نادانی کا اظہار کرنا ہے۔

اقبال نے ایک خاص قسم کی ہمہ گیر بے چینی اور کشمکش کے زمانے میں ہوش سنبھالا۔ مسلمانوں کا سیاسی زوال معاشی پستی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اور افلاس و نکبت نے ہر مسلمان کے گھر کو جی بھر کر لوٹا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی اس ابتر حالت کا ذمہ دار خدا کو ٹھہرانا شروع کیا۔ انہوں نے خیال کیا کہ جب خدا نے ہمیں آزاد رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ تو پھر اس سیاسی غلامی و معاشی پستی کے کیا معنی ہیں؟ - ہر طرف سے شکایتوں کی صدا بلند ہونے لگی۔ اقبال کے کانوں نے بھی اُن کو سنا اور "شکوہ" کے ذریعہ خدا کے حضور میں اپنی قوم کے خیالات کی ترجمانی کی۔ شکوہ کس چیز کا تھا مختصراً سنئے ؎ ۔

کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب؟ ÷ تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب ÷ رہرو دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب
طعن اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے ÷ کیا تیرے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟
امتیں اور بھی ہیں، ان میں گنہگار بھی ہیں ÷ عجز والے بھی ہیں، مست مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہوشیار بھی ہیں ÷ سینکڑوں ہیں کہ تیرے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر ÷ برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!

خداوند تعالیٰ۔ ان شاکی مسلمانوں کو یوں جواب دیتا ہے ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں ÷ راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں ÷ جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں ÷ ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں!
کسقدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے! ÷ ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمہیں پیاری ہے۔
طبع آزاد پہ قید رمضاں بھاری ہے ÷ تمہیں کہدو یہی آئین وفاداری ہے
قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں ÷ جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

اسی طرح آگے چل کر ہندوستان میں مسلمانوں کی فرقہ بندی کی شکایت کیجاتی ہے ؎

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں ÷ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔

غرض "جواب شکوہ" میں مسلمانوں کی حقیقی کمزوریوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس طرح اقبال نے

اپنی قوم کے ادبار کی اصلی وجوہ کو منظرِ عام پر لایا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس زمانے کے مسلمانوں کو یہ بتلائے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے۔ منتظرِ فردا بیٹھے رہنے سے آسمان سے من وسلویٰ نہیں آسکتے اور خدا سے فضول شکوہ و شکایت بیجا ہے کیونکہ ساری برائیاں ہمارے اندر سرائیت کرگئی ہیں۔

اِس تفصیل سے اُن حضرات کے شکوک کی اصلیت معلوم ہوگئی جو اقبال کو "گستاخ" اور خدا سے برہم سمجھتے تھے۔

اچھوتے مضامین اقبال کے کلام میں یوں تو اکثر اچھوتے مضامین ہیں لیکن ان سب کا ذکر کرنا ناممکن ہے۔ صرف دو کا ذکر کرتا ہوں۔

خدا کہتا ہے کہ فطرت جیسی ہے۔ اسے ویسا ہی رہنے دے۔ اس کے متعلق چناں چنیں نہ کر۔ لیکن آدم کہتا ہے کہ ہاں فطرت جیسی ہے ویسی ہے۔ لیکن میرے پیشِ نظر تو یہ ہے کہ کیسی ہونی چاہیئے؟

گفت یزداں کہ چنیں است و دیگر ہیچ مگو ﴿ گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بایست

ایک جگہ "بالِ جبریل" میں اقبال نے اپنی دنیا اور دنیائے فطرت کا مقابلہ کیا ہے۔ اور ذاتِ باری سے شکوہ کیا ہے کہ میں نے تجھے اپنے دل کی دنیا میں بسا لیا لیکن میں تیری دنیائے فطرت میں بے بس ہوں:-

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی ﴿ مری دنیا فغانِ صبح گاہی

تری دنیا میں میں محکوم و مجبور ﴿ مری دنیا میں تیری بادشاہی

"اگر کوئی آرٹ زندگی کو فراوانی اور فروغ نہیں بخشتا، اگر اس کے آرٹ سے مسرت و بصیرت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اور اگر اس سے حقایقِ حیات کے الجھے ہوئے تار نہیں سلجھتے تو وہ آرٹ بے معنی اور مہمل ہے۔ اسکا کوئی مصرف نہیں"۔ [1]

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن ﴿ جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے ﴿ یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو ﴿ جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

[1] روحِ اقبال صفحہ ۱۸۰ از ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب۔

اقبال نے اپنی اس بے چینی و تجسس اور شکوہ و شکایت کے دور کو جلد ختم کیا۔ وہ شاعر جو ایک صحیح مفکر کیطرح کائنات کے مسائل پر غور کرتا تھا۔ اب اس قابل نظر آتا ہے کہ دوسروں کو ان سوالوں کے جوابات دے۔ اب اسے وہ راستہ مل گیا۔ جس کی اُسکے دل میں لگن تھی۔ وہ اب اچھے اور برے کی تمیز کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی قوم کو نصیحتیں کرتا ہے۔ اس نے اپنے کلام میں جابجا قوم کے نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے۔ کیونکہ قوم کا دار و مدار در اصل انہی پر ہوتا ہے۔

قوم سے شکایت

اقبال نے اپنی قوم کی اُس پرانی خصلت کا ذکر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی بربادی میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی۔ یعنی وہی عاشقانہ مضامین کا شوق اور وہی نازک بیانیاں جنکا چرچا کسی زمانے میں ہندوستان کے شاعروں کی محلوں میں ہوا کرتا تھا۔ اس نے اپنی قوم سے شکایت کی ہے کہ:-

او حدیثِ دلبری خواہد ز من ؛ رنگ و آب شاعری خواہد ز من

کم نظر بے تابیٔ جانم ندید ؛ آشکارم دید و پنہانم ندید

اقبال کا مقصد شاعری

اقبال کی شاعری کا مقصد یہ نہیں تھا کہ غزل لکھکر مشاعروں میں داد حاصل کیجائے۔ اور مجمع کی تھوڑی سی موقتی واہ واہ پر جھک جھک کر سلام کئے جائیں۔ اور یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کاوش کا معاوضہ مشاعرے میں کامیابی پر مل گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال مشاعروں میں شرکت سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ سب سے پہلی مرتبہ ۱۹۰۱ء سے غالباً دو تین سال پہلے انہوں نے لاہور کے ایک مشاعرے میں شرکت کی اس بزم میں اُنکو ان کے چند ہم جماعت کھینچ کر لے آئے۔ اور انہوں نے کہہ سنکر ان سے وہ غزل پڑھوائی جس کے دو اشعار یہ تھے:-

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے ؛ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے۔

ہم کو تو لکھنو سے نہ دِلّی سے ہے غرض ؛ اقبال ہم اسیر ہیں زلفِ کمال کے۔

اقبال نے در اصل "سازِ سخن" کو بہانہ بنایا تھا۔ اور اس کے ذریعہ وہ اپنی قوم کو منزل کیطرف لیجانا چاہتے تھے۔ ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست ؛ سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را۔

اسی لئے وہ اپنے مخاطب سے کہتے ہیں کہ اُن کی نوا کو شاعری نہ سمجھے ؎۔

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ ؎ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اقبال نے خدا سے "فرصت ہو حق" کی استدعا کی ہے۔ اس کی وجہ اُن ہی کی زبان سے سنئیے:۔

دِہ مرا فرصت ہو حق دو سہ روزے دگرے ؎ کہ درایں دیر کہن بندہ بیدار کجا است

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند ؎ جز برہمن پسرے محرم اسرار کجا است!

حرفِ ناگفتہ مجالِ نفسے می خواہد!! ؎ ورنہ مارا بہ جہانِ تو سروکار کجا است۔

اردو کلام میں بھی اس نے ایک جگہ خدا سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ تو نے مجھے باغِ بہشت سے حکم سفر کیوں دیا تھا۔ اس دنیا کے جھگڑے اور کام سے فراغت پانے کے لئے ایک طویل مدت کی ضرورت ہے۔ اس لئے ان کاموں کے اختتام تک تجھے میرا انتظار کرنا ہو گا۔ اس بہترین شعر کو سنئیے:۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں ؎ کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

بلند نصب العین کی تلقین

اس "فرصت ہو حق" کو حاصل کر کے اقبال نے قوم کی خدمات انجام دیں۔ ملک کے نوجوانوں کی اُس نے ہر منزل پر رہبری کی۔ "طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام" اپنے ایک پیام میں کہتے ہیں ؎۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے ؎ عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے۔

طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم ؎ یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے۔

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی ؎ رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی۔

وہ ہمیں "ہمت مردانہ" پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس نے ہمیں یہ بتایا کہ ہمارا مقام اس نظر آنے والے آسمان تک نہیں بلکہ ان ستاروں سے آگے بھی جہاں موجود ہیں دراصل ہمت بلند سے سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے ؎۔

در دشت جنونِ من جبرئیل زبوں صیدے ؎ یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ۔

ہم جس عالم میں رہتے ہیں۔ وہ عالم ناسوت ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ مسلمان طائر لاہوتی ہے۔

یعنی اس عالم ہوت سے زیادہ بلند مقام کا مالک ہے۔ اس لئے ہدایت کرتا ہے کہ اُس رزق کو حاصل کرنے سے پرہیز کر جو تجھے زندہ تو رکھ سکتا ہے۔ لیکن تیری اُڑنے کی قوت کو سلب کر دیتا ہے۔ تجھے ہمیشہ حق گو و بے باک رہنا چاہیئے۔ کیوں کہ اللہ کے شیروں کو روباہی یعنی عیاری نہیں آتی ہے۔

اے طائر لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی ؎ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی ؎ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مغربی تہذیب مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں سے وہ خوب واقف ہے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے کہ جو تجربہ مغرب نے حاصل کیا اس کے پیش نظر مشرق اُسی تہذیب کو کیوں اختیار کرے۔ جس نے مغرب کی ساری توانائیوں کو برباد کر دیا۔ محض آزاد خیالی اور وسیع النظری کا ڈھونگ رچا کر، عورت کو سوسائٹی میں اور زندگی کے تمام شعبوں میں مساوی حصہ دینے کی غیر فطری کوشش کر کے ایک غلط راستہ اختیار کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اس تہذیب کے ظاہری حسن سے مرعوب نہ ہونے کی ہدایت کرتا ہے ؎۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے۔ چمک تہذیب حاضر کی ؎ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اس نے اہل یورپ کو آگاہ کر دیا کہ اُن کی تہذیب بالآخر ان کو برباد کر دیگی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی ؎ جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اقبال اور دختران ملت اقبال نے عورت کو اس تعلیم کے حاصل کرنے سے منع کیا۔ جو اسے محض "تیتری" بنا کر چھوڑتی ہے۔ ورنہ عورت کی عزت اور اُسکا مرتبہ اقبال کی نظر میں بہت زیادہ ہے۔ اسکا تو یہ خیال ہے کہ کائنات کا وجود عورت کا رہین منت ہے اور دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں اسی عورت کے گود میں پلی اور بڑھی ہیں ؎۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ! ۔ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اُسکی ۔ کہ ہر شرف ہے۔ اُسی درج کا دُر مکنوں!۔
مکالمات فلاطون نہ لکھ سکی لیکن ؎ اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں!۔

اقبال مرد و زن کے باہمی تعلقات کی خرابی اور کشیدگی کا سبب زیادہ مغربی معاشرت

کی چیندر چند بے اعتدالیوں کو قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے": سلہ۔

ایک زندہ حقیقت ہے میرے سینے میں مستور ٭ کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی ٭ نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد۔

جس قوم نے اِس زندہ حقیقت کو نہ پایا ٭ اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد۔

"آج عورت آزادی کے لئے بے حد جدوجہد کر رہی ہے۔ نقاب و پردہ کی بندش اور گھر کی چار دیواری کو پھاند کر "سوشل" ہونے کی متمنی ہے۔ لیکن اقبال اس جلوت کی نسبت خلوت کو اس کے حق میں رحمت سمجھتا ہے، چنانچہ کہتا ہے": سلہ۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے

روشن ہے نگہ آئینہ دل ہے مکدّر

بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے ٭ ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر!

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے ٭ وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر و لیکن ٭ خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر

اقبال کا پیغام اقبال نے ہمیں یہ ہدایت کی ہے کہ سختیوں اور مشکلات کا مقابلہ کریں اور ان سے گھبرا کر زندگی سے بیزار نہ ہو جائیں۔ وہ مردِ مومن تھا۔ لیکن گوشہ نشین نہیں۔ اس نے اپنی قیمتی عمر کو چند گرد آلود کتابوں کی صحبت میں نہیں گذارا۔ اسکا روشن ضمیر ہر نئی بات کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتا تھا۔ اسی لئے اس نے "خس" کی طرح زندگی گذارنے سے منع کیا جو تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے۔ بلکہ ایک پہاڑ کی طرح جینے کا مشورہ دیا جو بڑی آندھیوں میں اٹل اور اپنی جگہ پر مضبوطی سے کھڑا رہتا ہے سه۔

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی ٭ چو خس مزی کہ ہوا تند و شعلہ بے باک است

اقبال اس راہرو کو جو شاہراہ زندگی پر چلتے ہوئے منزل تک پہنچنے سے پہلے آرام کا طالب ہوتا ہے۔ ہدایت کرتا ہے کہ اپنی طاقت کے مطابق دنیوی امور میں حصہ لینا چاہیئے۔ اور محض فکر و غور کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ زندگی میں فکر و عمل کو ساتھ ساتھ رہنا چاہیئے۔

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسی زیستم ٭ ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم

سلہ و سلہ۔ "اقبال اور دختران ملت" از طارق بی۔ اے۔ سے صفحہ ۱۱۲

موج ز خود رفتہ ای تیز خرامید و گفت ٭ ہستم اگر من روم گر نروم نیستم

مردِ مجاہد اقبال کی نظر میں مجاہد سے مراد سخت گیر، طاقتور اور مطلق العنان مرد نہیں بلکہ وہ شخص ہے جو درد آشنا دل بھی رکھتا ہو۔ اس نکتہ کو حسبِ ذیل تشبیہ کے ذریعہ خوب بیان کیا ہے۔ ؎

تنی پیدا کن از مشتِ غباری ٭ تنی محکم تر از سنگین حصاری

درونِ او دلی درد آشنای ٭ چو جوی در کنارِ کوہساری

اقبال روح کی نجات و آزادی کو اسکے مکمل فنا ہونے پر منحصر سمجھتا ہے۔ لیکن چونکہ اسلام میں گوشہ نشینی صریحاً منع ہے۔ اس لئے اقبال زندگی کو خوش آمدید کہتا ہے۔ کیونکہ زندگی نام ہے "حرکت و تغیر" کا۔ اور سرچشمہ ہے ہر چیز کے حاصل کرنے کا ؎۔

بود و نبود ماست ز یک شعلۂ حیات

یہی وجہ ہے کہ آدم کی پیدائش کائنات کی ہر چیز کو متاثر کرتی ہے ؎۔

نعرہ زد عشق کہ خونین جگری پیدا شد ٭ حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور ٭ خودگری، خودشکنی، خودنگری پیدا شد

خبری رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل ٭ حذر ای پردگیاں پردہ درے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر ٭ تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

تب و تاب کی آرزو ایک حقیر پروانہ زندگی حاصل کرکے تب و تاب اور سوز و ساز کا تمنائی ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی زندگی کی مدت ایک شب ہی کیوں نہ ہو۔ پھر ہم اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے زندگی کی ہماہمی سے کس طرح الگ رہنے کی خواہش کرنے میں حق بجانب ہیں۔ ؎۔

شنیدم در عدم پروانہ می گفت ٭ دمی از زندگی تاب و تبم بخش

پریشاں کن سحر خاکسترم را ٭ و لیکن سوز و سازِ یک شبم بخش

مستقبل سے نا امیدی مومن کی شان نہیں۔ کیونکہ زندگی کے میدانِ جنگ میں ایمان لازمی چیز ہے اور اسی وقت فتح نصیب ہوگی ؎۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں ٭ ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

اقبال کے ممتاز ہونے کی وجہ

اقبال کے اشعار در حقیقت لذت بخش ہیں۔ اسکا دامن تھامنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کی منظومات شراب کی مانند ہیں۔ جس کے پینے سے انسان سرمست ہو جاتا ہے۔ لیکن اس نے خود کبھی غالب کی طرح شراب کے عوض "خرقہ و مصحف" فروخت کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ چنانچہ غالب نے ایک جگہ یوں بیان کیا ہے:

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت
پرسد چرا کہ نرخِ مے لعل فام چیست؟

اسی لئے آیئے ہم اقبال کے دامن کو پکڑ لیں کیونکہ وہ خرقہ فروش نہیں بلکہ ان گذشتہ شعرا سے بلند تر، عظیم تر اور وسیع تر خیال رکھتا ہے۔ س۔

بیا کہ دامن اقبال را بدست آریم
کہ او ز خرقہ فروشانِ خانقاہی نیست

غزل

جناب تراب علیخاں صاحب باز

آئے تعینات میں وہ حق کے خلاف
ہو دیر و کعبہ حضرت مطلق کا گھر غلط

ذوقِ مجاز تونے جو پایا نہیں کبھی
زاہد یہ تیری چشم حقیقت نگر غلط

میری طرح سے تم بھی رہے بیقرار؟ جھوٹ
تم کو بھی انتظار رہا رات بھر؟ غلط

تو میرے دکھ کو جانے یہ تیری سمجھ سے دور
تیرا علاج میرے لئے چارہ گر غلط

تم اور بزم غیر میں شب بھر نہیں رہے
سمجھا رہے ہو مجھکو میری جاں کدھر غلط

اک میں ہی جان دوں گا تیری ہر نگاہ پر
تیرے لئے عدو رہے سینہ سپر؟ غلط

تو اُن سے کچھ زبانی کہے؟ یہ تیری مجال!
تو اُن سے کوئی بات کرے نامہ بر غلط

تو سیکڑوں بہانوں سے ٹھوکر لگائے گا
میرا مزار؟ اور تیری رہ گذر؟ غلط

تجھ پر مری نظر میرے دل پر تری نظر
میری نظر غلط ہے نہ تیری نظر غلط

تو تے کیطرح رٹ گئے حاصل نہ کچھ ہوا
قرآن لوگ پڑھتے رہے عمر بھر غلط

کافی ہے بازؔ ایک توجہ فقیر کی
پڑھتی نہیں ہے اہلِ نظر کی نظر غلط

انوارِ لطیف

جناب آل رضا صاحب رضاؔ (لکھنو)

غرض رات دن۔ شام پچھلے سویرے۔
محبت کی گلیاں ادہار دہند پھیرے

چھڑائے نہ چھوٹیگی دامن سے لالی
ارے بندہ پرور یہ آنسو ہیں میرے

محبت پہ صدقے کئے دل نے آنسو
اسے کیا خبر کتنے موتی بکھیرے

زمانے نے جو رنگ بدلے وہ دیکھے
نہ شامیں ہیں اپنی نہ اپنے سویرے

بھلائے ہیں وہ اپنا عہد محبت
محبت ہی اب دن جو پہرے سو پہرے

نکل کر کہاں جاؤں ان کی جفا سے
وفاؤں نے ڈالے ہیں گھیرو پہ گھیرے

ہوئی شام اور دل کی منزل پنائی
چلے تھے بڑے شوق سے منہ اندھیرے

جو میں حسن سمجھا جو تو عشق سمجھا
یہ دہوکے ہیں دل کے نہ میرے نہ تیرے

دعائیں جو لینا ہو لیلو رضاؔ سے
نہیں روز ہوتے فقیروں کے پہرے

مفلس کی عید

جناب عاطر حیدر آبادی منشی فاضل

چپہ چپہ میں جہاں کے شور وغل ہے عید کا
آج نیرنگ تماشا ہے کسی کے دید کا

آج محروم تمنا کی ترستی ہے نگاہ
روح میں ہیجان پیدا اور لب پر آہ، آہ

کون؟ وہ ضبط رضا میں آٹھ آنسو رو گیا
کون؟ وہ جورِ مسلسل کے تصدق ہو گیا

جس کے ننھے ننھے بچے کہہ رہے ہیں آکے پاس
عید ہے کیا آج بابا؟ کیوں نہیں بدلیں لباس؟

اللہ اللہ اور بھی بڑھتا چلا درد جگر
گردش ایام نے رکھا ہمیشہ چشم تر

کھیل بن بنکر بگڑتی ہے جہاں تدبیر بھی
خوب دکھلاتی ہے وحشت گردش تقدیر بھی

ہاں! ہے جس کی زندگی پامال موجِ حادثات
اہلِ ثروت یہ سمجھتے ہیں کہ ہے نایاب بات!

کوئی یہ بڑھتا ہوا طوفاں گھٹا سکتا نہیں
کشتی ارمان کو ساحل سے لگا سکتا نہیں!

الجھنیں ہیں سینکڑوں اور ہر ارادہ دیوانہ گر
بیخودیٔ شوق اندازِ دگر پر مختصر

نقش پائے رفتگاں بھی رہنما ہوتے نہیں
گلشن جہاں کے شجر دستِ دعا ہوتے نہیں!

عید مفلس میلے کچیلے چیتھڑوں پر ہی سہی!
عید دولت مند کمخواب و مشجر ہی سہی

عید مفلس حیف اک محرومیٔ جاوید ہے
آہ! جس کے پاس دولت ہے بس اسکی عید ہے

گاہے گاہے باز خواں

ا۔ ایک دن ہارون رشید اور ان کی بی بی زبیدہ خاتون کے درمیان کسی بات میں بحث ہو گئی۔ زبیدہ نے خلیفہ سے کہیں یہ کہہ دیا کہ تم دوزخی ہو۔ خلیفہ نے کہا اگر میں دوزخی ہوں تو تجھ پر طلاق ہے۔ یہ کہکر خلیفہ نے زبیدہ سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ مگر چونکہ خلیفہ کو زبیدہ سے بے انتہا محبت تھی۔ اس لئے اس سے علیٰحدگی میں ایک ایک آن انہیں دشوار گذرنے لگی۔ آخر کار خلیفہ نے تمام علماء کو جمع کیا اور ان سے دریافت کیا کہ میں دوزخی ہوں یا جنتی؟ اس کے جواب میں تمام علماء عاجز اور ساکت رہے۔ کہیں انہیں علماء میں چھوٹی سی عمر کے حضرت امام شافعیؒ بھی بیٹھے تھے۔ کھڑے ہو گئے۔ اور خلیفہ سے فرمایا اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے سوال کا جواب دوں؟ خلیفہ نے نہایت خندہ پیشانی سے آپ کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ میں بڑی خوشی سے آپ کا جواب سنوں گا۔ نو عمر حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا پہلے یہ بتاؤ کہ اس وقت آپ کو میری ضرورت ہے یا مجھے آپ کی؟ خلیفہ نے کہا کہ نہیں بلکہ اسوقت مجھے آپکی ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا بس تو میں حاکم اور تم محکوم ہو اس لئے تمہیں مناسب ہے کہ محکوم کیطرح میرے سامنے آؤ اور مجھے حاکم کی طرح تخت پر جگہ دو! خلیفہ نے اسی وقت آپ کو تخت پر جگہ دی اور خود تخت کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ چنانچہ تخت پر بیٹھکر حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اے خلیفہ! یہ بتاؤ کہ کبھی تم نے ایسا بھی کیا ہے کہ باوجود گناہ پر قادر ہونے کے گناہ نہ کیا ہو اور اسے چھوڑ دیا ہو؟ اور محض خوف خدا سے اس گناہ کے پاس نہ گئے ہو؟ اس سوال کے جواب میں خلیفہ نے قسم کھا کر کہا ہاں بعضے گناہوں کو میں نے محض خوف کیوجہ سے ترک کیا ہے۔ پیارے امام شافعیؒ جس کے جواب میں بے ساختہ فرماتے ہیں کہ بے شک تم جنتی ہو! آپ کا یہ کہنا تھا کہ چاروں طرف سے علماء نے اعتراض جڑنے شروع کئے اور کہا کہ خلیفہ کو قطعی جنتی کہنے کی تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ آپ نے فرمایا دیکھو! کلام پاک کے تیسویں پارہ سورہ والنازعات میں اللہ فرماتا ہے۔ (وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى)

یعنی جس شخص نے گناہ کا قصد کیا اور پھر خوف الٰہی کے سبب وہ گناہ کرنے سے باز رہا۔ اس کا ٹھکانا جنت ہے۔ یہ سن کر ہارون رشید بیحد مسرور ہوا۔ اور تمام علماء نے حضرت امام شافعیؒ کے علم و فضل کی نہایت تعریف کرتے ہوئے کہا کہ جس کا بچپن میں یہ حال ہے۔ وہ جوان ہو کر خدا جانے کس رتبہ کو پہونچے گا۔

۲۔ نزع کے وقت حضرت امام شافعیؒ نے ایک وصیت نامہ لکھکر ایک اپنے شاگرد کو دیا اور فرمایا یہ فلاں شخص کو دینا اور اس سے یہ کہنا کہ تو مجھے غسل دیگا۔ چنانچہ آپ کی وفات کے کئی روز بعد وہ شخص مصر سے آیا شاگرد نے وہ وصیت نامہ اسے دیا اور زبانی غسل دینے کی خبر سنائی۔ اس وصیت نامہ میں لکھا تھا۔ میں ستر ہزار کا قرضدار ہوں۔ یہ دیکھتے ہی اس شخص نے آپ کا تمام قرضہ ادا کر دیا۔ اور آپ کے شاگردوں سے کہا کہ غسل سے مراد آپ کی یہی قرضے کی ادائیگی تھی۔ پس میں نے بموجب وصیت آج آپ کو غسل دیدیا۔ پیارے امام قرضے سے پاک وصاف ہو گئے۔

۳۔ ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا انتقال ہو گیا ہے۔ جن کے جنازہ دفن کرنے کی لوگ تیاری کر رہے ہیں۔ جس کی تعبیر کسی کامل سے پوچھی گئی۔ تو انہوں نے فرمایا کہیں حضرت امام شافعیؒ نے انتقال نہیں فرمایا؟ چنانچہ باہر آکر انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ واقعی آج حضرت امام شافعیؒ انتقال فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون بعد وفات ربیع ابن سلیمان نے امام صاحب کو دیکھکر پوچھا کہ اللہ نے آپ کے ساتھ کیسا معاملہ کیا؟ امام شافعیؒ نے فرمایا۔ میرے مولا نے اپنی حضوری میں پیش فرما کر سونے کی کرسی مجھے بیٹھنے کو دی اور فرشتوں کو حکم دیا کہ جنت کے سچے موتی اس پر بے انتہا نچھاور کئے جائیں۔ چنانچہ فرشتوں نے مجھ پر جنت کے موتی نچھاور کئے۔

بہ سرپرستی محترم نواب مہدی یار جنگ بہادر

صدر المہام تعلیمات

شہاب

ہنابیل

ناہید

جلد (۷) بہمن ۱۳۵۳ف م ڈسمبر ۱۹۴۳ء نمبر (۳)

---

۱ - موت کی وادیوں سے۔ شمیم جالندہری کے مضامین آپ نے اس سے پہلے بھی انہیں صفحات پر دیکھے ہیں۔ انکی تحریریں ایک کیف ہوتا ہے۔

۲ - فریب تمنا۔ ایک فسانہ ہے۔

۳ - پہلی پرواز۔ کو پرندوں کی نفسیات سمجھئے۔

۴ - دل پژمردہ۔ دل کبھی پژمردہ اور کبھی مسرور ہوتا ہے۔

۵ - "مشاہدہ"۔ وحیدہ خاتون کا ہے۔ اسمیں ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔

۶ - چور۔ محض سارق ہی کو کیوں کہا جائے۔

۷ - فرداسے۔ واقعی فیر داتخیل کے لئے کیا کچھ نہیں ہے۔

۸ - عید کا چاند۔ غریب اور امیر کے لئے متضاد کیفیت رکھتا ہے۔

۹ - افسانوی خط۔ کا آخری حصہ تیر ۵۲ف میں لکھا گیا تھا۔ اب اس کا بقیہ حصہ ملاحظہ کیجئے۔ شاید اس کی تکمیل کیلئے یک اور قسط کا آپ کو انتظار کرنا پڑیگا۔

موت کی وادیوں سے میدان حیات میں

شمیم (جالندھری)

اوراق پارینہ شاہد ہیں کہ ۹ راگست سنہ ۱۸۱۵ء کی صبح ایک یادگار صبح تھی۔ جبکہ شہنشاہ فرانس نپولین بونا پارٹ جسے اوراق خطرہ یورپ" سے موسوم کیا جاتا تھا۔ جسکا رعب شاہی اور دبدبۂ شاہانہ بڑے بڑے حاکموں اور آمروں کو لرزہ براندام کردیا کرتا تھا۔ وہاں وہی نپولین ایک شکست خوردہ قیدی کی حیثیت سے سینٹ ہلینا جانے پر مجبور تھا۔ جہاز نے لنگر اٹھایا تو آغوش فرانس اپنی ویرانی پر اپنے بہادر اور اولوالعزم فرزند کی جدائی پر نوحہ کناں تھی۔ (آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی) اس کے ہمراہی بیک آواز چلا اٹھے۔ فرانس! فرانس! اسوقت وہ خون کی برکھا سے خوش ہونے والا دل بھی لرز اٹھا۔ اور ان آنکھوں میں بھی ایک فسانۂ یاس، ایک دکھ بھری کہانی چمکنے لگی۔ جو ہر ہیبتناک منظر کو تفریح طبع خیال کیا کرتی تھی۔ نپولین نے عزت واحترام کیساتھ اپنے سر سے ٹوپی اتار کر آخری بار اس سرزمین کو دیکھا۔ جس پر اس نے ایک شہنشاہ کی حیثیت سے حکومت کی تھی۔

دس ہفتوں کی تھکا دینے والی مسافت طے کرنے کے بعد ایک خشک جزیرہ، بے برگ و گیاہ وادیاں اور سیاہ پہاڑیاں اسکا استقبال کر رہی تھیں۔ یہاں رہتے ہوئے بھی بندۂ تقدیر قسمت کو ہر گام پہ سمارتے ہوئے نپولین اپنی ناکامیوں کو مستقبل کی کامرانیوں میں سمو دینے کے خواب بے تعبیر دیکھتا رہا۔ چنانچہ وہ اپنے افسردہ خاطر احباب کو ہمیشہ قسمت کا حسین چہرہ دکھاتے ہوئے مایوسیوں کی کریہہ المنظر شبیہ سے بچنے کی تلقین کیا کرتا۔

(۲)

وقت گزرتا گیا ماضی نے اپنے پٹ مضبوطی سے بند کر لئے۔ اور کچھ مدت کے بعد جب اس کے ساتھی اسے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ حتیٰ کے مصلحت وقت اس کے رفیق دلی، انہیں غربت لس کیس کی جدائی کا تقاضا کرنے لگی۔ تو تقدیر کا قائل غریب الوطن بادشاہ مایوس ہو گیا۔ اس نے دیکھ لیا کہ قسمت کی حسین دیوی اس سے روٹھ چکی ہے۔ تب اسنے بادل ناخواستہ اور باچشم نم اپنے دوست کو الوداع کہتے ہوئے۔ پہلی مرتبہ مایوسی کو اپنے دل میں جگہ دی۔ اسوقت سے غم آگیں خاموشیاں اسکا جزو حیات بن گئیں۔ اس کی صحت روز بروز

انحطاط پذیر ہونے لگی۔ حتیٰ کہ وہ بیمار ہوگیا۔ اسی دوران میں اسکی بہن (الیزا) کی ابدی مفارقت کی خبر اس کے سمند مرض کیلئے تازیانہ بن گئی۔ ہر دفاعی تدبیر اور معالجہ بیکار اور بے اثر ثابت ہوا۔ اطبا ر اس کی اس تیزگامی پر متحیر تھے۔ کہ وہ کس سرعت سے موت کی وادیوں میں داخل ہو رہا تھا ــــ ۵ر مئی ۱۸۲۱ء کی ایک غمگین اور اداس صبح اس کی رہائی کا پیغام، منشور آزادی لئے ہوئے طلوع ہوئی۔ اور اس نے اپنے دوستوں کو بلا کر اپنی آخری خواہش کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔ "جہاں تک ممکن ہو مجھے فرانس لیجانا۔ اور میرا جسد خاکی دریائے سین کے کنارے سرزمین فرانس اور میرے ہموطنوں کے درمیان سپرد خاک کر دینا جن سے مجھے اتنی محبت تھی"۔ یہ کہکر وہ خاموش ہوگیا۔ ایک ابدی سکوت اس کے ہونٹوں پر کھیل رہا تھا۔ فضائیں اداس فضائیں چپکے چپکے کہہ رہی تھیں۔

خانہ بر باد چمن برسوں قفس میں ہم نشیں ٭ آشیاں سے چھٹ کے خواب آشیاں دیکھا کئے۔

(۳)

قاعدہ کلیہ ہے کہ فسانہ زندگی کی تنزیئن انختیامیہ کو ہی موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی استثنائی صورتیں (نپولین کی زندگی اور موت کی طرح) حیات بعد الموت کی تحیر زا داستاں بھی سنایا کرتی ہیں ــــ ۱۵ر اکتوبر یہ وہ تاریخی دن تھا جب نپولین کو اس ویران جزیرہ نے خوش آمدید کہا تھا۔ اہل فرانس بھی اسی دن کے منتظر تھے۔ آج انھوں نے حکومت برطانیہ کی اجازت کے بعد اپنا محبوب ترین بادشاہ اس کی آرامگاہ کی بیرونی تعمیر کو توڑنے کے بعد بہ احتیاط نکال لیا۔ اور اس خیمے میں لے آئے۔ جو اسی مقصد کے لئے استادہ تھا۔ یہاں لاکر تابوت کو کھولا گیا۔ سفید ساٹھنی کی چادر کو آہستہ سے چہرے پر سے ہٹایا گیا تو شہنشاہ فرانس اطمینان و سکون کی نیند لے رہا تھا۔ وہ اب بھی ویسا ہی دکھائی دیتا تھا۔ جیسا کہ زندگی میں تھا۔ اس کے قد و خال میں ذرا بھی تو فرق نہ آیا تھا۔ زمینی اور فضائی اثرات اس پر ذرا بھی تو اثر انداز نہ ہوئے تھے۔ حاضرین گھٹنوں کے بل جھک گئے۔ اور انتہائی خلوص و عقیدت سے نماز جنازہ ادا کی گئی۔ بعد ازاں اس قومی امانت کو اس آبنوسی صندوق میں جو اس کے لئے فرانس سے لایا گیا تھا۔ منتقل کر دیا گیا۔ ۱۲ر دسمبر کی صبح کو وہ جہاز جو اپنے بہادر اور محبوب وطن شہنشاہ کو سینٹ ہلینا سے واپس لے آئے تھے۔ فرانس کی ایک بندرگاہ میں لنگر انداز تھے۔ شہر کے دو لاکھ باشندے اس وجود کو کندھا دینے کے لئے بیقرار نظر آتے تھے۔ جو ان کا مشکل کا ساتھی تھا اور جس نے ان کی مصیبت کے وقت میں حمایت کی تھی ــــ

(۴)

جملہ مذہبی رواسم پھر سے ادا کئے گئے۔ اور اس عاشق وطن کا جنازہ کچھ اس دھوم دھام اور ایسے تزک و احتشام سے اٹھا کہ چشم فلک بھی اس منظر سے بیگانہ تھی۔ اس سے قبل یہ نظارہ نہ دیکھا تھا۔ اولڈ گارڈ کے بوڑھے سپاہی! بہادر فرزندان وطن! اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے بنے تاج لئے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہی وہ آخری تحفہ تھا جو وہ اپنے محبوب ترین وجود کے لئے لائے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔ اور ہر طرف سے نپولین زندہ باد کے فلک شگاف نعرے سنائی دے رہے تھے جوزفین کا مرمریں مجسمہ اپنے فاتح شوہر کا ایک دلنواز مسکراہٹ کیساتھ خیر مقدم کر رہا تھا۔ اسی کے قریب ایک بلند مینار پر سنہری عقاب پرتولے ہوئے اڑنے کی فکر میں تھا۔ جس کی بنیادوں پر یہ عبارت کندہ تھی "میری یہ آخری خواہش ہے کہ میرا جسد خاکی دریائے سین کے کنارے سرزمین فرانس میں اور میرے ہم وطن فرانسیسوں کے درمیان سپرد خاک کیا جائے۔ جن سے مجھے اتنی محبت تھی"۔ الغرض ایک ہفتہ تک باشندگان فرانس ہر راہ میں آنکھیں بچھاتے، گلہائے عقیدت نچھاور کرتے اور اس ہاتھی جلوس سے کسی طرح سیر ہوتے نظر نہ آتے تھے۔ آخرکار وہ معینہ صبح آہی گئی جبکہ ان ویلیڈز کے گرجے میں سرزمین وطن کی امانت اس کو سونپ دی گئی۔ یعنی اس فاتح اور ہر دلعزیز بادشاہ کو سپرد زمین کر دیا گیا۔ اس طرح موت کی وادیوں سے گزر کر اس کی خواہش کامران پوری ہوئی — کیا نپولین بھی عالم ارواح سے اپنی اس آخری فتح کو اس ابدی زندگی کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس پر خوش تھا۔ یہ فطرت کا ایک ایسا راز ہے جس کی نقاب کشائی نہیں ہو سکتی؟؟۔

فریبِ تمنا

جمیل اختر نذیر

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھر آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

"وہ کچھ عرصہ سے کھویا کھویا سا تھا...... بالکل گم سم...... کسی گہری سوچ میں محو...... خیالات کے عمیق بحر میں ڈوبا ہوا...... دوستوں کا دل خوش کن مذاق...... ان کی بے لوث محبت...... ان کے بلند قہقہے جو پہلے اس کی زندگی کا ماحصل تھے...... اب اس کی دنیائے محویت کو مبدل نہ کر سکے......

اس کے سب دوست شادی شدہ تھے۔ مگر وہ اس بلائے بے درماں سے الگ تھلگ..... مگر اب وہ کیسے علیحدہ رہ سکتا تھا جبکہ اس کے ابا میاں نے شادی کی تاریخ مقرر کر دی تھی۔ اور آئندہ ماہ اس کے کمزور کندھوں پر ایک بڑا سا بوجھ ڈالا جانے والا تھا...... شاید اس کے ضعیف شانے اس کی اپنی دانست میں کبھی اس بوجھ کے متحمل نہ تھے۔ اگر اس بوجھ سے اس کے قدم ڈگمگانے لگیں اور وہ لڑکھڑا کر گر گرے تو...... کیا ہوگا...... اس خیال سے وہ لرز جاتا...... اگر دیکھی بھالی لڑکی ہوتی جسطرح اس کے بھیا نے اس کی خالہ زاد بہن کو اسکی بھابی بنایا ہے۔ ہر طرح دیکھی بھالی...... مانوس...... لیکن اس پر بھی بھابی اکثر بگڑتی رہتی ہیں۔ مگر وہ لڑکی...... جو اس کے پلے باندھی جانیوالی تھی۔ بالکل ناآشنا...... کبھی خواب میں بھی اس کی پرچھائیاں نظر نہ آئیں۔ نہ جانے کس مذاق کی ہو...... اگر بات بات پر روٹھنے والی ہو تو...... کیسے منائیگا...... اسے منانا تو آتا ہی نہیں۔ خوشامد پسند ہو تو...... وہ تو کبھی خوشامد نہ کریگا...... اس سے تو اسے مرنا قبول ہے۔ وہ سوچتا...... پرسوں جاوید کہہ رہا تھا۔ اس کی بیوی نے پلاٹینم کی انگوٹھی خریدنے کی فرمائش کی مگر چند وجوہات کی بنا پر وہ خریدنے سے انکار کر دیا۔ مگر وہ کہاں ماننے والی تھی۔ اپنی ایک ہی ہٹ پر قائم رہی۔ آخر غریب کو قرض سے اپنی چہیتی کی فرمائش پوری کرنی پڑی۔ حالانکہ جاوید کی آمدنی ہزار کے لگ بھگ ہے۔ مگر پھر بھی اسے یہی شکایت رہی کہ اخراجات کے لئے ناکافی ہے۔ جاوید ہی کیا قریب قریب اس کے تمام دوستوں کو یہی شکوہ رہا ہے کہ انکی آدھی تنخواہ بیبیوں کی آئے دن کی فرمائشات کے نذر ہو جاتی ہے۔ اگر اس کی بیوی بھی کہے کہ "ہمیں پلاٹینم کی انگوٹھی لادو......" وہ کہاں سے لائیگا...... اس کی ماہوار تو صرف دوسو ہے۔ چنانچہ ان ہی خیالات نے اس کے دل میں ہیجان بپا کر رکھا تھا۔ اس کے رنگین قہقہے چکنا چور ہو چکے تھے۔ اس کے ارد گرد کی فضا جو کبھی اس کی دلکش گفتگو سے حسین بنجاتی تھی۔ آج اس کی بے طرح کی خاموشی پر چشم پر نم تھی۔ دن گذرتے گئے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے دنوں کو پر لگ گئے ہوں۔ صنف نازک سے وہ بہت ڈرتا تھا۔ کیونکہ اسکے دل پر یہ گہرا نقش ہو چکا تھا کہ عورت سوائے مرد کو تنگ کرنے کے اور کچھ جانتی ہی نہیں اگر اسے خوف نہ تھا تو "عزیزہ" خلیق، ملنسار، سادہ زندگی بسر کرنے والی اسکی نظر میں عزیزہ ہر قسم کی فرمائشات سے پاک تھی۔ اسکی ملاقات کلب میں ہوا کرتی تھی...... وہ اسے پسند تھی۔ ایسی لغو پسند نہیں جیسے آجکل کے نوجوانوں کی ہوتی ہے۔ لیکن کبھی اسکا پتہ و نشان پوچھنے کی ضرورت اسے محسوس نہ ہوئی۔ وہ سوچتا اگر اسکے ابا میاں کو بہو لانیکا اتنا ہی شوق ہے تو وہ...... تو وہ عزیزہ کو بہو بنائیں۔ چنانچہ اس خیال کو ابا میاں پر ظاہر کرنیکا ارادہ کرتا مگر ابا میاں

کے سامنے زبان ہلانے کی ہمت نہ پڑتی ..... اب سر سے پانی گزر چکا تھا۔ آج وہ قاضی صاحب کے سامنے بیٹھا با دل نخواستہ ایجاب قبول کر رہا تھا۔ دن گزرتا جا رہا تھا اور وقت کی آمدورفت کے ساتھ دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو رہا تھا وہ صدق دل سے درازی دن کی دعا مانگ رہا تھا۔ مگر اس کی یہ دعا بددعا کا کام کر رہی تھی۔ جب زنانے میں اس کی طلبی ہوئی...... اسکا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا ..... اسوقت اس کی رحم طلب نگاہیں ہر ایک سے رحم کی ملتجی تھیں....... دلہن کے سامنے سر جھکائے بہ حیثیت مجرم بیٹھا تھا۔ اسکا دل ایسا اچھل رہا تھا جیسا اب سینے سے باہر نکل آئیگا...... اس کی آنکھوں تلے اندھیرا تھا۔ اسے کپکپی محسوس ہونے لگی۔ بھابی کے کہنے سے اسنے اپنا ہاتھ دلہن کے نقاب کی طرف بڑھایا۔ لیکن ہاتھ...... اس کے ہاتھ کو کوئی پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ..... بدن میں ایک جھرجھری سی آئی... ہاتھ خود بخود نیچے گر گئے...... بھابی نے مکرر حکم دیا کہ "دلہن کے روئے انور کی زیارت کرو" جو حکم خداوندی سے کم نہ تھا۔ جبراً و قہراً گھونگھٹ الٹ دیا... گھونگھٹ کے ساتھ مایوسی اور رنج والم یک لخت کافور ہو گئے۔ خوشی سے چہرہ چمک اٹھا... اسکے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی "اوہ...... عزیزہ......" چیخ کے ساتھ خوشی کے دو آنسو نکلے اور دلہن کی چادر میں جذب ہو گئے۔

"پہلی پرواز"

مسز محمد یحییٰ صدیقی

مینا کا بچہ درخت کی شاخ پر تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بھائی اور بہن ایک دن پہلے ہی اڑ کر جا چکے تھے۔ اس کو انکے ساتھ اڑتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ جب اس نے شاخ کے کنارے تک دوڑ کر اپنے پر پھڑپھڑانے کی کوشش کی تو اسے خوف معلوم ہوا۔ نیچے وسیع زمین پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں تک پہنچنے میں اسے یقین تھا کہ اس کے پر اسکو نہ سہار سکیں گے۔ اس لئے وہ اپنے گھونسلے کو لوٹ آیا۔ اسے اس وقت بھی اڑنے کی جرات نہ ہوئی۔ جب اس کے بھائی اور بہن جن کے پر اس سے بھی چھوٹے تھے شاخ کے

کنارے تک جانے کے بعد پروں کو پھڑپھڑا کر اڑ گئے۔ اس کے والدین اس کو پکار رہے تھے۔ اس کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ اس کو دھمکا رہے تھے۔ کہ اگر وہ نہ اڑ گیا تو فاقوں سے مر جائیگا۔ لیکن اس نے حرکت تک نہ کی۔

یہ ۲۴ گھنٹے پہلے کا واقعہ تھا۔ اس کے بعد سے کوئی اس کے قریب نہیں آیا۔ وہ دو دن سے بھوکا تھا۔ اپنے والدین اور بھائی بہن کو اڑتا دیکھ رہا تھا۔ وہ انھیں فن پرواز میں ماہر بنا رہے تھے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے بھائی نے زمین سے ایک ٹکڑا اٹھایا اور نگل گیا۔ اس کے والدین نے اس کو خوب سراہا اور وہ اسکی بزدلی پر اسکا مضحکہ اڑا رہے تھے۔

سورج ڈھلنے لگا تھا۔ اسے شدید بھوک محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ غذا کی تلاش میں اس نے کونہ کونہ چھان ڈالا۔ مگر کوئی چیز میسر نہ آئی۔ اس نے شاخ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑنا شروع کیا۔ اس امید میں کہ شاید وہ پرواز کر سکے۔ اور اپنے والدین تک پہنچ جائے لیکن اسکے اور اسکے والدین کے درمیان نیلا آسمان حائل تھا۔

وہ پھر ایکبار شاخ کے کنارے تک پہونچا۔ اس نے ایک آنکھ بند کی پھر دوسری گویا وہ سونے کی تیاری کر رہا ہے۔ لیکن انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی اور بہن سامنے درخت کی شاخ پر بیٹھے ہیں۔ باپ اپنے پروں کو کرید رہا ہے۔ اس کی ماں البتہ اس طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ کچھ کھانے لگتی اور اپنی چونچ کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتی۔ کھانا دیکھ کر وہ دیوانہ ہو گیا۔ کاش! وہ بھی کچھ کھا کر چونچ صاف کر سکتا وہ چلانے لگا۔ اس کی ماں نے جواباً اس کی طرف دیکھا۔

"چوں چوں چوں" اس نے اپنی ماں سے التجا کی کہ اس کے لئے کچھ کھانا لے آئے "چوں چوں" اس کی ماں نے جوابدیا مگر وہ برابر چیختا رہا۔ اس کی ماں اپنی چونچ میں کچھ پکڑے ہوئے اس کی طرف آئی۔ مارے خوشی کے وہ کودنے لگا۔ وہ اس کے قریب آکر رک گئی۔ پر سمیٹے ہوئے بے حس و حرکت چونچ میں کوئی چیز دبی ہوئی اس کی چونچ سے کتنی قریب تھوڑی دیر تک تو وہ حیرت سے سوچتا رہا کہ وہ قریب کیوں نہیں آتی۔ اور پھر بھوک کی بیتابی سے مجبور ہو کر وہ غذا پر جھپٹا ایک چیخ کے ساتھ وہ نیچے خلا میں گر گیا۔ اسکی ماں اوپر کیطرف اڑی اس نے اس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی لیکایک اس پر خوف غالب ہو گیا۔ اس کے دل کی حرکت رک گئی۔ اس کی قوت سامعہ نے جواب دیدیا دوسرے ہی لمحہ میں

اس نے محسوس کیا کہ اس کے پر پھیل گئے ہیں۔ ہوا اس کے سینے پیٹھ اور پروں سے ٹکرا رہی ہے۔
وہ اپنے جسم کو ہوا میں سے گزرتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔ اب وہ گر نہیں رہا تھا۔ بلکہ اڑ رہا تھا۔
اسکا خوف زائل ہو چکا تھا۔ گو اسے کچھ عجیب سا ضرور معلوم ہوا۔ مگر وہ اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر اوپر کی طرف
اڑا۔ فرط مسرت سے وہ چیخ اٹھا اس نے اپنے پروں کو پھڑ پھڑایا۔ "چوں چوں چوں چوں" اسکی ماں اسکے
پاس سے گذری وہ پھر ایک بار چیخ اٹھا۔ اسکے بعد اسکا باپ اس کے پاس سے اڑتا ہوا گذرا پھر اسکے
بھائی وبہن اس کے نزدیک ہی اڑنے لگے۔ اب وہ بالکل بھول گیا کہ وہ کبھی اڑنے کے قابل نہ تھا۔
اڑتے اڑتے وہ سامنے والے درخت کی شاخ تک پہنچ گیا۔ اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔
اسکا خاندان پہلے ہی سے اس شاخ پر بیٹھا ہوا تھا وہ اسکو بلا رہے تھے۔ اس نے اپنے پیر شاخ پر ٹیکدیے
اس کے چاروں طرف اس کے خاندان کے افراد چیخ رہے تھے۔ اس کی تعریف کر رہے تھے۔ اور
ساتھ ہی اسکو غذا بھی دیتے جاتے تھے۔ اس کی پہلی پرواز ہو چکی۔

آلو کی کھیر

دودھ۔ آلو۔ شکر۔ بادام۔ الائچی وزعفران کیوڑہ۔
آدھ سیر آدھ سیر آدھ سیر آدھا پاؤ حسب ضرورت

ترکیب۔ آلو کو چھیل کر ٹکیاں کاٹ کر دودھ میں چھوڑ دیں چھوٹے پر خوب پکنے دیں۔ آدھا دودھ جلنے تک
آلو کو پکنے دیں۔ گلنے کے بعد آلو کو باریک گھوٹ لیں۔ پھر شکر و الائچی کی ڈال کر پھر تھوڑی دیر پکایا جائے
حسب ضرورت گاڑھا رکھ سکتے ہیں۔ اور پسے ہوئے بادام و زعفران کیوڑہ کھیر میں ڈال دیں۔ لیجئے لذیز کھیر
تیار ہے فقط

دل پژمردہ

بشیر بانو بشیر

ایف۔ ایس۔ سی سال اول

رباب زندگی پر گیت کیوں میں گا نہیں سکتی؟
میرا ٹوٹا ہوا دل ہے میں کچھ سمجھا نہیں سکتی۔
کسی دن گلستانِ دل میں لاکھوں پھول ہنستے تھے۔
مگر اب کیوں میرے دل کی کلی مسکا نہیں سکتی۔
یہ بحر آرزو میں ہے خموشی موت کی سی کیوں؟
کوئی موج تمنا کیوں ابھر آ نہیں سکتی؟
یہ دریا آنسوؤں کے تیز کیوں بہتے ہیں آنکھوں سے؟
سمندر کی روانی کیوں انھیں ٹھہرا نہیں سکتی؟
یہ ہوگی ختم کب تک اے فلک تیری ستم گاری۔
تیرے ظلموں کی حد ظالم میں کچھ بتلا نہیں سکتی۔
کسی صورت نہیں باقی مجھے اب زیست کی خواہش
تجھے کیا ہو گیا ہے اے اجل کیوں آ نہیں سکتی؟
یہ مرجھایا ہوا دل کا کنول کیوں ہے بشیر آخر
گلوں کی مسکراہٹ کیوں چرا کر لا نہیں سکتی؟

"مشاہدات"

وحیدہ خاتون نسیم

کوئی نظم کہنے کا محرک صرف دل پر اثر ہوتا ہے۔ جو دو صورتوں میں پڑ سکتا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ مندرجہ ذیل صرف مشاہدہ ہے۔ جو مجھکو پہلے کسی کے حال کا ہوا تھا۔ اور اسی کو میں نے نظم کیا ہے۔ اس غزل کا مطلع کسی شاعر کا پرانا شعر ہے۔

عشق خانہ خراب ہوتا ہے۔
دل لگانا عذاب ہوتا ہے۔
نرگس چشم کے تصور میں۔
جام مئے سے حجاب ہوتا ہے
رنگ ہستی پہ کوئی خنداں ہے۔
کوئی چشم پر آب ہوتا ہے۔
سخت آفت میں جان پڑتی ہے۔
جب کوئی لاجواب ہوتا ہے۔
دل گھرا غم میں اس طرح جیسے۔
ابر میں ماہتاب ہوتا ہے۔
"حال دل جب انہیں سناتی ہوں"
"اور دگنا عتاب ہوتا ہے"
شرم جب زندگی سے آتی ہے۔
موت سے بھی حجاب ہوتا ہے،
چاند آ آ کے روز تکتا ہے۔
جب کوئی محو خواب ہوتا ہے۔
دہر میں جو کڑی اٹھائے نسیم
دل وہی کامیاب ہوتا ہے

چور

ساجدہ احمد محی الدین

وہ جو رات کی تاریکی میں دوسروں کی تلاشی لیتا ہے۔ اپنی تعمیر کے لئے دوسروں کی تخریب کرنے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ چور ہوتا ہے۔ —— ایسے چور کو قانون اپنے پنجے میں گرفتار کر کے سخت سزائیں دیتا ہے۔ جو بعض دفعہ زندگی کی ناقابل برداشت مصائب سے بھی تنگ آکر اپنے آپ کو سپرد قید یا حوالۂ موت کرنے کے لئے چوری جیسے کام پر آمادہ ہوجاتا ہے...... ہاں پولیس اس کی تلاش میں سرگرداں...... ہوجاتی ہے۔ اور جب تک اسے ڈھونڈ نہ نکالے چین نہیں پاتی...... کیا یہی چور ہے۔ جو اپنے کئے کی سزا پانے کا مستحق ہے؟

لیکن وہ عالیشان بنگلوں شاندار باغوں میں رہتے ہوں۔ وہ انسان —— ہاں کیا ان کا دامن ان جگمگاتے گناہوں سے یکسر خالی ہوتا ہے۔ وہ چوری نہیں کرتے۔ لیکن مہذب طریقے پر وہ قزاقی نہیں کرتے۔ لیکن رشوت لیتے ہیں۔ جو بالفاظ دیگر "مہذب ڈاکہ زنی" کرتے ہیں۔ سوسائٹی کے پاس ایسی شقاوت کوئی جرم نہیں؟ کیا سوسائٹی کی نظریں ایسی ڈاکہ زنی روا رکھتی ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے مہذب ظلم دیکھتی ہیں مگر خاموش رہتی ہیں۔ کیا اس لئے کہ ان کی زندگی رئیسانہ ہوتی ہے۔ کیا اس لئے بھی کہ مہذب طریقے پر قزاقی کرتے ہیں؟ لیکن اس قادر مطلق کے پاس سب ایک طرح کے چور ہیں۔ سب کو اپنی اپنی چوری کی سزا وہیں ملے گی۔ چاہے دنیا ایسے مہذب ڈاکوؤں اور ظالم انسانوں کو چھوڑ کیوں نہ دے۔

اف دنیا کی اندھیر نگری۔

ہاں زمانے کا انقلاب اپنے مضبوط ہاتھوں ان چوروں کو ذلت و رسوائی کی کڑی زنجیریں پہنائے گا۔

اے سرمایہ دارو اور اے حیلہ گرو۔ اے مہذب ڈاکوؤ۔ خبردار موت ٹل سکتی ہے وقت کا فرمان ٹل سکتا نہیں۔

"فرداسے!"

آنسہ محمودہ رضویہ کراچی

حسین و پراسرار فردا! تیرا تصور میرے لئے باعثِ تقویت ہے۔ اور وجہ سکون قلب!......

جب اوراق ماضیہ الٹتے الٹتے طبیعت پریشان ہو جاتی ہے۔ یا حال کی پیچیدہ گرایاں اور متحیر زاواقعات بے حال کر دیتے ہیں تو میری افسردہ نگاہیں تجھے آسمانی خلاؤں میں ڈھونڈتی ہیں۔ فضائی وسعتوں میں تلاش کرتی ہیں۔

اور تو! من موہنی فردا! میری دنیائے تخیل پر اسطرح چھا جاتی ہے۔ جیسے اولیں شعاع! آفتاب سے جھیل کا پانی جگمگا اٹھے!.......

جب زندگی ہر طرف سے رنج و ملال میں گھر جاتی ہے۔ اور کوئی صورت چھٹکارے کی نظر نہیں آتی۔ حیات اک بے رونق صبح کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ اور یہی مزاج فطرت کا شکار!۔

تو اسوقت اسے متاع صبر و قرار!! تو تکالیف کے ان سیاہ سیاہ بادلوں سے نفوذ کرتی ہے۔ اُمیدوں کا کارواں در کارواں لئے ہوئے۔ اور طمانیت قلب کی پیامبر بن کر!.......

ایسے وقت میں بھی جب قوم کی عظمتِ ماضی کا احساس قلب کو مجروح کر دیتا ہے۔ فکر مستقبل روح کو برماتا ہے۔ اور ابنائے وطن کی پستی کا تصور دل و دماغ پر حاوی.......

تو تو اسے فردائے درخشاں! وقت کے دھندلے اور تاریک سائے سے اسطرح نزول کرتی ہے۔ جیسے سطح آب پر رقصاں ستارۂ سحر!.......

محض تیرا ہی بھروسہ ہے۔ کہ اک پر کیف مستقبل شعاع امید بن کر آتا ہے۔ اور دل پژمردہ مسرور و شاداں کر دیتا ہے...... ..

تیری ہی آمد بیداری قوم کی حامل بن کر آتی ہے۔ اور ارتقائے ملت کا پیغام بصیرت اندوز! لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود!! اسے فردائے پنہاں! میں یہ سوچ کر متوحش ہو جاتی ہوں۔ اور اس تصور سے لرزہ براندام! اگر آنے والی صبح کے روپ میں وقت کونسی کروٹ لے گا!....

مصائب کے تیروں کی بوچھار لے کر آئے گا۔ یا کیف و مسرت کے انبار! آہ! مجھے نہیں معلوم! کہ تو کونسے

رنگ میں تسلط بر کائنات کرے گی۔ ظلمت بداماں بن کر یا پرکیف جلوہ ساماں!۔
کسقدر راز سربستہ ہے۔ تیری ہستی! اے فردائے وجۂ تسکین!! اور کیسی حال صبر و سکون!.........

عید کا چاند

عطیہ فاطمہ

آکاش پر روپہلی چندرماتا کو دیکھنے کے لئے خوشحال طبقہ کے لوگ بیتاب ہو رہے تھے، ان کی نگاہیں تلاش قمر میں محو تھیں، بچے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ چاند گھنے درختوں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ گویا ان سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ وہ اپنے حسین کپڑے اور خوبصورت کھلونے دوسروں کو بتانے کے لئے بیقرار تھے۔ اگر سچ مچ چاند انھیں نہ نظر آئیگا تو ان کے خوشنما کپڑے ایک دن اور لوگوں کی نظروں سے چھپے رہینگے..... بس یہی خیالات تھے۔ جو ان کی بیقراری میں اضافہ کر رہے تھے.........

اِدھر غریبوں کے حسرت بھرے دل دھڑک رہے تھے۔ وہ چاند کے نام سے گھبرا رہے تھے۔ ان کے بچوں کو نہ کپڑے میسر تھے اور نہ خرچنے کے لئے چند پیسے تھے........ وہ گھبرا گھبرا کر آسمان کیطرف دیکھ رہے تھے۔ اور دعا کر رہے تھے۔ کہ کاش چاند نہ نکلے! اس کے بچوں کو خون کے آنسو نہ رلائے۔ .... ان کی امنگوں کا جنازہ نہ نکالے....... یکایک انھیں عید کے چاند کے پرجوش استقبال نے چونکا دیا...... بچے آکر لپٹ گئے اور وعدے یاد دلانے لگے۔ وہ کہنے لگے کہ آخر دوسروں کے بچے بھی ان کے مثل ہیں۔ اور وہ کیسے کیسے خوبصورت کپڑے پہنتے ہیں۔ اچھی اچھی مٹھائیاں خرید تے ہیں۔ اور ٹانگوں اور موٹروں میں عیدگاہ جاتے ہیں......

مفلس والدین کا تحفۂ عید انکے بچوں کے لئے دراشک تھے........ عید کا چاند ان کے لئے پیامِ غم لایا تھا.........

براہ کرم۔ تبدیل پتہ کی اطلاع دفتر کو فوراً دیجائے۔

افسانوی خط

رشیدہ قادر حسین سعید

بسلسلہ گذشتہ

شادی کے دن سے روحی میں ایک خاص انقلاب دیکھکر شاہد کو کچھ بدگمانی محسوس ہونے لگی۔ اور وہ اس انقلاب کے معلوم کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مشغول ہوگیا۔

اب نہ سنو شہناز یہاں سے روحی کی زندگی کا دوسرا رخ شروع ہوتا ہے۔ جسکے سننے سے سوائے تکلیف اور رنج کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ خیر خفا مت ہو۔ جب تم نے سننے پر ہی کمرہمت باندھ لی ہے تو سن ہی لو۔ شاہد کا کا شبہ بڑھتے بڑھتے بدگمانی کی حد تک پہنچ گیا۔ اور اس کو یقین ہوگیا۔ کہ روحی عارف سے محبت کرتی ہے۔ اسی وجہ سے دونوں کا رنگ بدل گیا ہے۔ اسکا خیال آتے ہی وہ روحی سے بدگمان ہوگیا۔ یہ حال دیکھ کر روحی کی حالت غیر ہونے لگی۔ اور اب وہ اسی سوچ میں گھلنے لگی۔ اس کو خبر نہ تھی کہ اتنی جلد یہ حالت ظہور میں آئے گی۔ وہ تو سمجھ بیٹھی تھی کہ اس کی دنیا جنت بنجائے گی۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ جو دنیا اس کو پھولوں کی سیج معلوم دیتی تھی۔ وہی کانٹوں میں تبدیل ہو جائے گی۔

روحی ہر طرح شاہد کی خاطر و مدارات اپنے حد سے بڑھ کر کرتی مگر کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا۔
اب شاہد کا زیادہ وقت باہر گذرتا۔ کچھ دن بعد جب کہ شادی کا نشہ اتر چکا تھا۔ شاہد دوستوں کے بہکانے سے ایک ایکٹرس کا ناچ دیکھنے گیا۔ اور پھر اسی کا ہو رہا۔ فطرتاً وہ اس طبیعت کا نہ تھا۔ ایک تو اسکو بدگمانی ہو چکی تھی۔ دوسرا دوستوں کے بہکانے میں آگیا۔ اب وہ رات رات بھر گھر سے غائب رہتا۔ غریب روحی ساری رات آنکھوں میں گذارتی۔ آخر کار تھک کر سو جاتی۔ اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ لیکن شاہد میں کوئی تغیر واقع نہ ہوا۔ اور وہ اب اور زیادہ باہر رہتا۔ روحی کی کوئی قدر و قیمت اس کے پاس نہ تھی۔ اس کو وہ گھر کی خادمہ یا لونڈی باندی سمجھنے لگا تھا۔

یہ اس کا ظاہر تھا۔ باطن میں تو اس کو روحی سے بے انتہا محبت تھی۔ بدگمانی بھی کیا بُری شئے ہے۔

کیا بتاؤں شہناز اس کی وہ تازگی بشاشت چلبلا پن سب کچھ رخصت ہو چکا وہ ایک بے حس مٹی بن

گئی۔ لیکن ان تمام باتوں کی خبر خالو ابا یا خالہ جان کو نہ دی اور وہ بہت کم آتی۔ زیادہ وقت اس کا وہیں گذرتا۔ ایک دن بی اماں کی چٹھی میرے نام آئی۔ انہوں نے مجھے بلوایا تھا۔ میں فوراً وہاں گئی۔ اسوقت روحی وہاں موجود تھی۔ اس کے چہرے کی زردی دبلاپن دیکھ کر دنگ ہو گئی۔ وہ اسوقت چھ(۶) مہینے کی بیمار نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کی حالت کا بغور مطالعہ کیا۔ آخر میں نے بلوانے کے وجوہات دریافت کئے۔ بی اماں۔ رونے لگیں اور کہنے لگیں۔ میری اچھی بیٹی میں روحی کو دیکھ دیکھ کر گھلی جا رہی ہوں۔ تم دوست ہو بہن ہو۔ اگر تم اس راز کو معلوم کرو تو میری مشکل حل ہو۔ اور پریشانی دفع ہو۔ یہ سن کر میں روحی کے کمرے میں دوڑی دوڑی پہنچی۔ وہ شربتی رنگ کی شلوار قمیص اور دوپٹہ پہنے ہوئے ایک کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔ میں نے کتاب ہاتھ سے چھین لی۔ اور وہ ایکدم چونکی۔ اور ارے شمسی کہہ کر اٹھنا چاہا مگر وہ اسقدر نحیف و زار ہو چکی تھی کہ بڑی مشکل سے اٹھ سکی۔ تم کب آئیں اس نے حیرت و تعجب سے دریافت کیا۔

کیوں میرا آنا تم کو ناگوار گذرتا ہے۔ لو میں جاتی ہوں۔

نہیں شمسی ٹھیرو تو اس نے میری ساڑی کا پلو پکڑ کر کھینچا۔ تم تو بہت جلد روٹھ جاتی ہو۔ یہ بات ہمیں پسند نہیں۔ میں خود تم کو یاد کر رہی تھی۔ شمسی۔ اس نے بہت آہستہ کہا۔ اچھا تم اکیلی یہاں کیا کر رہی ہو؟ روحی۔ میں نے سوال کیا۔ اس نے کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ظالم محبت" پڑھ رہی ہوں۔ حجاب کی ہے میں نے پوچھا۔

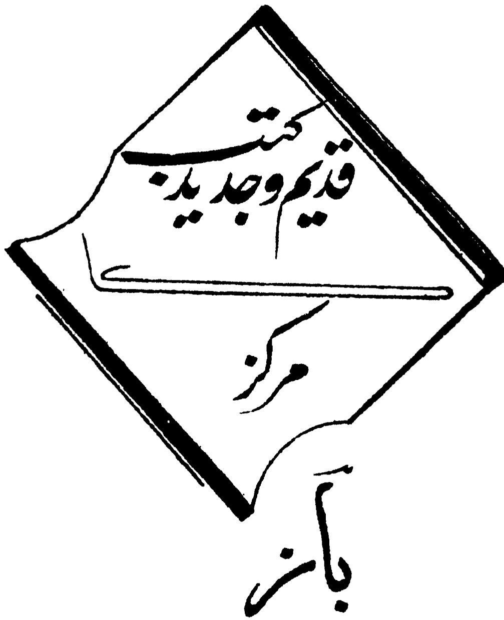
ہاں بہت اچھی کتاب ہے۔ جو شخص بھی شروع کرتا ہے۔ بغیر ختم کئے چھوڑنے دل نہیں چاہتا۔

میں نے اسکو چھیڑنے کی غرض سے کہا۔ کیوں نہ ہو "محبت" ہے۔ نہ جانے ظالم ہو یا اور کچھ۔

اگر تم نے پڑھی ہوتیں تو کبھی یہ رائے قائم نہ کرتیں۔ بیچارے منصور پر۔ مجھے بڑا رحم آتا ہے۔ کس طرح اس نے محبت کے پیچھے جان دی مگر زبان سے اف نہ کی۔ سچی محبت قربانی میں ہی پوشیدہ ہے۔ محبت قربانی لے کر ہی رہتی ہے شمسی۔

تم منصور پر رحم کھاتی ہو۔ اور مجھے عارف پر رحم آتا ہے۔ بیچارہ کسقدر خاموش محبت کئے جا رہا ہے۔ کیا حال ہے انکا۔ میں نے باتوں کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے انکا ذکر چھیڑ دیا۔ اس ذکر پر روحی کچھ بےچین ہوگئی۔ اور کہنے لگی۔ سوائے ان باتوں کے تم کو دوسری باتوں میں مزا نہیں آتا۔ چھوڑو بھی اب انکو ایک شرط پر چھوڑ سکتی ہوں۔ اگر تم وعدہ کرو۔ میں نے ذرا نزدیک ہو کر کہا۔ وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کہنے لگی۔ کونسا وعدہ۔ کس چیز کا وعدہ کچھ کہو گی یا یوں ہی بڑبڑاتے رہو گی۔

اچھا تو یہ میرا بڑبڑانا ہے۔ خیر بھائی اگر تم کو میری باتیں پسند نہیں تو نہیں سہی۔ مجھے کیا پڑی ہے۔ باقی آئندہ۔



مسجد چوک

حیدرآباد دکن

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپ کر دفتر شہاب سبزی پورہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔